''چہارسُو''

چشمِ نم

کراچی کے علاّمہ اقبال گرلز کالج کی سابق پرنسپل اور آج کل سرسید یونیورسٹی اور ڈاکٹر جمیل جالبی لائبریری سے منسلک متحرّک اور خوش گفتار شخصیت کی مالک، نہایت قابل علمی گھرانے سے تعلّق رکھنے والی نوشابہ صدّیقی صاحبہ، ان کی مرحوم بہن بیگم دردانہ جلیل اور بہنوئی کرنل جلیل کا (جو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش میں اسیر بھی رہے) میرے والدین سے ایک قلبی تعلّق رہا ہے۔ کرنل جلیل اور بیگم جلیل، یہ دو نام تو گویا ہمارے بچپن کے رومان کا حصّہ ہیں۔ پروفیسر نوشابہ صدیقی مدرّس، ماہرِ تعلیم، ادب پرور، ادیب پرور، ناول نگار، خاکہ نگار اور مضمون نویس ہونے کے علاوہ دلّی سے دل تک کے سفرنامے کی خالق بھی ہیں اور اس کا عنوان ہے ''چشمِ نم''۔

''چشمِ نم'' ہندوستان کا زمینی نہیں، زمانی سفرنامہ ہے جو اس کی سرزمین یا جغرافیے سے زیادہ وہاں کی گمشدہ اور ہجرزدہ تہذیب اور تاریخ کے سفر کا احوال ہے۔ یہ مناظر اور سفری جزئیات کے بجائے تاثرات اور جذباتی واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں آپ کو تاج محل یا آگرے، دلّی یا علی گڑھ کی منظر کشی پہ اتنا زور نہیں ملے گا کیونکہ نوشابہ صاحبہ کی توجّہ کا مرکز اور دلچسپی تو ان جگہوں اور ان سے جڑی یادوں اور باتوں سے ہے جو سینہ بہ سینہ ان تک منتقل ہوتی رہیں اور جن کا تعلّق ان کے آباواجداد سے ہے۔ اسی لیے وہ عمارتوں کے جسموں کے بجائے ان کی روح میں سفر کر رہی ہیں۔ یعنی یہ بیک وقت ہندوستان کا سفرنامہ بھی ہے اور یادوں میں بسی اندر کی دنیا کا سفرنامہ بھی۔

اس سفر کی اصل محرّک مصنّفہ کی وہ تشنگی تھی جو بچپن کی یتیمی نے پیدا کی۔ پھر بچپن کی ہجرت اور نتیجتاً آبائی زمین، تاریخ، یادگاریں، کارناموں کے نقوش، جانے کیا کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آجانے سے وہ خلا اور بڑھ گیا جسے پُر کرنے کا خواب انھوں نے عمر بھر دیکھا اور بالآخر اولاد کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے بعد وہ اس خلا کو پُر کرنے نکل پڑیں۔ تلاش کے اس سفر میں ان کی پہلی دلچسپی اپنے والد کی آخری آرام گاہ اور ان سے جڑی یادگاریں تھیں۔ اسی لیے آگرہ کے سینٹ جونس کالج کے پروفیسر الیگزینڈر لال نے کہا کہ ''یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ اُن یادوں کو جمع کرنے یہاں آئی ہیں جو آپ کی نہیں آپ کے والد کی ہیں''۔

اس تصنیف کا اسلوبِ نگارش جذبات سے لبریز ہے۔ یہ فکر، دل اور احساسات کا سفر ہے۔ اس میں الفاظ ایسے ٹانکے گئے ہیں کہ ناول نگار کی تخلیقیت جھلک جھلک اٹھتی ہے۔ اس سفر کے دوران وہ اپنے والد کے انتقال کا غم بھی تازہ کرتی رہیں اور والد سے شکوہ بھی کرتی رہیں کہ وہ انھیں اتنی جلدی کیوں چھوڑ گئے۔ یہ ایسا شکوہ ہے جو ایک بچّی ساری عمر سنبھال کر رکھتی ہے۔ یوں ہمیں اس تحریر میں ایک کیتھارسس بھی نظر آتا ہے جو ان جگہوں کو دیکھ کر اور چھو کر کیا گیا ہے جہاں ان کے والد رہے، گئے، بیٹھتے رہے، پڑھتے رہے یا پڑھاتے رہے۔ خود کلامی سے عبارت اس دل گداز تحریر میں مصنّفہ کی شخصیت کا جذباتی رخ بھی سامنے آتا ہے جس میں آنسوؤں کا ایک مسلسل بہاؤ ہے۔ وہ علی گڑھ سے اعظم گڑھ تک ریل کے سفر کے دوران لکھتی ہیں ''مگر کسی ماہر نے آج تک انسانی ڈھانچے پر ریسرچ کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ اس کا نام کیا تھا؟ اس نے کیسی زندگی گزاری، اس کا دل کیسے کیسے دھڑکا، اس کے ذہن میں خوشی اور غم کی کتنی ہی کہانیاں رقم ہیں؟''

اس سفرنامے میں دلچسپی کا دوسرا محور ان کی اپنی جنم بھومی اور وہاں کے علم وادب کے تاریخی پس منظر اور ادارے ہیں۔ یہ ان کی یادمیں بسی ماضی کی وہ جگہیں ہیں جن سے ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ یہ اس سلسلے کی تلاش ہے جو غیر فطری طور پہ ٹوٹ گیا تھا، اور جسے وہ جوڑنا چاہتی تھیں۔ یہ ماضی پرستی نہیں اور ہو بھی کیسے کہ انھوں نے تو ایک بھرپور متحرّک زندگی گزاری ہے اور آج بھی علمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مشاعرے اور دیگر ادبی محفلوں کے انعقاد کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی لائبریری کے لیے ان کی خدمات اس کا ثبوت ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لیے حال پہ کوئی سودا بازی نہیں کی۔ سو یہ ماضی پرستی نہیں، اس کی بازیافت ہے اور تاریخ کا جیتا جاگتا مطالعہ بلکہ اچھی خاصی تاریخ نویسی ہے۔ اور تاریخ دان مفکر و محقّق تو ہوتا ہے ماضی پرست نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ والد کے انتقال اور پھر ہجرت کے باعث ان کی زندگی میں ایک گھڑی کی سوئیاں کہیں رک گئی تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی وقت کی اسی ٹوٹی ڈور کا سرا ڈھونڈنے کے خواب دیکھے تھے اور اب جا کے وہ اس ڈوری کے سِروں کو باندھ سکی ہیں۔ ان کی یادیں اپنے والد، دادا اور بزرگوں کی گراں مایہ خدمات کے گرد گھوم رہی ہیں۔ والد کو انھوں نے پورا ہوش سنبھالنے کے بعد نہیں دیکھا تھا جن کے انتقال کے وقت وہ صرف دو سال کی تھیں۔ سو ان کے پاس زیادہ تر وہ یادیں ہیں جو سنی ہوئی ہیں۔

فیصل عظیم

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۳، شمارہ: مارچ، اپریل ۲۰۲۴ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹرج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: (+92)-51-8730633-8730433

موبائل: (+92)-336-0558618

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

ویب سائٹ

http://chaharsu.wordpress.com

۔ متاعِ چہارسو ۔

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

بلدے دیوے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاہد انوار ۶
عشق ملنگی (افسانہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد حسین ۹
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۳
آوارہ جوگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سریندر نیّر ۲۱
کچھ یادیں کچھ باتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نور شاہ ۲۴
عشق سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پروفیسر قدوس جاوید ۲۶
کہانی ہو تو ایسی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر سید تقی عابدی ۳۱
زہر عشق کے انگ سنگ۔۔۔ڈاکٹر ہر چند سنگھ بیدی ۳۵
چوتھی سمت کا شہزادہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد کفایت ۳۷
حیات و کائنات کا عکاس۔۔۔ڈاکٹر ندیم احمد ندیم ۴۰
کہانیاں من لبھانیاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منموہن ۴۱
سانجھی مٹی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۴۲

افسانہ

زندہ آنکھوں کی داستان۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد حسین ۴۵

انشائیہ

عشق نچایا تھیا تھیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد حسین ۴۸

بولتے چہرے

عکسی منظرنامہ ۵۱

انوارِ مدینہ

نسیمِ سحر، نبیل احمد نبیل ۵۲

افسانے

رقیب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل عثمان ۵۳
مستونگ میں مشتاقیت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۵۵
پہاڑندی عورت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خورشید حیات ۶۰
استاد لال سنگھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول

آفتاب کا زخم

اسرار احمد، ولی عالم شاہین، نسیم سحر، رؤف خیر، ارشد انصاری، اشرف جاوید، فیصل عظیم، ڈاکٹر ریاض احمد، عرفان حمید، محمود کیفی۔ ۶۶

افسانے

دستک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رعنا کوثر ۷۱
سنگ میل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قیوم خالد ۷۳
حنوط۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارم رحمٰن ۷۷
پاگل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارشد منیم ۸۰

جمالِ یار کی تفہیم

نوید سروش، طلعت منیر، کومل جوئیہ، سبیلہ انعام صدیقی، تصور اقبال، اکمل شاکر، عمران راقم، سعید سادھو، طارق تاسی، امتیاز علی گوہر، مادھو کوشک، ذکی طارق، حماد حیدر، جاوید جدون، علی شاہد دلکش۔ ۸۳

ناول

خاکِ شفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیرزادہ آلِ انوار ۸۸

رفعت العزیز مرحبا

رفعت العزیز، ولی عالم شاہین، پرویز شہریار، فیصل عظیم، جبیں نازاں، گلفام صدیقی، مسعود قمر، احمد علوی۔ ۹۹

نشانِ راہ

حاضر اللہ سائیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نسیم سحر ۱۰۴

آئینۂ فن

خُنثیٰ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ۔۔۔۔۔اظہر حسین ۱۰۶

ایک صدی کا قصہ

دھرمیندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ الوقار ۱۱۷

☆

والدہ بتول بیگم اور اہلیہ نسیم فردوس کے ساتھ

جناب مجیب الرحمن شامی، اجمل جامی اور طاہر سرور میر کے ساتھ

مسعود چوہدری، اسلم قریشی، سہیل کاظمی، رویندر کول، جاوید راہی اور لیاقت راہی کے ہمراہ

اردو پوائنٹ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے (لاہور)

ڈاکٹر اظہر محمود کے ہمراہ

سعادت حسن منٹو کی نزہت صاحبہ اور افضل ساحر کے ساتھ

قرطاسِ اعزاز
خالد حسین
کے نام

اداکار سہیل احمد بٹ کے ساتھ

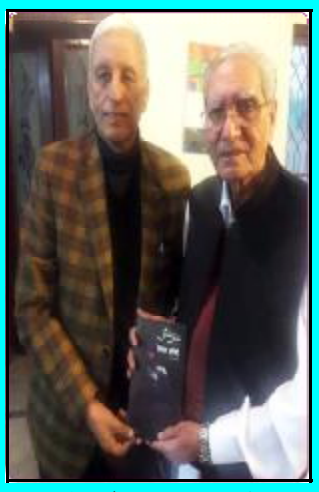

پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پنجابی کے پہلے صدر ڈاکٹر شہباز ملک کے ساتھ

سابقہ چیف جسٹس عبدالمجید ملک کی طرف سے دیے گئے ظہرانے کے موقع پر

نوبرا ویلی (لداخ) میں پوتیوں کے ہمراہ اونٹ کی سواری

سابقہ مرکزی وزیر گورنر ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ

دوماہ کا فارس اپنے دادا اور پڑنانا کی گود میں

علامہ محمد اقبال کے مزار پر اہلیہ کے ہمراہ

بلھے شاہ (قصور) کے مزار پر حاضری

بلدے دیوے

شاہد انوار

(کراچی)

نام

خالد حسین

پیدائش

یکم اپریل 1945

تعلیم

گریجویٹ، صحافت میں ڈپلومہ

ایڈریس

۲/۱۹، گرین ہل کالونی، ٹھنڈی۔۱۸۱۱۵۲، جموں

موبائل

+۹۱۔۷۰۰۶۸۹۸۵۸۵

ای میل

hussain.khalid47@gmail.com

پہلا افسانہ

گھر کی جنت (اردو ۱۹۶۹ء)

ٹھنڈی کانگڑی (پنجابی ۱۹۷۰ء)

جرائد جن میں پنجابی افسانے چھپے:

ہندوستان:

- ناگ منی (دہلی)
- عکس (دہلی)
- نیل منی (جالندھر)
- یوجنا (دہلی)
- سرجنا (چندی گڑھ)
- تصویر (جالندھر)
- جن ساہت (پٹیالہ)
- پریت لڑی (امرتسر)
- ابھینو (امرتسر)
- وریام (جالندھر)
- راہگیر (پٹی)
- ریختہ (کپورتھلہ)
- امنبر (بٹالہ)
- النکار (لدھیانہ)
- سنکلپ (لدھیانہ)
- بول قبول (پٹیالہ)
- سیدھ (دہلی)
- ترشنگلو (لدھیانہ)
- اکیم (امرتسر)
- سمکالی ساہت (دہلی)
- الوچنا (لدھیانہ)
- مہاندرا (برنالہ)
- پروچن (جالندھر)
- سمدرشی (دہلی)
- ہرکارہ (جالندھر)
- وکینڈرت (دہلی)
- جھوجھار (امرتسر)
- ساہتکار (امرتسر)
- راگ (امرتسر)
- واہگہ (امرتسر)
- ہُن (چنڈی گڑھ)
- چانن (جموں)
- آبرو (جموں)
- شیرازہ (جموں)
- ہیمال (سرینگر)

اس کے علاوہ پنجابی اخبارات میں بھی کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔

پاکستان و دیگر ممالک:

- کونج (لاہور)
- پنج دریا (لاہور)
- کھوج (لاہور)
- وارث شاہ (ملتان)
- لہراں (لاہور)
- سورج مکھی (لاہور)
- سویرا انٹرنیشنل (لاہور)
- لکھاری (لاہور)
- پنجم (لاہور)
- پنج رنگ (لاہور)

- رویل (لاہور)
- بھلیکھا (لاہور)
- سنگری (لاہور)
- پنجابی ادب (لاہور)
- قومی ڈائجسٹ (لاہور)
- دیس پردیس (لندن)
- سمندروں پار (لندن)
- وطن (کینیڈا)

اُردو:

- شمع (دہلی)
- روبی (دہلی)
- گفتگو (بمبئی)
- الفاظ (علی گڑھ)
- شاعر (بمبئی)
- شب خون (الٰہ آباد)
- سب رس (حیدرآباد)
- تحریک ادب (بنارس)
- ادب لطیف (لاہور)
- نئی دُنیا (کراچی)
- پاسبان (چندی گڑھ)
- آجکل (دہلی)
- اوراق (بمبئی)
- سطور (دلی)

ہندی:

- دھرم یُگ (دہلی)
- سمکالین بھارتیہ ساہت (دہلی)
- سوریہ انڈیا (دہلی)
- بھاشا (دہلی)
- شیرازہ ہندی (جموں)
- امرأجالا (جالندھر)
- دینک جاگرن (جالندھر)
- دینک ٹریبون (چندی گڑھ)،
- دینک بھاسکر (دہلی)

انگریزی:

- ایسٹرن ڈویلکی آف انڈیا (بمبئی)
- کشمیر ٹائمز (جموں)
- ناد (دہلی)
- انڈین لٹریچر (دہلی)
- کنٹیمپری انڈین فکشن (کلکتہ)

اس کے علاوہ تامل، ملیالم، بنگالی اور راجستھانی زبانوں میں بھی کہانیوں کے تراجم ہوئے ہیں۔

تخلیقات

پنجابی:

۱۔ تے جہلم وگدا رہیا (۱۹۷۶ء)
۲۔ گوری فصل دے سوداگر (۱۹۸۱ء)
۳۔ ڈونگے پانیاں دا دُکھ (۱۹۹۱ء)
۴۔ نُوری رِشماں (سوانح حضرت محمدؐ۔ بچوں کے لئے ۱۹۹۷ء)
۵۔ بلدی برف دا سیک (گورمکھی۔ شاہ مکھی ۲۰۰۵ء)
۶۔ گواچی جھانجری دی چیک (۲۰۱۰ء)
۷۔ ماٹی کدُم کریندی یار (۲۰۱۳ء)
۸۔ میرے رنگ دے اکھر (مضامین ۲۰۱۳ء)
۹۔ شاہ مکھی (۲۰۱۵ء)
۱۰۔ سُولاں دا سالن (۲۰۱۵ء)
۱۱۔ لفظ قلندر (پروین کمار اشک کا پنجابی کلام۔ انتخاب ۲۰۱۶ء)
۱۲۔ گھر میں ہے بیر اگ۔ پنجابی کہانیوں کا ہندی ترجمہ (۲۰۱۷)
۱۳۔ افضل ساحر کا گورمکھی روپ ''نال سجن دے رہیئے'' (۲۰۱۷ء)
۱۴۔ عشق ملنگی (شاہ مکھی ۲۰۱۹ء)
۱۵۔ گورمکھی (۲۰۲۰)

اُردو:

۱۔ ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں (۱۹۸۹ء)
۲۔ اشتہاروں والی حویلی (۱۹۹۳ء)
۳۔ دشت طلب (پنڈت ودیارتن عاصیؔ کی غزلوں کا انتخاب (۲۰۰۴ء)
۴۔ ستی سر کا سُورج (۲۰۱۱ء)
۵۔ زندگی کے مارے لوگ (عاصیؔ کی غزلوں کا ہندی انتخاب ۲۰۱۷ء)
۶۔ جنّت گرہن (۲۰۲۰ء)
۷۔ میں زندہ آدمی ہوں (خودنوشت ۲۰۲۱ء)

اعزازات:

۱۔ سری نگر سے مظفر آباد جانے والی پہلی بس ''کاروانِ امن'' کا گروپ لیڈر جو ۷ر جولائی ۲۰۰۵ء کو سری نگر سے چلی تھی۔
۲۔ جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب امتیابھ مٹو کے تعاون سے ۲۰۰۵ء

میں اجو کا تھیٹر لاہور کا ڈرامہ ''بُکھا'' جموں میں کھیلا گیا جس میں ریاست کے گورنر چیف گیسٹ تھے۔

۳۔ ۱۱۔۱۲۔دسمبر ۲۰۱۱ء کو جموں میں ''جشنِ فیض'' کا دوروزہ پروگرام کرایا گیا۔ جس میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان سے دس مشہور شاعروں نے شرکت کی۔کشور ناہید، ایوب خاور، انور مسعود، علی اکبر، ناطق وغیرہ کے علاوہ فیض احمد فیض کی دختر سلیمہ ہاشمی نے بھی شرکت کی اور گائک اُستاد حامد علی خان نے محفل موسیقی میں سامعین کو محظوظ کیا۔

۴۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی طرف سے گولڈن جوبلی کے موقع پر ۲۰۱۲ء میں خلعتِ فاخرہ سے نوازہ گیا۔

۵۔ پنجاب سرکار کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ''شرومنی پنجابی ساہتکار'' ۲۰۱۴ء کو ملا جس میں پانچ لاکھ روپے کی رقم بھی شامل تھی۔

۶۔ ریاستی کلچرل اکادمی (جموں وکشمیر) کی طرف سے ''تے جہلم وگدا ہیا''، اور ''گوری فصل دے سوداگر'' پر پہلا انعام۔۱۹۷۷ء

۷۔ بشیر بدر اور ندا فاضلی کو پونچھ کے مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی گئی اور دونوں تشریف لائے۔۱۹۹۹ء

۸۔ مرکزی پنجابی سبھا کا دوبار نائب صدر (۱۹۸۴۔۱۹۸۱ء)

۹۔ سری نگر کی ساہت سبھا کا صدر۔(۱۹۷۷۔۱۹۷۵ء)

۱۰۔ پنجابی افسانوی مجموعہ ''سُولاں دا سالن'' کو سال ۲۰۲۱ء کی بہترین کتاب کا ایوارڈ نیشنل ساہتیہ اکادمی (دہلی)۔

۱۱۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے پنجابی ایڈوائزری بورڈ کا ممبر ۱۲۔۲۰۰۷ء اور ۲۷۔۲۰۲۲ء

تعیناتی:

- کلرک سے شروع ہو کر جموں وکشمیر سرکار کے اسپیشل سیکرٹری کے عہدہ سے ریٹائر۔

۱۔ بلاک ڈیولپمنٹ افسر
۲۔ عوامی رابطہ افسر جالندھر
۳۔ پروجیکٹ افسر ڈی، آر ڈی، اے پونچھ، ڈوڈہ اور جموں
۴۔ اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ ڈوڈہ، راجوری اور پونچھ
۵۔ راجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹی جموں وکشمیر
۶۔ ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ جموں
۷۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جموں
۸۔ ڈپٹی کمشنر پونچھ
۹۔ رجسٹرار اگریکلچر یونیورسٹی جموں
۱۰۔ ڈائریکٹر ایمپلائمنٹ جموں وکشمیر
۱۱۔ ایم ڈی، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب

کلیوپیٹرا

کلیوپیٹرا استرہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھی اور انتالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ وہ نو زبانیں بولتی تھی۔ وہ قدیم مصر کی زبان جانتی تھی اور ہیرو گلیفکس پڑھنا سیکھ چکی تھی جو اس کے خاندان میں ایک منفرد واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ یونانی اور پارتھیوں، عبرانیوں، میڈیس، ٹروگلوڈائٹس، شامی، حبشیوں اور عربوں کی زبانیں جانتی تھی۔

اس علم سے دنیا کی کوئی بھی کتاب ان کے لیے کھلی تھی۔ زبانوں کے علاوہ، اس نے جغرافیہ، تاریخ، فلکیات، بین الاقوامی سفارت کاری، ریاضی، کیمیا، طب، حیوانیات، معاشیات اور دیگر مضامین کا مطالعہ کیا۔ اس نے اپنے وقت کے تمام علم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

کلیوپیٹرا نے ایک قسم کی قدیم تجربہ گاہ میں کافی وقت گزارا۔ اس نے جڑی بوٹیوں اور کاسمیٹکس سے متعلق کچھ کام لکھے۔ بدقسمتی سے اس کی تمام کتابیں ۳۹۱ عیسوی میں اسکندریہ کی عظیم لائبریری میں آگ لگنے سے تباہ ہو گئیں۔

مشہور ماہر طبیعیات گیلن نے کلیوپیٹرا کے کام کا مطالعہ کیا، اور وہ کلیوپیٹرا کی وضع کردہ کچھ ترکیبیں نقل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ان میں سے ایک علاج، جو گیلن نے اپنے مریضوں کو بھی تجویز کیا تھا، ایک خاص کریم تھی جو گنجے لوگوں کو اپنے بالوں کو دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دے سکتی تھی۔ کلیوپیٹرا کی کتابوں میں بیوٹی ٹپس بھی شامل تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی کتاب ہمارے سامنے نہیں آئی۔

کلیوپیٹرا کو جڑی بوٹیوں کے علاج میں بھی دلچسپی تھی اور ان کی زبانوں کے علم کی بدولت انہیں متعدد پاپیری تک رسائی حاصل تھی جو آج کھو چکے ہیں۔ سائنس اور طب پر اس کا اثر عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں مشہور تھا۔

وہ، بلاشبہ، تاریخ انسانی میں ایک منفرد شخصیت ہیں۔

☆

- افسانہ -

عشق ملنگی

خالد حسین

لاہور میں داتا دربار کے سامنے پٹری پر چند عورتیں اور مرد چھوٹے چھوٹے پنجروں میں طوطے اور چڑیوں کو لئے گاہکوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ اکثر عقیدت مند داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دینے کے بعد اُن کے پاس آتے ہیں اور پرندوں کی قیمت چُکا کر چڑیوں اور طوطوں کو پنجروں سے آزاد کراتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے اپنا یار گامانائی یاد آ گیا، جس کی دُکان جموں کے اُردو بازار میں تھی اور دُکان کی چھت پر اُس نے ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ اُس چڑیا گھر میں گامے نائی نے چڑیوں اور طوطوں کے علاوہ کبوتر اور بندر بھی پال رکھے تھے۔ وہ بال کاٹنے کے ساتھ ساتھ طوطوں اور بندروں کو سِدھارنے اور اُنھیں کرتب سِکھانے میں بھی ماہر تھا۔ کئی مداری والے اُس سے بندر خرید کر لے جاتے اور اپنی روزی روٹی کماتے۔ ایک بندر گامی نے ایسا سدھایا تھا کہ بال کاٹتے یا حجامت بناتے ہوئے بھی وہ اُس کے شانوں پر چڑھا رہتا۔ گامی چرس والے سگریٹ پینے کا عادی تھا۔ وہ چرس والے سگریٹوں کا دُھواں بندر کے نتھنوں میں ڈالتا اور یوں اُسکے ساتھ دِل لگی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے پالتو بندر کو سگریٹ کا ایک آدھ کش بھی لگوا دیتا۔ اس طرح دھیرے دھیرے گامی چرسی کا بندر چرس کے دھوئیں کا عادی ہو گیا، اور وہ اس نشے کے خمار میں مست رہتا۔ دو تین بندروں کی تربیت گامے نائی نے اِس عُمدگی سے کی تھی کہ جو بھی اُنھیں خرید کر لے جاتا، وہ بعد میں پچھتاتا کیونکہ آٹھ دس دِنوں کے بعد وہ بندر اپنے مالک کو چھوڑ، واپس گامی کے پاس آ جاتے۔ گامی نے اپنے پالتو بندر کا نام لٹو رکھا ہوا تھا۔ لٹو گامی کی سِکھلائی ہوئی فنکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ کئی بار ساتھ والی دُکانوں کے اندر چلا جاتا اور دُکاندار سے نظر بچا کر چونی، اٹھنّی اور روپے کا سِکّہ مونہہ میں ڈال لیتا اور دو چار چھلانگیں مارتا ہوا پھر اپنی دُکان پر آ جاتا، اور پیسے گامی کو دے دیتا۔ گامانائی پیسے جیب میں ڈال لیتا اور یوں یہ موج میلہ لگا رہتا۔ ایک بار گامی دو روز کے لئے کسی رشتے دار کی شادی پر جگاؤ گاؤں چلا گیا اور دوکان اپنے شاگرد اور لٹو کے حوالے کر گیا۔ دو دن چرس کے سگریٹوں کا دھواں نہ ملنے کی وجہ سے لٹو کا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور وہ نڈھال ہو کر دُکان کے ایک کونے میں مریل سا پڑا تھا۔ گامی کے واپس آتے ہی وہ کُود کر اُسکی گود میں بیٹھ گیا اور اُسکے جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ گامی ساری بات سمجھ گیا۔ اُس نے چرس بھرا سگریٹ سُلگایا اور دُھواں لٹو کے مُونہہ پر پھینکنے لگا۔ دُھواں سونگھنے سے اُسے ہوش آنے لگا۔ گامی نے سگریٹ کے پانچ سات لمبے لمبے کش لئے اور دُھواں لٹو کے نتھنوں میں ڈالنے لگا۔ دُھواں اندر جاتے ہی لٹو چُست اور چالاک ہو گیا۔

گامے نائی کا ایک جگری دوست تھا، جس کا نام کالے خان تھا۔ وہ صرف نام کا کالے خان تھا ورنہ وہ تو گورا چِٹا، لمبا اور خوبصورت پٹھان تھا۔ وہ ایک کوچوان تھا اور اُسکے پاس اپنا ٹانگہ گھوڑا تھا۔ وہ گُمٹ اڈے سے اور کبھی بیچ تیرتھی سے سواریوں کو لیکر نہر یا ستواری کے تین چار پھیرے لگاتا اور پھر گامی کی دُکان پر آ جاتا۔ اپنا ٹانگہ اور گھوڑا وہ کبھی محلّہ تالاب کھٹیکاں میں وزیرِ وزارت سردار اکرم خان دُرانی کی حویلی کے پاس یا پھر محلّہ جیون شاہ والے چوک میں کھڑا کر دیتا اور گھوڑے کے آگے چارے والا تھیلا رکھ کر خود گامے نائی کی دُکان پر بیٹھ جاتا۔ وہ گامی کی دُکان پر گپیں مارنے کم، اور زیادہ آنکھیں سینکنے کیلئے بیٹھتا تھا کیونکہ فیروزہ کسبی کا چوبارہ گامی کی دکان کے بالکل سامنے تھا اور کالے خان فیروزہ کا عاشق تھا۔ وہ اُس کے ساتھ نظر بازی کرتا رہتا۔ کالے خان یوں تو ایک سیدھا سادھا انسان تھا لیکن اُسکی آنکھوں میں فیروزہ کو حاصل کرنے کے سپنے ناچتے رہتے۔ میں بھی دفتر سے فارغ ہوتے ہی گامی کی دُکان پر آ جاتا اور ہم دونوں کالے خان کا مذاق اُڑاتے رہتے۔

اُردو بازار سن سنتالی سے پہلے بڑا رونق والا بازار تھا۔ یہاں کسبیّوں اور ڈیرے دارنیوں کے چوبارے تھے اور چوباروں کے نیچے پھولوں، عطر، پان، سگریٹ، چائے، دودھ دہی، مٹھائی اور نہاری کی دُکانیں تھیں۔ شیشے، کنگھے، پراندے، چُوڑیاں، کنگن، جھمکے اور چھلّے کی چھابڑیاں تھیں۔ برف، کُلفی، شربت، سوڈا اور نمبو پانی کی ریڑھیاں تھیں۔ افیم، چرس، گانجا اور شراب بے حساب دستیاب تھی۔ اس بازار میں ملکہ پکھراج، اُسکی پھوپھیاں نیلو اور فیلو، ماموں زاد بہن زبیدہ، بھاگو پیرنی کی بیٹی گوہر جان، اقبال بالی، تاجی، زُمّرد، سردار بیگم اور موتی جان اپنے حُسن کے جلوے لُٹاتیں اور موج مستی کے شوقین نوجوانوں، خضاب رنگے اور مہندی رتے عاشقوں کی جیبیں ہلکی کراتیں۔ گانے بجانے کی محفلیں رت جگا کرتیں۔ موتیے، گلاب اور مُول سری کے پھولوں کی خشبوئیں دِل رُبائی کرتیں۔ الھڑ جوانیوں اور سُریلی آوازوں کا سنگم قیامت ڈھاتا اور من چلے فرشتوں کو ترساتا۔

یہ شاید سن چالیس کی بات ہے کہ پٹیالہ گھرانے کے مشہور گائیک اور کلاسیکی سنگیت کے ماہر خان صاحب اُستاد عاشق علی خان پٹیالے سے جموں آئے تھے۔ اُنہوں نے ریذیڈنسی روڈ پر بنی کشمیر سوپ فیکٹری کی چھت پر گیت سنگیت کی محفل میں شرکت کی اور اپنی گائیکی کا کمال دکھایا۔ اُستاد عاشق علی خان صاحب کو سننے کیلئے ملکہ پکھراج، گوہر جان، سردار بیگم اور موتی جان بھی آئیں تھیں۔ گوہر جان اور سردار بیگم نے تو ازراہِ عقیدت خان صاحب کے پاؤں بھی دبائے تھے۔ وہاں کسی نے خانصاحب سے فرمائش کی کہ وہ کُندن لال سہگل کی راگ گندھاری میں گائی ہوئی ٹھمری، ''جھولنا جھلاؤ ری، انبوا کی ڈالی پہ کوئل بولے'' سُنائیں۔ خان صاحب ہلکا سا مُسکرائے اور پھر اُنہوں نے گندھاری شروع کی اور اپنی آواز سے

محفل کومست بنادیا اور یہ بھی بتادیا کہ گندھاری کا اصل روپ کیا ہے اور پٹیالہ گھرانے کی لئے کاری کسے کہتے ہیں۔ پھراُنہوں نے ایک دادرا سُنایا۔ بول تھے۔''کہاں رِگری رے مورے ماتھے کی بِندیا۔''محفل ختم ہوئی۔خان صاحب کی عزّت افزائی کی گئی۔انعام واکرام سے نوازا گیا۔شال دوشالے پیش کئے گئے اور کئی رئیس گھرانوں میں اُن کی دعوتیں بھی ہوئیں۔ملکہ پُکھراج نے اُن کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور پھرسنگیت کی دُنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔

پرکالے خان کو نہ تو سنگیت کی محفلوں میں بیٹھنے کا شوق تھا اور نہ ہی کسبّیوں سنگ رباب بجانے کا چاؤ۔ وہ تو صرف فیرِوزہ کا الغوزہ تھا۔فیرِوزہ کیلئے اُس کی محبت ایک نُوری کلمہ تھی۔رُوح کا ساز تھی اور دِل کی آواز۔وہ فیرِوزہ کے سر پر عزّت کی چادر ڈالنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا تھا اور اپنی ذات کو اُس کے وجود میں گُم کرنا چاہتا تھا۔جبھی تو وہ گامے نائی کی دُکان پر بیٹھ کر اپنی آنکھوں کو فیرِوزہ کے چُوبارے کا طواف کراتا رہتا اور ہلکے سُر میں ماہیئے گاتا رہتا۔

ویسے تو کالے خان کورا ان پڑھ تھا مگر عشق کتاب کے الفاظ اُس کے دِل نے خوب پڑھے تھے اُس بیچارے کی خواہش تھی کہ فیرِوزہ پیار کی گاجنی سے اُس کے دِل کی تختی کو لیپ دے اور موہ کے حروف لکھے اور اُس کی رُوح کو سکون بخشے۔فیرِوزہ کیلئے اُس نے اپنی آنکھوں میں شرم وحیا کا سُرمہ ڈالے رکھا اور من کے گھوڑے کی لگام مضبوطی سے پکڑے رکھی اور اُسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ کالے خان فیرِوزہ کے حُسن کا شیدائی تھا اور کہتا تھا کہ اللہ میاں نے عاشق کو عِشق اور معشوق کو حُسن کی دولت سے نوازا ہے، جب دونوں ایک ہو جائیں تو ''کچے گھڑے'' بھی پار لگ جاتے ہیں۔فیرِوزہ کو دیکھتے ہی کالے خان کے من موسم میں سرسوں پھُوٹ پڑتی اور دِل باغ و بہار ہو جاتا۔وہ من ہی من میں فیرِوزہ کو پیار پیپل پر جھولا جھولاتا اور گاتا،''پینگ چُوٹیندے دوجنے نی اویے'۔۔ عاشق تے معشوق وے ماہیا''۔ پردیے کا نام لینے سے بھلا اندھیرا ابھی دُور ہوا ہے کبھی۔اُس کے لئے تو چراغ جلانا پڑتا ہے جو ابھی تک جلا نہیں تھا۔کالے خان گامی کی دُکان پر بیٹھ کر فیرِوزہ کے دِید کی عید مناتا مگر بات کرنے سے ڈرتا تھا۔ گامی جانتا تھا کہ جب سے کالے خان نے فیرِوزہ کے ساتھ آنکھ لگائی ہے تب سے اُس کی آنکھ نہیں لگی اور وہ گُم سُم سا رہنے لگا ہے لیکن وہ کالے خان کو کچھ نہیں کہتا۔صِرف عِشق نظارا دیکھتا رہتا۔آہستہ آہستہ فیرِوزہ کو پتہ چل گیا کہ کالے خان نام کا کوئی کوچوان گامے نائی کی دُکان پر بیٹھ کر اُسے تاکتا رہتا ہے۔ایک دِن اُس نے گامے کو اپنے چوبارے پر بُلایا اور کالے خان کے بارے میں پُوچھ گچھ کی۔جب گامی نے بتایا کہ کالے خان ایک سیدھا سادہ بندہ ہے اور اپنے دِل کی سُرمے دانی سے اُس کے نینوں میں عشق کا سُرمہ ڈالنا چاہتا ہے اور اُسے اپنا بنانا چاہتا ہے تو فیرِوزہ کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ وہ غُصّے سے لال پیلی ہو گئی اور پھُنکارنے لگی۔

''وہ کمینہ اور گھٹیا کوچوان مجھے حاصل کرنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ذات کا کوڑھ کرِلا اور شہتیری کو جھپّے۔بس اس بات کو یہیں ختم کر دو۔کسی اور کے ساتھ بکواس مت کرنا۔میرے چوبارے پر رئیس زادے اور وڈیرے آتے ہیں اور دولت لُٹاتے ہیں۔وہ ٹانگے والا مجھے کیا دے گا۔اُس کی اوقات ہی کیا ہے۔ اُسے سمجھا دے کہ وہ میرے خواب دیکھنے چھوڑ دے اور یہاں سے دفع ہو جائے ورنہ غنڈوں سے اتنا پٹواؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے''۔فیرِوزہ کی باتیں سُن کر گامی نے کہا تھا

''فیرِوزہ بی بی! کالے خان تمہارا سچا عاشق ہے۔وہ تُمہیں دِل کی دولت دے سکتا ہے۔جان تمہارے نام کر سکتا ہے۔اُس کا عشق اذان کی طرح پاک ہے۔اُسے تمہارے حُسن نے ٹھگ لیا ہے۔اُسے تمہیں دیکھنے کا چسکا لگ گیا ہے۔ وہ تڑپ رہا ہے اُس کی زندگی خاک میں نہ ملا، ورنہ اُس کے دِل کی دہلیز کو دیمک کھا جائے گی اور آنکھوں کا کوٹھا ٹپک پڑے گا۔وہ سرد، گرم موسم میں تمہارا ساتھ دے گا۔فیرِوزہ بی بی! جوبن کے دن چار، پھر نہیں ملتے یار، اور جب تن طنبورے کی تاریں ڈھیلی ہو جائیں تو عمر کی سانسی اُنہیں کس نہیں سکتی۔مگر کالے خان تیز دوپہر میں تمہاری گھنی چھاؤں بنے گا اور ڈھلتی شام میں تمہارا سہارا۔بی بی! رُوپ سرُوپ کی مایا کا مان نہ کر۔یہ سب چھل فریب ہے، مگر اُس کا عِشق امبری سیب ہے۔میٹھا اور جھرنے کی طرح پاک وصاف۔فیرِوزہ! تمہاری دُنیا جھُوٹ ہے، اُس کی دُنیا سچ۔اور جھوٹ سے بڑا اچھل کوئی نہیں جبکہ سچ سے میٹھا پھل کوئی نہیں۔ یہ رئیس زادے اور وڈیرے جسموں کے بھُوکے ہوتے ہیں پر کالے خان تمہاری رُوح کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔اسلئے یہ بے رُخی چھوڑ۔حُسن کا گمان نہ کر۔یہ مٹی میں مل جاتا ہے باقی صرف اللہ کا نام رہتا ہے''۔

''گامی! مجھے لفظوں کے جال میں نہ پھنسا۔لفظ کاغذوں پر ناچتے اچھے لگتے ہیں۔زندگی کی کسوٹی پر ان کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔عِشق، پیار، محبت کی باتیں کرنا ہوس پرست مردوں کے چونچلے ہوتے ہیں۔تم یہ سانگ رچانے چھوڑ و اور نکلو یہاں سے''۔وہ اُلٹا سیدھا بولتی رہی۔گامی سُنتا رہا۔اُس کی کوئی دلیل قبول نہیں ہوئی۔آخر وہ ہار کر فیرِوزہ کے چُوبارے کی سیڑھیاں اُتر آیا۔ کچھ دیر بعد کالے خان بھی دُکان پر آ گیا۔گامی نے اُسے فیرِوزہ کے ساتھ ہوئی ساری گفتگو سُنائی اور سمجھانے لگا۔''کالے خان! تم میری دُکان پر بیٹھ کر فیرِوزہ کو تاکنا چھوڑ دو۔وہ بڑی خبیث عورت ہے۔تمہاری شکل سے بھی بے زار۔وہ تمہیں غُنڈوں سے پِٹوانا چاہتی ہے۔وہ آگ اُگل رہی تھی۔اور باؤلی کُتیا کی طرح مجھ پر غُرا رہی تھی۔اس لئے فیرِوزہ کا خیال چھوڑ دے۔تم نہیں جانتے کہ رنڈی کا شور شرابہ اچھا نہیں ہوتا۔تمہیں فیرِوزہ کے سر پر عزّت کی چادر سجانے کا شوق چڑھا ہے لیکن یہاں اُردو بازار کے چوباروں کی ریت نرالی ہے۔یہاں دوشیزائیں سرنگی رہتی ہیں مگر سرنگی کو غلاف چڑھاتی ہیں تاکہ ساز آباد رہیں''۔

گامے نائی کی باتیں کالے خان کے پلّے نہیں پڑیں۔اُس نے اب ٹانگے کے پھیرے لگانے بھی کم کر دیئے تھے اور سارا سارا دن گامی کی دُکان

پر بیٹھا رہتا اور فیروزہ کے چوبارے کی طرف دیکھتا رہتا تا کہ یار کے دیدار ہوں۔ دکان بند ہونے کے بعد بھی وہ چبوترے پر بیٹھا رہتا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ گاؤں کے لوگ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی جاگ اُٹھتے ہیں مگر شہرات کو جاگتے ہیں اور دن میں سوتے ہیں۔ خاص کر جموں کے اُردو بازار کے باسی۔ اس لئے جب تک اُردو بازار جاگتا۔ کالے خان بھی جاگتا رہتا اور سحری کے وقت گھر جاتا۔ دکانیں کھلتے ہی وہ پھر بازار میں آ جاتا۔

عشق بلائے جان نے اُس کی نیندیں چُرا لی تھیں۔ جلد ہی کالے خان کی یہ پریم کہانی محاوروں کی طرح مشہور ہوگئی۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ اُس کے یار دوست اُسے سمجھانے لگے۔

''کالے خان! تمہارے کرتوت کا سُن کر میری تو کمر ہی ٹوٹ گئی۔ میرے یار! یہ کون سے کیچڑ میں دھنس گئے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ اوئے پاگل! کنجری کو دِل دے بیٹھے ہو۔ یہ کیا کر بیٹھے ہو۔ تُو نے کس بلا پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہاں جموں میں بھلا لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت۔ تم جس مٹیار پر اُنگلی رکھتے، اُسی کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھوا دیتے''۔ سلیم پانڈی بول رہا تھا۔ ابھی اُس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ شِیدا قصائی کہنے لگا۔

''تمہیں یہ کون سا عشق کا جِن چمٹ گیا کہ تم نے تانگہ گھوڑا کرایے پر دے دیا اور خود فیروزہ کے چولہے کی راکھ چھان رہے ہو۔ شرم کر شرم۔ اِن کوٹھے والیوں کے چکروں میں نہ پڑ۔ کیوں اِس موہ کی بھُوک کو پال رہے ہو۔ یہ بھُوک پالنے لائق نہیں ہے۔ کیوں ٹُوٹ پھُوٹ کا شکار ہوتے ہو۔ ہوش کرو۔ عقل کو ناخن نہ مارو اور دِل کے تار کُھرچنے بند کر دو۔ خواہشوں کی بستی میں صرف اندھیرا ہوتا ہے۔ اس لئے چاہتوں کی گھڑولی پھوڑ اور اُس کا خیال چھوڑ۔ حوصلہ کر اور تانگہ پکڑ۔ ہم آج ہی تیرے لئے رشتہ ڈھونڈتے ہیں۔ تیری شادی کراتے ہیں۔ اپنی گھر ہستی بنا اور موج منا''۔

''شِیدے یار! فیروزہ کیلئے میرے من کا پنچھی پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ پر تُم لوگ عشق کی رمز کو کیا سمجھو۔ یہ جو زندگی ہے نا، یہ ایک سوئی ہے، اور اس سوئی میں عِشق کا دھاگہ کوئی سوچ سمجھ کر نہیں پروتا۔ دوسری بات یہ ہے شِیدے! کہ عشق مانگنے سے نہیں ملتا۔ یہ تو روحوں پر نازل ہوتا ہے۔ اور میری روح بھی فیروزہ کے دِل دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ آگے میری قسمت۔ اگر میری تقدیر میں ہجر سزائیں ہیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے درد کا بوجھ خود برداشت کرنا ہے۔ پھر تمہیں تو پتہ ہوگا کہ عشق کی منزل کو جانے والے راستے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ان راہوں پر چلنے والا ایک راہی اگر چلا جاتا ہے تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔۔ مجنوں، فرہاد، پنّوں، مہینوال، مرزا اور رانجھا سبھی اِسی راہ کے راہی تھے۔ میں بھی اِس راستے پر چل پڑا ہوں۔ آگے میرا مقدر۔ تم میری فکر مت کرو۔ وہی ہوگا جو منظورِ خُدا ہوگا''۔

ایک دن جب کالے خان کی چاہت مونہہ زور ہوئی تو اُس نے فیروزہ کے چوبارے پر حاضری دینے کی ٹھان لی۔ وہ گامے نائی کی دکان سے نیچے اُترا، سڑک پار کی اور چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''تم! تم کیا لینے آئے ہو یہاں''؟ فیروزہ گرجی۔

''میں اپنے دِل کے کہنے پر تم سے پیار کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اپنی محبت کا شربت پلا۔ تجھے بسم اللہ کا ثواب ملے گا۔ فیروزہ! میری دِل کی کٹیا میں بڑی سیلن ہے تو موہ کی اگنی بال تا کہ میں ہو جاؤں نہال''۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ تجھے گامے نائی نے نہیں سمجھایا۔ تیری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے۔ کیوں مرنے کیلئے یہاں آئے ہو۔ سُور کے بچے۔۔ تمہیں اتنی مار پڑے گی کہ اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل نہیں رہو گے۔ یہ عشق مُشق کے چونچلے چھوڑ اور دفع ہو جا یہاں سے۔ ساری مرد ذات کام کا کیڑا ہوتی ہے۔ اِن کا پریم دکھاوا۔ دھرم دکھاوا۔ کرم دکھاوا۔ یہ باہر سے پیار کی قسمیں کھاتے ہیں مگر اندر سُلگے کام کا لاوا۔ میں مردوں کے سارے چھَلن سمجھتی ہوں''۔

''فیروزہ! تم چاہے مجھے غنڈوں سے پٹواؤ، چیلوں اور گِدھوں کو میرا ماس کھلاؤ۔ کُتوں کو میری ہڈیاں ڈالو۔ میں پھر بھی زندہ رہوں گا۔ میری کتھا کہانی جگ میں امر گیت بنے گی کیونکہ میرا عشق میرا جُنون ہے۔ اور جُنون کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ فیروزہ! تمہارے بازار میں کوڑیوں کے بھاؤ قہقہے بِکتے ہیں۔ آنکھوں کے اِشارے بِکتے ہیں۔ شریر کے نظارے بِکتے ہیں۔ تم بھی تو جسم بیچتی ہو۔ پر میں خریدار نہیں۔ اگر میں کام کا روگی ہوتا تو تیرا بھوگی ہوتا۔ لیکن میں تو تمہارے ساتھ نکاح کے کلمے پڑھنا چاہتا تھا اور تمہیں اپنانا چاہتا تھا مگر تم تو بے حیائی کا چولا اُتارنا ہی نہیں چاہتی۔ یاد رکھو کہ سدا باغوں میں بلبلیں نہیں بولا کرتیں اور نہ ہی سدا باغ بہاریں رہتی ہیں۔ یہ حُسن، جوانی، یاروں کی دلداریاں، سب مکّاریاں ہیں۔ میری بات پلے باندھ لے کہ ایک وقت آئے گا جب تمہارا درد بانٹنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اُس وقت میرا عشق تمہارا سہارا بنے گا۔ اسلئے فضول تماشے کرنے چھوڑ دو۔ آنکھ میلی نہ کرو اور میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے سوچ کر جواب دو۔ میں پھر آؤں گا''۔

خبردار، جو دوبارہ یہاں قدم رکھا، حرام کے تُخم۔ خنزیر کی اولاد۔ تم جاتے ہو یا بُلاؤں مُشٹنڈوں کو۔ فیروزہ کی اونچی آوازیں سُن کر ایک بھڑوا آیا اور اُس نے کالے خان کو دھکے مار کر کوٹھے سے باہر نکال دیا۔ وہ بیچارہ اُداس، غمگیں، پھر گامی کی دکان پر آ بیٹھا۔ کالے خان کو دیکھ کر ہم نے پوچھا۔ ''فیروزہ کے کوٹھے پر کیا لینے گئے تھے؟''۔

''ظاہر ہے، دُرود پڑھنے تو نہیں گیا تھا۔ اُسے اپنا سینا چیر کر اُس میں اُس کی تصویر دکھانے گیا تھا۔ لیکن فیروزہ کی عقل بھی دوسری عورتوں کی طرح اُس کے ٹخنوں میں بند ہے۔ اُس کی آنکھیں بھی کوری ہیں اور دِل بھی کورا۔ اُس نے مجھے دِل کا دروازہ کھولنے ہی نہیں دیا''۔ کالے خان ہمیں سنا رہا تھا۔ اُس کا کرب اُس کے چہرے سے عیاں تھا۔

''چہارسُو''

گامی بولا ۔''میں نے تم کو سمجھایا تھا کہ ان تِلوں سے تیل نہیں نکلنے والا۔کیوں پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو۔پر تم باز ہی نہیں آتے ۔۔تم کو عشق ناگ نے ڈسا ہے اور زہر تمہارے جسم میں پھیل چُکا ہے۔نہ جانے تمہیں کس پیر فقیر نے عشق بُوٹی سُونگھائی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کا مقصد فیروزہ کو بنالیا۔تم کیوں نہیں سمجھتے کہ عورتیں دکھائیں جتنے رنگ،ایک ہی لذّت ایک ہی ڈھنگ، پھر وہ چاہے فیروزہ ہو ۔زبیدہ ہو،شکنتلا ہو یا روزی۔سُن کالے خان! نار سفید جھوٹ ہے۔بے وفا مکّار ہے اور آگ کا انگار ہے۔اس لئے میری سُن اور اس آگ میں جلنے سے باز آجا۔ فیروزہ کو بھول جا اور نئے رشتے تلاش کر۔شادی کرلے اور اپنا گھر بسا۔مگر تُم ہو کہ مانتے ہی نہیں۔اتنی بے عزتی اور پھٹکار کھانے کے باوجود بھی تمہاری آنکھیں بھنورے کی طرح فیروزہ کے چوبارے کی جانب منڈلاتی رہتی ہیں۔''

کالے خان گامی کی باتیں سُنتا رہا۔پھر لمبا سانس لے کر کہنے لگا۔

''گامی یار! تم تو لفظ گھڑنے میں ماہر ہو۔تم سے بھلا کون جیت سکتا ہے لیکن میں اپنے دِل کا کیا کروں۔''

''کالے خان! کیوں کولہُو کے بیل کی طرح ایک ہی کھونٹے سے بندھے گھوم رہے ہو۔اپنے آپ پر رحم کھاؤ۔کیوں اس جنم میں دُکھ بھوگنے آئے ہو۔ مجھے تمہارے دُکھ کا بڑا دُکھ ہے۔اس لئے میری بات مان لے۔اُس کمینی ذات کیلئے اپنی زندگی برباد نہ کر''۔

گامی یار! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔میرا عشق میرا ربّ ہے اور میری فریاد میرے رب سے ہے۔مُرشد کہتا ہے کہ ''ربّا! میرے حال کا محرم تُو۔تُو ہی تانا،تُو ہی بانا،روم روم میں تُو۔''

سورج روز چڑھتا رہا اور ڈھلتا رہا۔آس کا چراغ جلتا رہا لیکن فیروزہ نہیں آئی۔کالے خان کے مُنہ سے آہیں نکلتی رہیں اور وہ ملنگ ہوگیا۔اِس عشق ملنگی میں اُسے دُنیا کی کوئی خبر نہیں رہی۔اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ دیش میں کب آندھی چلی۔کب طوفان آیا اور کیوں آیا۔دھرتی دو پھاڑ کیوں ہوئی۔اِتنا بڑا زلزلہ کیسے آیا کہ جس کی شدّت کو ناپنا ریکٹر سکیل کے بس سے باہر ہو گیا، اور کیسے اس بھونچال نے انسانیت کو اندھا کر دیا۔لاکھوں لوگوں کی مارکاٹ ہوئی۔کروڑوں اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے۔کالے خان حیران تھا کہ یہ کیسا تنازعہ تھا کہ جسے کوئی حل نہیں کر سکا۔جبکہ صرف ایک کلمے کا فرق تھا ورنہ ہندو مسلمان پیار میں غرق تھا۔شاید مذہب اپنے وجُود کا قیدی ہوتا ہے۔جبھی تو تباہی مچاتا ہے۔ فسادیوں نے قہر ڈھایا۔سب کچھ چھین لیا۔افراتفری مچ گئی۔لوگ سانسوں کے بھُو کے اپنی جڑیں کاٹ کر بھاگ گئے۔جولاہا محلّہ،دلپتیاں محلّہ،پیر مٹھا،تالاب کھٹیکاں،محلّہ افغاناں اور اُستاد محلے کی بستیاں خالی ہوگئیں۔توی،اُوجھ اور بسنتر کی ندیوں کے پانی کا رنگ لال ہوا۔بچہ سقّا کی طرح چیلوں،کوؤں اور گِدھوں کو بھی کچھ دِنوں کا راج ملا،کچا گوشت کھانے والی یہ مخلوق بڑی خوش تھی۔کیوں کہ اُنہیں پہلی بار الگ قسم کا لذیذ گوشت کھانے کو ملا تھا۔لاشوں کا بیوپار ہو رہا تھا۔ لاشیں آرہی تھیں اور لاشیں جارہی تھیں لوگوں کی آواجائی لگی ہوئی تھی۔ایک پل کے فیصلے نے ہماری تہذیب،ہمارا تمدن،ہم سے چھین لیا۔صدیوں کا بھائی چارہ بھیڑیوں نے چیر پھاڑ دیا۔قتل وغارت اور بھاگ دوڑ کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔پھر آندھی اور طوفان تھم گیا۔جموں کی خالی بستیاں نئے لوگوں نے آباد کیں۔گامی اور کالے خان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ فیروزہ، زبیدہ، بالی، تاجی اور گوہر جان، کسی کا اتا پتہ نہیں چلا۔طبلے،باجے،گھنگھرو،ڈھولک،سرنگی ستار سب بے کار ہو گئے۔اُردو بازار اُجڑ گیا۔رونقیں ختم ہوگئیں۔پنچھی اُڑ گئے۔کُچھ دنوں کے بعد مجھے گامے نائی کی خیریت کی اطلاع مل گئی۔اُس نے سیالکوٹ کے محلّہ پُورن نگر میں دُکان کھول لی تھی اور باقی کے شوق بھی برقرار رکھے تھے مگر کالے خان کا کوئی اتا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چُکا ہے۔جموں پھر پہلے کی طرح رسنے بسنے لگا۔اُردو بازار ،راجندر بازار بن گیا۔کسبیوں اور ڈیرے دارنیوں کے چُوباروں پر سرکار نے قبضہ کرلیا۔مہاجروں کے مکان ،زمینیں اور جائیدادیں وہاں سے آنے والے شرنارتھیوں کو الاٹ کر دی گئیں۔خلقت بے شک برباد ہوئی لیکن خدا کی خُدائی آباد رہی۔

پھر ایک بار میں بھارت پاکستان کرکٹ میچ دیکھنے کیلئے لاہور گیا اور وہاں آباد جموں کے پناہ گزینوں سے مِلا۔سبھی اپنے ساتھ بیتی وحشت زدہ کہانیاں سُنانے لگے۔اور جموں کے بارے میں پوچھنے لگے۔اپنے گھروں سے متعلق، محلے بازاروں سے متعلق،گلیوں اور چُوباروں کے بارے میں،یار دوستوں کے بارے میں،رشتے داروں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں،اور آنکھیں بھیگتی رہیں۔مجھے یوں لگا کہ تقسیم کی دِل خراش یادیں ابھی دو چار نسلوں تک ہمیں چبھتی رہیں گی۔پھر میں نے کالے خان کے بارے میں پوچھا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔حالانکہ میرا ویزا لاہور کا تھا۔پھر بھی میں چُپ چاپ سیالکوٹ چلا گیا تا کہ کالے خان کو تلاش کر سکوں۔گامانائی فوت ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا نائی کی دُکان چلا رہا تھا۔وہاں بھی میں جموں سے گئے لوگوں کو ملا۔اُردو بازار کے ایک پان فروش جس نے سیالکوٹ قلعے کے پاس پان سگریٹ کی دُکان کھولی تھی ،مجھے بتایا کہ کالے خان زندہ ہے اور نارووال میں رہتا ہے۔میں نارووال جا پہنچا اور کالے خان کو ڈھونڈنے لگا۔کچھ ہی دیر میں کالے خان کو میں نے ایک سڑک پر پتھر توڑتے جا پکڑا۔اُس کو دیکھ کر میرے دِل کو سخت صدمہ ہوا۔وہ کُبڑ کا چھوہارا بن چکا تھا۔اُس کے بالوں میں چاندی چمک رہی تھی۔مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی۔اُس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا۔ہم دونوں نے خوب آنسو بہائے۔جب مَن ہلکا ہوا تو میں نے پوچھا۔

''کالے خان! تُم نے اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے؟ تمہارا تانگہ گھوڑا کہاں ہے؟ فیروزہ کا کوئی اتا پتہ؟ وہ تمہیں ملی یا نہیں؟۔

''بابو! جہاں گئی فیروزہ ،وہاں گیا تانگہ گھوڑا۔میں نے اُسے بہت تلاش کیا۔سیالکوٹ ،جہلم،میر پور اور لاہور کے رفیوجی کیمپوں میں ڈھونڈا۔لاہور کی

باقی صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

اردوزبان وادب کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ مختلف رنگ ونسل کے ساتھ خطۂ ارض کے کونے درکونے میں، اردو زبان و ادب سے جڑے احباب، برادری کی مانند، ایک دوسرے کے قلمی وقلبی رفیق ہونے کے ساتھ، ہمدم ہمراز و ہم آواز ہوکر ایک ایسی ثقافت کو پروان چڑھا رہے ہیں جسے محبت کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا!

برادرِ محترم و منّور جناب **خالد حسین** صاحب درج بالا الفاظ و احساسات سے لبریز ایک ایسے دانشور ادیب اور شاعر ہیں جن کا خمیر اوّل وآخر محبت میں گندھا اور محبت کی خوشبو بن کر، اردو زبان وادب کے ساتھ پنجابی زبان وادب کو باریاب کرگیا!!

آج کی بزمِ خاص **خالد حسین** صاحب کے قلمی کمالات اور فتوحات کے اعتراف میں آراستہ کی گئی ہے جس میں ہر صاحبِ دل اور صاحبِ نظر کو جناب **خالد حسین** کے فنی محاسن، موضوعِ گفتگو بنانے کی دعوت عام ہے!!!

.....گلزار جاوید

☆ گفتگو کا آغاز ہمیشہ اچھی اور خوشگوار یادوں سے کیا جاتا ہے، ہماری مجبوری ہے کہ آپ کی یتیمی اور خانہ بدوشی سے سلسلۂ کلام کی دعوت دے رہے ہیں؟

☆☆ ہندوستان کی تقسیم اور ریاست جموں وکشمیر پر قبائلی حملہ ہم لوگوں پر قہر بن کر نازل ہوا۔ میرا سارا خاندان فرقہ وارانہ فسادات میں شہید ہوا اور ہمیں بالآخر سری نگر، کشمیر کے رفیوجی کیمپ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ تقریباً سات سال خانہ بدوشی میں گذرے۔ میری ابتدائی تعلیم وہاں پر ہی ہوئی یعنی پرائمری سطح تک سری نگر کے سرکاری سکول میں پڑھا۔ فائدہ یہ ہوا کہ کشمیری زبان بولنا سیکھ لیا۔ اس بارے میں تفصیل میری خودنوشت کے پہلے باب میں درج ہے۔

☆ چوری کے پھل کھانے، پکڑے جانے پر مولا بخش سے تواضع اور دیگر معصوم شرارتوں کا ذکر ماحول کو خوشگوار بنانے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے؟

☆☆ آدمی کتنے ہی نامصائب حالات میں زندگی گزار رہا ہو مگر ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ اُسے صبر وشکر کی دولت سے بھی نوازتا ہے تاکہ دِل کے باغیچے میں شرارتوں کے پھول کھلتے رہیں اور اُن کی خوشبو عمر بھر رُوح کو تازگی بخشتی رہے۔ میں نے بھی اپنی بے خوفی، بے باکی اور خوش طبعی کی وجہ سے بچپن میں خوب شرارتیں کی ہیں جن کا تفصیلاً ذکر ''ماٹی کُدم کریندری یار'' میں کرچکا ہوں۔

☆ اُس معرکہ خیزی کی پردہ کشائی کیجیے جو پہلی کہانی ''گھر کی جنت'' کا پیش خیمہ بنی اور سرکاری اخبار ''دیہات سدھار'' میں شائع ہوئی؟

☆☆ پہلی اُردو کہانی ''گھر کی جنت'' میں ہیرو کی معرکہ آرائی بالآخر شکستِ توبہ کا پیش خیمہ بنی اور پھر من کا پنچھی عمر بھر گھر ہستی کے پنجرے میں قید ہوکر رہ گیا۔ یہ افسانہ ماہنامہ ''دیہات سدھار'' کے اکتوبر۔نومبر 1969 کے شمارے میں چھپا تھا، جس کی ادارت مشہور اُردو افسانہ نگار نور شاہ کرتے تھے جو آج بھی ماشاءاللہ پچاسی سال کی عمر میں تخلیقی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

☆ ساہتیہ سبھا کے کم عمر ترین صدر بننے کی روداد اور کارنامے دھرانا مکالمے کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی؟

☆☆ 1971ء میں پہلی پنجابی کہانی ''ٹھنڈی کانگڑی'' کا مشہور پنجابی جریدے ''ناگ منی'' میں چھپنا، اور پھر شاہ مکھی میں احمد سلیم کا ''گونج'' لاہور میں اُسی کہانی کو شائع کرنے سے پنجابی ادبی حلقوں میں میرا ذِکر ہونے لگا۔ امرتا پریتم جی نے میری تین اور کہانیاں ''ناگ منی'' میں شائع کیں۔ پھر دہلی اور پنجاب کے پنجابی جرائد مثلاً ''نیل منی''، ''ساہتکار''، ''لَو''، ''سیدھ'' وغیرہ اور لاہور سے چھپنے والے پنجابی جرائد ''پنج دریا''، ''سُورج مکھی''، ''لہراں'' اور ''وارث شاہ'' میں تواتر سے کہانیاں چھپنے کی وجہ سے میری شناسائی بن چکی تھی اور مجھے سنجیدگی سے لیا جانے لگا تھا جس سے مجھے سکونِ قلب مل رہا تھا۔ پھر میں نے پنجابی ساہت سبھا سری نگر کی صدارت کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور آخر کار سال 76-1975ء کے لئے سبھا کا صدر منتخب ہوا۔ صدر بنتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جولائی 1975ء میں دو روزہ کل ہند پنجابی ادبی کانفرنس منعقد کی۔ اِس کام میں میرے ساتھ میرا دوست اور مشہور افسانہ نگار ہربھجن سنگھ ساگر پیش پیش رہا۔ کانفرنس کی صدارت پنجاب کے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ نے فرمائی اور جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ بطور مہمانِ خصوصی شامل ہوئے۔ اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے حاسدوں اور نام نہاد پنجابی ادیبوں نے کمینے پن کی حدیں پار کرڈالیں لیکن کانفرنس انتہائی کامیاب رہی۔ اُس کانفرنس کی بدولت جموں یونیورسٹی کو بابا فرید چیئر ملی۔ اور ناچیز پنجابی ادبی حلقوں میں ایک جانا پہچانا نام بن گیا۔ 1983ء میں جب میری پوسٹنگ جموں وکشمیر سرکار کی طرف سے جالندھر میں بحیثیت عوامی رابطہ افسر ہوئی تو میرے پاس پنجابی کے نامور شاعر ناول نگار اور افسانہ نگار تشریف لاتے۔ جن میں کرتار سنگھ دُگل، سنت سنگھ سیکھوں، موہن سنگھ ماہر، پروفیسر سجان سنگھ، پروفیسر ڈی، این تیواڑی، ہربھجن سنگھ پروفیسر، جسونت سنگھ، سُرجیت پاتر، وریام سندھو اور بے شمار پنجابی اور اُردو ادب کے ستارے آتے۔ محفلیں سجتیں۔ افسانے پڑھے جاتے۔ شاعر اپنا کلام

سُناتے ''ہند سماچار''، ''پنجاب کیسری''، ''اجیت''، ''پرتاپ'' اور ''ملاپ'' کے معاوان مدیران محفلوں کی رونقیں بڑھاتے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھیں تو ایسا بھی وقت آیا کہ جموں وکشمیر کا پنجابی ادب اور ادیب میرے نام سے پہچانے جانے لگے۔

☆ اُن رستم پہلوانوں کی شناخت بتانا پسند فرمائیں گے جنہوں نے آغازِ سفر میں آپ کو اُستادی کے داؤ پیچ سکھلانے کی کوشش کی۔ By the way یہ اُستادی داؤ پیچ ہوتے کیا ہیں؟

☆☆ افسانہ نگاری کے فن کو سمجھنے، الفاظ کی تہذیب کو جاننے اور شبد شکتی سے واقف ہونے کے لئے دُنیائے ادب کے رُستم افسانہ نگاروں کو پڑھنا لازمی تھا۔ جن میں فرائڈ، جیمز لِن، سومرسیٹ مام، ''او ہنری''، ''شولوخوف''، ''الیکزنیڈر پُشکن''، ''کپُرن، چیخوف، لارنس، موپساں اور رسول حمزہ توف بہت اہم نام تھے۔ اِن کے علاوہ مقامی افسانہ نگاروں یعنی راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور خصوصاً سعادت حسن منٹو کو پڑھنا بھی ضروری تھا کیونکہ عصمت آپا کو چھوڑ کر باقی سب کی ماں بولی پنجابی تھی اور اُن کی تحریروں میں پنجابی الفاظ اور ماحول کا تڑکا خوب جچتا تھا۔ پھر احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، عبداللہ حسین، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور قرۃ العین حیدر کو پڑھا۔ یہی سب میرے اُستاد ہیں اور ادبی اکھاڑے میں داؤ پیچ سکھانے والے۔ ادب میں داؤ پیچ سے میری مراد، بہتر سے بہتر لکھنے کی ترغیب، زبان کا برتاؤ، بیانیہ میں جدّت پیدا کرنا اور محاوروں کے ذریعہ کرداروں کی ساکھ مضبوط بنانا ہے۔ یہی وہ داؤ پیچ ہیں جنکی وجہ سے ادیب اپنی الگ پہچان بناتا ہے۔

☆ آپ کی افسانہ نگاری کا خمیر سچ سے پھوٹنے کی بات پر کس حوالے سے زور دیا گیا ہے؟

☆☆ اپنے تخلیقی سفر سے متعلق میں نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ میری کہانیوں کا خمیر سماج کے آٹے سے گُندھا ہوتا ہے۔ تقسیم ہند، جموں وکشمیر کے سیاسی حالات، اقتصادی بدحالی، صنفِ نازک کے مسائل اور گلوبل سماج کی اُتھل پتھل میری کہانیوں کے موضوع ہوتے ہیں میں تخلیقی لمحوں میں پنجابی کے اس محاورے پر عمل کرتا ہوں کہ ''اندر ہووے سچ تے کوٹھے چڑھ کے نچ۔''

☆ آپ کے ہاں پلاٹ کے بجائے ترتیب کو اہمیت دینے کا سبب کیا ہے؟

☆☆ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل پلاٹ ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہتا ہے۔ پلاٹ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن الفاظ کو پلاٹ کی ضرورت کے مطابق اور قرینے سے استعمال کرنا، کہانی کے خدّ وخال کو فنکاری سے سجانا اور اپنی بات کو مختصر مگر بامعنی بنانے کے لئے محاوروں کا سہارا لینا، یہ سب باتیں کہانی کی آرائش وزیبائش کے لئے اہم ہیں اور قاری کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کرتی ہیں۔

☆ ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ کہانی کی جزئیات پر توجہ سرف کرنے کے بجائے کردار نگاری پر زیادہ توجہ دیتے ہیں؟

☆☆ ایسا سوچنا بعید القیاس ہے۔ کردار تو کہانی کے جزو لاینفک ہوتے ہیں، جن کو اُبھارے بغیر کہانی بے دم ہوتی ہے۔ کردار نگاری جتنی پائیدار ہوگی، کہانی اُتنی ہی دم دار ہوگی۔ میرا ماننا ہے کہ کہانی کی جزئیات پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

☆ آپ کے ہاں محاوروں کے استعمال کی بہتات بھی سنجیدہ قاری کو اکثر کھَلتی ہے؟

☆☆ ضرب المثل اور محاورے کسی بھی زبان کا شنگار ہوتے ہیں۔ جیسے صوفی شاعر شاہ حسین کی کافی کا یہ مصرعہ ''دُکھاں دی روٹی، سُولاں دا سالن، آہنیں دا بالن بال'' آج بھی پنجابی میں لوگ ضرب المثل کے طور پر بولتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی کہانیوں میں محاوروں کا استعمال کیا ہے۔ مگر بہتات سے نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق، وقوعہ کو بیان کرنے، جملے کو خوبصورت بنانے، اپنی بات کھُل کر کہنے اور فحاشی کے الزام سے بچنے کے لئے محاوروں کو کیپسول کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے تاکہ دوا کی تلخی کو کم کیا جاسکے۔ البتہ بلاضرورت، بے مقصد اور زبان دانی کی دھاک جمانے کیلئے محاوروں کا استعمال تخلیق کار کی کمزوری بن جاتا ہے اور یہ کمزوری قاری کو ضرور کھلتی ہے۔

☆ آپ جیسے بلند قامت اور بلند آہنگ تخلیق کار کی اکثر کہانیاں تہہ در تہہ ہونے کے بجائے ایک نکتہ یا سمت پر مرکوز ہونے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

☆☆ ایسا کئی بار پلاٹ یا موضوع کو دھیان میں رکھنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ میری نظر میں کہانی خود اپنی زبان، بیانیہ، ابتدائیہ اور اختتام غرض سارے لوازمات میں تخلیق کار کی معاونت کرتی ہے۔ اِس میں کوئی حکمت پوشیدہ نہیں ہوتی۔ میری کئی کہانیوں کا بیانیہ تہہ در تہہ ہیں اور سنجیدہ تخلیقی ریکرت سے یہ تہیں سلیقے سے کھلتی جاتی ہیں اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ جیسے ''گوری فصل کے سوداگر''، ''کھوکھلا سورج''، ''اشتہاروں والی حویلی''، ''ریشمن دھاگہ پریم کا''، ''ستی سر کا سورج'' وغیرہ۔ ''ستی سر کا سورج'' میں کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کے پس منظر میں وہاں کی منفی سیاست، نفرت اور محبت کی تہوں کو کھولنے کی سعی کی گئی ہے۔

☆ جو لوگ آپ کے بیان اور برتاؤ میں Polemics تکنیک کی کثرت کا ذکر کرتے ہیں ان کی تشفی اور تسلی کے لیے آپ کیا فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ کہانی کی ضرورت کے مطابق کرداروں کا اختلافِ رائے رکھنا یا مزاحمتی انداز سے مقالمے کو آگے بڑھانا "Polemics" تکنیک کا کثرت سے استعمال نہیں ہے بلکہ مزاحمتی کرداروں کے مکالمے مثبت پہلوؤں کی تہوں کو کھولتے ہیں۔ جیسے میری کہانی ''آدمی کے اندر چھُپا آدمی'' کے کردار ''ضمیر احمد'' کے مکالمے۔ وہ پوری کہانی میں ہندوؤں سے نفرت کرتا ہے۔ اُن کی راج نیتی، اقلیتوں کے ساتھ اُن کا سلوک اور مسلمانوں کو دہشت گرد اور غدار کہنا اُسے ناگوار لگتا ہے لیکن جب ملی ٹنیٹ اُس کے ہندو ڈرائیور تیج رام کو قتل کرنے لگتے ہیں تو وہی ضمیر احمد اُس کی جان بچانے کے لئے اپنی جان داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں خواجہ احمد عباس کی کہانی ''سردار جی'' کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جس کا انگریزی

ترجمہ خوشونت سنگھ نے "Deathof Burhan-Ud-Din" کے عنوان سے کیا تھا۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ کہانی میں بھی، ''ضرورت ایجاد کی ماں'' ہوتی ہے۔

☆ موپساں اور منٹو سے آپ کی ذہنی ہم آہنگی بتلانے والے کس امر کی نشان دہی کے شائق ہیں؟

☆☆ میری کچھ کہانیوں میں زبان کی بے باکی اور واقعہ یا واردات کے اظہار کے لئے محاوروں کا استعمال ہوا ہے۔ تا کہ قاری وقوعہ کو بھی سمجھ سکے اور محاورے کی برجستہ ادائیگی سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ کچھ محاورے نسوانی کرداروں کی گمراہی اور دِل خواہی کو بیان کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔شاید اسی وجہ سے کچھ دوستوں کا یہ خیال ہے کہ میری ذہنی ہم آہنگی موپساں اور منٹو سے ہے جو صحیح نہیں ہے البتہ یہ سچ ہے کہ موپساں اور منٹو میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں جن کا فنی زاویے سے مجھ پر کچھ اثر ہو سکتا ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے ہاں معروف مغربی ادیب اور دانشور ٹام کلینی سے مماثلت یا مطابقت کی بات کرتے بھی سنائی دیتے ہیں؟

☆☆ سچ یہ ہے کہ میں نے ٹام کلینی کو پڑھا ہی نہیں ہے۔آپ اسے میری کم علمی اور نالائقی کہہ سکتے ہیں۔

☆ جیمز بِلن کے بقول کہانی ایک کردار، ایک واقعہ یا ایک جذبے کو پیش کرنے کا نام ہے۔آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق رکھتے ہیں اور آپ کا تخلیقی عمل کس رویہ کا غماز ہے؟

☆☆ کہانی سے متعلق جیمز بِلن کے خیالات کی میں تائید کرتا ہوں کہ افسانہ ایک واقعہ یا کسی اہم کردار یا پھر کسی جذبے کے اظہار کا نام ہے۔ بعد ازاں افسانے کی ہیئت میں کئی بدلاؤ آئے۔ نئے نئے تجربے کئے جانے لگے۔ جدید افسانہ، مابعد جدید افسانہ، علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ اور نہ جانے کیا کیا۔ بلراج منیرا سُر یندر پرکاش، رشید امجد اور اقبال مجید جیسے افسانہ نگاروں نے تو کافی دیر تک ادیبوں کو اُلجھائے رکھا لیکن آخرش افسانہ وہی مانا گیا، جس میں پلاٹ ہو، جو قاری کو سمجھ آئے اور اُسے سوچنے پر مجبور کرے۔ میرا تخلیقی عمل اسی رویے کی عبارت آرائی کرتا ہے۔

☆ جس طرح فرائڈ کے ہاں جنسیات اور نفسیات کی بہتات ہے عین مین آپ کے ہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پائی جاتی ہے؟

☆☆ نسوانی معاملات والی کہانیوں تک یہ بات درست ہے۔ باقی فرائڈ کے جنسی نظریات سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ عصمت چغتائی اور منٹو شاید فرائڈ کے قریب تر نظر آتے ہوں لیکن میں نہیں۔

☆ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں جو آپ کے ہاں کارل مارکس کی اقتصادی اپروچ اور اُس کے پرچار کی بات کرتے ہیں؟

☆☆ کارل مارکس جیسے دانشور نے روائتی سوچ والے ادیبوں اور شاعروں کے ذہن و دل میں سیندھ لگائی اور اپنی بات اُن تک پہچانے میں کامیاب رہا۔ ساحر کو تاج محل میں غریبوں کا لہو نظر آنے لگا۔ اسرار الحق مجاز تاج کے دمکتے پتھروں کو توڑنے اور معشوق کی آنچل کو پرچم بنانے کی بات کرنے لگا۔ شوکت صدیقی، عبداللہ حسین اور قرۃ العین حیدر نے شاہکار ناول لکھے۔ یعنی ترقی پسندی کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ زندگی کی حقیقتوں کا سچ افسانوں میں ہونے لگا۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال کو بھی اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کارل مارکس کے فلسفے سے ڈر لگنے لگا اور وہ بھی کہنے لگا کہ ''جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی۔۔۔اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو''۔ میں نے بھی اپنے اڑوس پڑوس کے کئی مفلس و نادار کرداروں کو کہانیوں کا روپ دیا ہے۔ جس میں مارکس کی اقتصادی اپروچ کی بات کی گئی ہے۔

☆ خاکہ نویسی بھی آپ کی وجہِ شہرت گردانی جاتی ہے۔ کچھ احوال اس شغف اور للک کا بیان کیجیے؟

☆☆ کچھ دوستوں کے خاکے میں نے ضرور لکھے ہیں لیکن اُن کی ادبی اہمیت بالکل نہیں ہے۔ یہ خاکے محفلِ یاراں تک ہی محدود رہے ہیں۔

☆ ترجمہ کی جانب آپ کا رجحان کب اور کیونکر ہوا۔اب تک کتنے ملکی اور غیر ملکی اہلِ قلم کی تخلیقات کے تراجم کر چکے ہیں اور آئندہ کی بابت کیا ارادے ہیں؟

☆☆ ترجمہ کا فن بھی تخلیق کے دائرے میں آتا ہے۔ سرکاری نوکری کے دوران میں نے کئی گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کے ایڈریس اور تقاریر کا اردو ترجمہ کیا ہے محکمہ منصوبہ بندی کے منصوبوں کا ترجمہ بھی کیا ہے لیکن ادبی طور پر صرف دو انگریزی کتابوں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک دو ہزار سال پُرانا تامل زبان کا ناولٹ ہے جسے میں نے انگریزی سے ترجمہ کیا اور نام رکھا، گواچی جھانجر دی چیک''۔ دوسرا انگریزی ناول دانش رانا کا ''ریڈ میز'' (Red Maiz) ہے جسے لال مکی کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔اس کے بعد اللہ اللہ، خیر سلّا۔

☆ پنجابی ادب کی کائنات کو روشن و منور کرنے کی تمنا کب اور کس طور بے کلی میں تبدل ہوئی اور اسکا نتیجہ کیا رہا؟

جواب: ''ناگ منی'' جریدے میں چھپنا اُن دِنوں بہت بڑی بات تھی۔ ''ناگ منی'' میں چھپنے کے بعد مجھے پنجابی میں مزید لکھنے کی تحریک ملی اور اپنا ادبی مستقبل روشن نظر آنے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ میری پہچان اُن ممالک میں بھی بنی جہاں پنجابی رہتے ہیں اور پنجابی ادب پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس کے علاوہ اُردو میں شاعر، شب خون، سب رس، الفاظ، شمع، روبی، آجکل، اوراق، ادب لطیف اور گفتگو وغیرہ جیسے مؤقر جرائد میں چھپنے سے بھی ''دل کی بے قراری کو قرار آیا''۔

☆ آپ کی خود نوشت ''ماٹی کدم کریندی یار'' کو گبرائیل گارشیا مارکیز کے ناول One Hundered Years of Solitude اور قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کے دریا'' سے قریب تر کس حوالے سے گردانا جاتا ہے بہت سے احباب تو اسے میرا من کی ''باغ و بہار'' کے ہم پلہ بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ نوبل انعام یافتہ اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ناول اور افسانہ

نگار گبرائیل گارشیا مارکیز کے پاؤں کی، میں دھول بھی نہیں ہوں۔ اُن کے ناول"One huadred year of solitude" کے ساتھ میری خود نوشت کی مماثلت کسی طور پر بھی نہیں بنتی۔ اُن کا ناول حقیقت اور متھ سے مزیں ہے جبکہ میری آپ بیتی آنکھوں دیکھی حقیقت ہے اور اس میں متھ یا خیالی، کچھ بھی نہیں ہے۔ ''آگ کا دریا'' اور ''اُداس نسلیں'' جیسے ناول برصغیر کے المیے کی دستاویز ہیں۔ میری خودنوشت ''مائی کدم کریندی یار'' (میں زندہ آدمی ہوں، کے نام سے اس کا اردو ترجمہ 2020 میں چھپ چکا ہے)۔'' جموں وکشمیر کے سیاسی اور معاشرتی حالات، پاکستانی کشمیر اور مغربی پنجاب کے سفرنامے، ریاست کے انتظامیہ امور میں میری ساجھے داری اور تخلیقی عمل تک محدود ہے۔ البتہ میری خود نوشت کا بیانیہ اور اسلوب میرا من دہلوی کی باغ وبہار کے قریب ہوسکتا ہے لیکن ہم پلّہ ہونے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

☆ آپ کو عالمی پنجابی ادب کا نمائندہ ادیب کن خدمات اور خوبیوں کے بل پر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ پنجابی ادب اور کلچر سے جنون کی حد تک پیار۔ آدھی صدی سے زیادہ عرصہ تک عالمی پنجابی ادبی سرمائے میں اپنا حصہ ڈالنا۔ ملکی اور بیرون ملک پنجابی جرائد میں لگاتار چھپنا، تیس سال کی عمر میں غیر پنجابی زمین یعنی سری نگر میں کل ہند پنجابی کانفرنس کرانا، سیمینار اور مشاعرے اور سنگیت کے پروگرام کروانا اور پنجابی زبان وادب کے لئے ہمیشہ ہراوّل دستے میں شامل رہنا۔۔۔ یہ کچھ ایسی خدمت گاری تھی، جس نے مجھے عزت بخشی۔ 2012ء میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر مجھے خلعتِ فاخرہ سے نوازا۔ 2014ء میں پنجاب سرکار نے ''شرومنی پنجابی ساہتکار'' کے خطاب اور پانچ لاکھ روپے کی رقم انعام کے طور پر دی۔ 2021ء میں قومی ساہتہ اکادمی نئی دہلی (National Academi of Letters of India) نے میرے پنجابی افسانوی مجموعے ''سُولاں دا سالن'' کو بہترین کتاب کا ایوارڈ دیا۔ اس کے علاوہ میری کتابیں اور افسانے جموں، پنجاب، ہریانہ اور دہلی کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب کا حصہ ہیں۔ کئی اسکالروں نے پی، ایچ، ڈی اور ایم فِل کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ ساری عزت اور محبت میرے مولا کا کرم ہے۔

☆ جو لوگ آپ کو مجسم عشق گردانتے ہیں، نوعیت عشق کی بابت مہر بلب کیوں ہیں؟

☆☆ مجھے تو عشق کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ 19 سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ پھر گھر ہستی کی چکی میں ایسا پستہ چلا گیا کہ ''موہے سُدھ بُدھ نہ رہی تن من کی''، لیکن جب مولا سائیں نے سخن فہمی بخشی تو کتابیں عشرت کدہ بن گئیں۔ دانشور، شاعر، ادیب اور سخن شناس (خواتین وحضرات) معشوق بن گئے۔ اس سلسلہ میں تفصیل میری خودنوشت میں موجود ہے باقی 'مہر بلب' والی کوئی بات نہیں۔

☆ عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے گرد جس قسم کی چادر آپ لپیٹتے ہیں اس کا وجود آج کے دور میں تو کم از کم ناپید ہے؟

☆☆ دراصل یہ سب صوفیائے کرام اور اُن کے کلام کا اثر ہے کہ کچھ کہانیوں میں میرے کردار عشقِ مجازی پر عشقِ حقیقی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ جیسے، عشق ملنگی، میں کالے خان اور زہر عشق میں شاداں بلی، یوسف اور غفورا پہلوان۔ اِن سب کرداروں کا سفر عشقِ مجازی سے شروع ہوکر عشقِ حقیقی پر ختم ہوتا ہے۔ اِس سلسلہ میں بابا بُلھے شاہ، سلطان باہو، میاں محمد بخش اور شاہ حسین میرے پیر ومُرشد ہیں۔ باقی آپ کا فرمانا بجا ہے کہ آج کے دور میں یہ سب ناپید ہے۔

☆ چٹانوں سے ٹکرانے اور انہیں چور چور کرنے سے مراد کیا ہے نیز آپ کے اس عمل سے ذاتی اور فنی زندگی میں کس قسم کے مثبت ومنفی اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ جناب والا! زندگی میں صرف ایک ہی چٹان سے ٹکرایا ہوں اور اُسے چُور چُور کرنے میں پوری طرح ناکام رہا ہوں اور میرا یہ عمل ہمیشہ ذاتی رہا ہے۔ البتہ سیاسی چٹانوں کو توڑنے میں قلمی کا سہار ضرور لیا ہے۔ باقی فنی زندگی میں حسد اور محبت کے مثبت اور منفی اثرات ہر ادیب اور فنکار پر پڑتے ہیں۔ یہ فطری عمل ہے۔

☆ ایک تخلیق کار بالخصوص ادیب شاعر کی ادبی زندگی اور ذاتی زندگی میں تال میل نہ ہونے کے آپ کے خیال میں کیا اسباب ہوا کرتے ہیں اور اس سے ہر دو باب میں کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں؟

جواب: سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ندا فاضلی کے اس شعر پر عمل نہیں کرتے۔

دشمنی لاکھ سہی، ختم نہ کیجئے رشتہ
دِل ملے نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے

وہ جیسے ہیں۔ ویسے ہی رہتے ہیں اور لچک نامی لفظ اُن کی لغت میں نہیں ہوتا۔ اسی لئے ذاتی اور ادبی زندگی میں تال میل کا فقدان رہتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی ادبی آوارہ گردی، ذاتی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ اِس سلسلے میں چند معتبر نام ہیں، ''مرزا اسد اللہ خان غالب، سعادت حسن منٹو، جان ایلیا، مجاز لکھنوی، شیو کمار بٹالوی اور امرتا پریتم، یہ سب دوہری زندگی جیتے رہے۔ ذاتی زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانے کی بجائے فراریت اختیار کی اور مئے نوشی میں ڈوبے رہے۔ ذاتی زندگی میں اس رویے کے دُور رس نتائج نکلتے ہیں۔ ایسے کئی ادیب اور شاعر دوستوں کی حالتِ زار کو میں نے خود دیکھا ہے لیکن ایسے بھی بے شمار ادیب ور دانشور ہیں جو ذاتی اور ادبی زندگی میں تال میل رکھ کر کامیاب جیون گذارتے ہیں۔

☆ آپ کی تحریر کردہ کہانی پر فلم بھی بن چکی ہے اور سلور جوبلی بھی منا چکی ہے۔ قارئین چہارسو کو اس دلچسپ داستان میں شریک کیجیے؟

☆☆ میری پنجابی کہانی ''لکیر'' پر اسی نام سے برصغیر کی پہلی پوٹھواری (پنجابی کی دوسری بڑی ڈائلیکٹ) فلم بنی ہے جس کا منظر نامہ میر پور نواسی اور لندن میں مقیم علی عدالت نے لکھا اور جموں نواسی شیودت نے فلم کو ڈائریکٹ کیا۔ جموں وکشمیر میں مقامی طور پر بنی یہ پہلی فلم ہے جس نے خوب بزنس کیا اور سلور جوبلی

منائی۔ بعد ازاں یہ فلم اُن تمام علاقوں میں دِکھائی گئی جہاں پوٹھواری یا پہاڑی بولنے والے لوگ رہتے ہیں یعنی تحصیل کرناہ، تحصیل اوڑی، ضلع پونچھ اور ضلع راجوری میں۔اس کے علاوہ یہ فلم میر پور میں ایک کیبل نٹ ورک کے ذریعے بھی دکھائی گئی۔شیودت مرحوم سری نگر دُوردرشن کے لیے ٹیلی فلمیں بناتا تھا۔ایک بار مجھے کہنے لگا کہ وہ ایک مکمل فلم بنانا چاہتا ہے اور مجھ سے کہانی لکھوانا چاہتا ہے میں نے اُسے اپنی کچھ کہانیوں کا خاکہ سنایا تو اُس نے ''لکیر'' کہانی کو پسند کیا۔علی عدالت نے اُسے کہا کہ وہ سرمایہ لگانے کو تیار ہے بشرطیکہ فلم پوٹھواری میں بنائی جائے۔اُس کی بات مانی گئی اور یوں ایک اچھی فلم بنی۔1947ء میں جولوگ میر پور، کوٹلی، راولاکوٹ، باغ، بھمبر یعنی پاکستانی انتظام والے جموں وکشمیر سے ہجرت کر کے جموں، بارہ مولہ اور دیگر اضلاع میں آباد ہوئے تھے، اُنہوں نے اِس فلم کو بار بار دیکھا کیونکہ کہانی اُن کو اپنی آپ بیتی لگتی تھی۔

☆ اُس کہانی کی بابت بھی کچھ بتلایئے جو ہندوستان بھر میں اسٹیج کی گئی اور پسند بھی بہت ہوئی۔

☆☆ ''سری رام سنٹر'' نئی دہلی کا سابقہ ڈائریکٹر، سنگیت ناٹک اکادمی نئی دہلی کا انعام یافتہ اور تھیٹر کی دُنیا کا ایک بڑا نام مشتاق کاک میرے عزیزوں میں سے ہے۔وہ جموں کا ہی رہنے والا ہے۔ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ میری دو کہانیاں کو جوڑ کر ایک ڈرامہ سٹیج کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے اجازت دے دی اور یوں اُس نے پریتم کٹوچ نامی ڈرامہ نگار سے اسے ہندی میں لکھوایا اور ڈرامے کا نام میری کہانی کے عنوان ''عشق ملنگی'' کو ہی رکھا۔اس ڈرامہ میں دوسری کہانی ''شاداں بلی جموں والی'' ہے۔ڈرامہ راوی کے ذریعہ دونوں کہانیوں کی کڑیاں جوڑتا ہے۔جموں کے اُردو بازار کی فیروزہ اور محلّہ جیون شاہ کی شاداں اِس ڈرامے کے دو اہم کردار ہیں۔جس میں فیروزہ پتھر کی طرح سخت ہے جبکہ شاداں عشق مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف گامزن ہے۔کالے خان یوسف اور غفورا پہلوان عشقِ حقیقی کی علامت ہیں۔ یہ ڈرامہ ملک کے کئی تھیٹر فیسٹیول میں کھیلا گیا۔نیشنل سکول آف ڈرامہ نئی دہلی، کلکتہ، حیدر آباد، بنگلور، میسور، بھوپال، میرٹھ، چندی گڈھ اور امرتسر وغیرہ شہروں میں یہ اسٹیج کیا گیا۔اخبارت میں اس ڈرامے سے متعلق مثبت تبصرے لکھے گئے۔ ناقدوں نے اِسے خوب سراہا۔ یہ دونوں کہانیاں میری کتاب ''سولاں دا سالن'' میں شامل ہیں جسے 2021 کا ساہتہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے۔

☆ آپ کے افسانے ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' پر اس قدر واویلا کیوں مچا کہ نہ صرف مقدمہ بازی کی نوبت آ پہنچی بلکہ بھابھی صاحبہ کے تمام زیورات بھی ہڑپ کر گئی؟

☆☆ اُردو میں لکھا گیا شاید یہ میرا تیسرا افسانہ ہے۔اُن دِنوں میں سرکاری میگزین ''دیہات سدھار'' کا معاون مدیر تھا۔نور شاہ صاحب نے سیکریٹریٹ میں ہونے والے ایک واقع کا ذکر کیا اور مجھے کہانی لکھنے کو کہا۔میں نیا نیا اس میدانِ کارزار میں اُترا تھا، فوراً تیار ہو گیا اور ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے افسانہ لکھ ڈالا۔ بیوقوفی یہ کی کہ کرداروں کے نام اور وقوعہ کی جگہ سب اصلی رکھا۔نور شاہ صاحب نے ہی افسانے کو ایک مقامی اخبار میں چھپوایا اور اخبار کی کچھ کاپیاں سیکرٹریٹ میں بانٹ ڈیں۔ مجھے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری صاحب نے طلب کیا اور پوچھا کہ کیا تم نے یہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے بڑے فخر سے ہاں میں جواب دیا۔ شام کو میری معطلی کا حکم نامہ میرے گھر پہنچ گیا۔دوسرے دن چارج شیٹ بھی آ گئی اور مجھ پر الزام تھا کہ میں نے ایک مضمون لکھا ہے۔جس میں سیکرٹریٹ کی چند خواتین ملازمین کو بدنام کیا گیا ہے نیز مضمون لکھنے کے لئے اجازت بھی نہیں لی گئی ہے۔ چارج شیٹ کے جواب میں میرا کہنا تھا کہ یہ مضمون نہیں بلکہ افسانہ ہے اور افسانہ لکھنے کے لئے سرکاری اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ سیشن جج کی سربراہی میں ایک انکوائری کمیشن بنایا گیا تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ میں نے مضمون لکھا ہے یا افسانہ۔بس پھر نو مہینے تک انکوائری کمیشن میں مقدمہ چلتا رہا۔یہ 1970ء کی بات ہے۔اُنہی دِنوں خواجہ احمد عباس اور بلراج ساہنی شوٹنگ کے لئے سرینگر آئے ہوئے تھے۔میں اُن سے ملا اور ساری روداد بیان کی۔انہوں نے افسانہ پڑھا اور اپنی رائے لکھ کر دی کہ میری تحریر ایک افسانہ ہے اور اِس میں کچھ بھی فحاش نہیں ہے۔اسی طرح چند مقامی ادیبوں، اختر محی الدین، علی محمد لون، یوسف ٹینگ، اور بنسی پارمو نے بھی تحریری رائے میں میری تحریر کو افسانے کے زمرے میں رکھا۔نو مہینے کے بعد انکوائری کمیشن نے میرے حق میں رپورٹ سرکار کو پیش کی اور یوں میری نوکری بحال ہوئی۔لیکن اِس سارے معاملے میں نسیم فردوس کے زیور بک گئے۔ایسی بیوقوفی میں نے دوسری بار بھی کی اور اصل ناموں سے ایک اور افسانہ ''بیڈے کی لنکا'' لکھا لیکن کچھ بزرگوں کی مداخلت سے معاملہ عدالت تک نہیں گیا اور یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھی۔

☆ جوئیر کلرک سے ڈپٹی کمشنر اور میجر ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کے سفر کی روداد بجائے خود طوالت کی متقاضی ہے مگر آپ کی خلاق مزاجی، اختصار میں ایجاز پیدا کر سکتی ہے؟

☆☆ کلرک سے کلکٹر تک کا سفر کسی داستان سے کم نہیں ہے۔اس میں شاید غیبی مدد بھی شامل تھی۔ ہوا یوں کہ نوکری پر بحالی کے بعد ایک دن مجھے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے سکرٹری شیخ غلام رسول صاحب نے بلایا اور کہا۔

''تم اچھا لکھتے ہو لیکن تمہارا دماغ تخریب کی طرف مائل ہے۔اپنی تحریر کو تعمیری بناؤ۔'' اُنہوں نے مجھے ڈپٹی چیف منسٹر مرزا محمد افضل بیگ کا پی، اے لگا دیا۔شیخ غلام رسول صاحب نے ہی مجھے ''دیہات سُدھار'' کا مدیر بنایا اور یوں میں گزٹیڈ کیڈر میں آ گیا اور پھر ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔سیڑھی در سیڑھی چڑھتا گیا اور بالآخر سیکرٹری خوراک کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ بعد ازاں پانچ سال کے لئے ''اسٹیٹ کنزومر کمیشن'' کا ممبر بنا۔یوں یہ سفر 2008ء کو مکمل ہوا۔ طبیعت کی یکسوئی، خوش مزاجی اور ایک ادیب ہونے کی وجہ سے مجھے ہمیشہ عزت و احترام ملا۔

☆ کچھ روشنی اُس واقعہ پر ڈالیے جب آپ کی مسکینی دور کرنے کے

لیے تنویر جہاں نے آپ کی ترقی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا ڈالی؟

☆☆ مسکینی دُور کرنے کا واقعہ ہنسی مذاق سے شروع ہوا۔ تنویر جہاں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی پڑھی اور کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان پاس کر کے میرے ہی محکمہ میں انڈر سیکرٹری لگی تھی۔ وہ امیر باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور ہر روز کچھ نہ کچھ گھر سے بنوا کر لاتی تھی اور ہم بھوکے ننگوں کو کھلاتی تھی۔ کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ نور شاہ جو ترقی پا کر ڈپٹی ڈائریکٹر پنچایت اور سوامی راج بھگت بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن تنویر جہاں نے مجھ سے چائے منگوانے کے لئے کہا۔ جب میں نے پیسے نہ ہونے کا ذکر کیا تو اُس نے نور شاہ سے کہا کہ خالد حسین کی مسکینی دُور کرنے کے لئے اسے بلاک ڈیولپمنٹ افسر بنا دو۔ کافی بحث ومباحثے کے بعد نور شاہ نے میری فائل منگوائی اور تنویر جہاں سے کہا کہ وہ خود نوٹ لکھے۔ تنویر جہاں نے میرے حق میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے اور لکھا کہ سرکار خالد حسین کو سکرٹریٹ میں ضائع کر رہی ہے اور اس کی ضرورت فیلڈ میں ہے۔ نوٹ پر تنویر جہاں نے نور شاہ سے دستخط کروائے اور خود مسل لے کر کمشنر اور منسٹر صاحب کے پاس گئی اور اُن کی منظوری کے بعد مجھے بلاک ڈیولپمنٹ افسر ارناس تعینات کیا گیا ور پھر سروس کیریر کے آخری مہینوں میں ہی واپس سیکرٹریٹ جانے کا موقعہ ملا تا کہ وہاں سے ریٹائر ہو سکوں۔ ''کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا۔''

☆ کچھ احوال آپ کی گھڑ سواری اور عبدالرشید تیلی صاحب پر گزرنے والے سانحہ کی بیان فرمایئے؟

☆☆ گھڑ سواری اور تیراکی میرا شوق رہا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں اکثر جھیل ڈل کے ایک حصے کو تیر کر پار کرتا تھا۔ اسی طرح گلمرگ، پہلگام، اور یوس مرگ کے مرغزاروں میں گھوڑے دوڑانا میرا شوق تھا اور جب ضلع افسر بنا تو پہاڑی علاقوں کے دورہ پر جانے کے لئے ہمیشہ گھوڑے کا سہارا لیا کرتا تھا۔ اُسی زمانے میں ایک دلخراش حادثہ ہوا۔ ضلع افسران کی ایک ٹیم دور دراز پہاڑی بلاک پاڈر میں لوگوں کے مسائل سننے اور موقع پر اُن کا حل نکالنے کے لئے گئی تھی۔ یہ 1986ء کی بات ہے کہ پاڈر سے واپسی کے سفر میں میرے ساتھ جموں وکشمیر بنک کا ضلع افسر عبدالرشید تیلی بھی تھا۔ میرے لئے ماتحت عملے نے گھوڑے کا انتظام کیا تھا لیکن عبدالرشید تیلی بضد تھا کہ وہ بھی گھوڑے کی سواری کرے گا۔ میں نے سمجھایا کہ وہ پیدل ہی سفر کرے کیونکہ وہ گھڑ سوار نہیں ہے اور اس خطرناک سفر میں اللہ نہ کرے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بالآخر اُس کے لئے بھی گھوڑا لایا گیا ابھی ہم نے تقریباً دس کلومیٹر کا سفر ہی طے کیا تھا کہ اچانک ایک پہاڑی کا کھڑ درا کونا دیکھ کر وہ ڈر گیا کہ کہیں اُس کا ماتھا پہاڑی کے کونے سے نہ ٹکرا جائے۔ یہ اُس کا اناڑی پن تھا کیونکہ گھوڑا ایک ہوشیار جانور ہے اور وہ اپنے سوار کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ عبدالرشید نے اپنے ہاتھ سے ماتھے کو بچانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گھوڑا اپنا توازن کھو بیٹھا اور سوار سمیت پگڈنڈی سے نیچے لڑھک گیا۔ میں نے اور میرے اسسٹنٹ پروجیکٹ افسر ڈاکٹر ریاض نے گھوڑوں سے اُتر کر چھلانگیں لگا دیں اور کچھ ہی پلوں میں دریائے چناب کے کنارے پہنچ گئے جہاں عبدالرشید زخمی حالت میں پڑا تھا اور گھوڑا مر چکا تھا۔ عبدالرشید نے پینے کے لئے پانی مانگا جسے میں ایک مردہ کھوپڑی میں بھر کر لایا اور عبدالرشید کو پانی پلایا۔ اُس کے بازو اور کمر کی ہڈیاں چور چور ہو چکی تھیں۔ ہم نے مرے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ سے کمبل نکالا اور اُس میں ڈال کر رشید کو اوپر پگڈنڈی تک لے آئے 700 فٹ کی چڑھائی ہم کس طرح چڑھے، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اُس نے پھر پانی مانگا۔ میں نے ڈاکٹر ریاض کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ اتنے میں عبدالرشید نے پیشاب کرنے کے لئے کہا۔ میں نے پیشاب کرایا۔ ڈِپ بند کی لیکن اُس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا اور چند منٹوں میں اُس نے آخری سانس لی۔ رات کے دو بجے ہم اُس کی میت کو لیکر پاڈر بلاک کے صدر مقام اٹھولی پہنچے۔ پورا گاؤں رو رہا تھا۔ صبح تڑکے میں نے ضلع ڈوڈہ کے ڈپٹی کمشنر اقبال کھانڈے مرحوم کو وائرلیس پیغام کے ذریعہ صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہیلی کاپٹر بھیجنے کی استدعا کی۔ دن کے اڑھائی بجے فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ عبدالرشید تیلی کے جسد خاکی کو لیکر سری نگر پہنچا اور اُس کے جنازے میں شامل ہو کر شام کو واپس ڈوڈہ آ گیا۔

☆ دوستوں کی محفلوں کی جند جان نصیر احمد میر، تاج محی الدین، شجاع احمد، محمد یاسین اور رام لعل کہاں اور کس حال میں ہیں اور کب کب یکجائی کا موقع ملتا ہے؟

☆☆ تاج محی الدین کے علاوہ باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ وہ یاریاں، دلداریاں، وہ لطیفے، شگوفے، حکایتیں، مناجاتیں سب تمام ہو چکی ہیں۔ اب کبھی کبھار جب ادبی محفلوں میں شرکت ہوتی ہے تو لکھاری دوستوں سے گپ شپ ہو جاتی ہے۔

☆ ادبی دھرم شالہ آج کل کس حال میں ہے اور دوستوں کی کہکشاں اور مہمانوں کا جھرمٹ کس طرح سجتا ہے۔؟

☆☆ ادبی دھرم شالہ اب اکثر بے چراغ رہتی ہے۔ من پسند دوستوں کی رونقیں ختم ہو چکی ہیں۔ جالندھر میں پوسٹنگ کے زمانے میں افسانہ نگاروں کا جھرمٹ ہر ہفتہ کسی ایک کے گھر رات گذارتا تھا اور کھانا کھانے کے بعد محفل افسانہ شروع ہوتی تھی اور دیر رات گئے تک کہانیاں پڑھی جاتی تھیں اور اُن پر بحث کی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ''دیوا بلے ساری رات'' کے عنوان سے بہت دیر تک چلتا رہا۔ جموں واپس آنے کے بعد ویسا ادبی ماحول دوبارہ نصیب نہیں ہوا۔ کہکشاں بکھر چکی ہے۔ نئی نسل میں تو اب جگنو بھی ٹمٹماتے نظر نہیں آتے یا پھر ہم اُن کے فوکس میں نہیں رہے۔

☆ اُس محفل کی روداد بیان کیجیے جس میں آپ نے ایک ہی رات میں ایک دو نہیں، انتیس کہانیاں سنا ڈالی تھیں؟

☆☆ مالیر کوٹلہ پنجاب کے اردو اور پنجابی شاعر مرحوم خالد کفایت سے میری واقفیت امرتسر سے چھپنے والے ماہوار پنجابی جریدے ''ساہتکار'' کی وجہ سے ہوئی۔ جس میں خالد کفایت کی پنجابی غزل چھپی تھی۔ ''پرکھ پڑچول'' کے عنوان سے ساہتکار میں میرا کالم چھپتا تھا۔ اُسی کالم میں، میں نے لکھا تھا کہ یہ

خالد کفایت کیا چیز ہے کم بخت نے بہت پیاری غزل کہی ہے۔ دوسرے مہینے کے ''ساہتکار'' میں اُس کا خط چھپا تھا جس میں کفایت صاحب نے لکھا تھا کہ وہ کوئی چیز نہیں بلکہ ''ناچیز'' ہے۔ بس یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا اور پھر خالد کفایت کی زندگی تک قائم رہا بلکہ آج بھی اُس کی فیملی کے ساتھ ہمارے گھریلو تعلقات قائم ہیں۔ خالد کفایت اکثر مجھے مالیر کوٹلہ آنے کی دعوت دیتا وہاں محفل سجائی جاتی، ادب نواز دوست، احباب اکٹھا بیٹھتے اور پھر مجھے کہانیاں سنانے کے لئے کہا جاتا۔ یہ محفلیں رات کا کھانا کھا کر اور عشا کی نماز پڑھنے کے بعد شروع ہوتیں اور دیر رات تک جاری رہتیں۔ افسانہ نگار صرف خالد حسین ہوتا اور باقی سننے والے۔ ویسی ہی ایک محفل تھی جہاں میں نے پندرہ افسانچے اور پانچ کہانیاں پڑھی تھیں اور دوستوں نے سنی تھیں۔ اُن کے حوصلے کی داد دینی تو بنتی ہے۔

☆ آپ کی شخصیت میں فنونِ لطیفہ کے ساتھ صحافت اور نشر و اشاعت کے اداروں سے وابستگی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ آپ ہمیں سندیش، عبارت، وقت، پولیٹیکل ٹائم، روشنی اور زمیندار وغیرہ کی ادارت اور دیگر تجربات کے حوالے سے اپنے تاثرات بتلایئے؟

☆☆ صحافت میں آنا میری مجبوری تھی۔ گھرہستی کی گاڑی سرکاری تنخواہ کے سہارے چلتی نہیں تھی۔ میں نے صحافت میں بھی ڈپلومہ کیا تھا اردو اور پنجابی میں افسانے بھی چھپ رہے تھے۔ اسی بنا پر سب سے پہلے مجھے جموں کے مشہور روز نامہ ''سندیش' میں کام مل گیا اور میں بطور معاون مدیر خبریں لکھتا، اُن پر سُرخیاں جماتا، اداریئے لکھتا۔ اخبار کا مالک نذیر حسین سمنانی مجھے دس روپئے محنتانہ روزانہ کی بنیاد پر دیتا۔ سرکاری دفاتر میں کام دس بجے سے چار بجے تک ہوتا۔ دفتر سے نکلنے کے بعد میں سیدھا اخبار کے دفتر پہنچ جاتا اور اخبار کے لئے لکھنا شروع کر دیتا۔ اُن دِنوں پیلے رنگ کے کاغذ جسے ''مِستر'' کہتے تھے، پر کاتب خصوصی سیاسی سے لکھتے تھے اور مجھے پروف بھی خود پڑھنے پڑتے تھے۔ چھ سات بجے کے قریب انڈین ایڈمنسٹریو سروس (IAS) کے چند نئے افسران اُردو سیکھنے اور کچھ دوست وقت گذاری کے لئے آجاتے۔ کام بھی ہوتا رہتا، گپ بازی بھی ہوتی رہتی اور باقر خانیوں اور کچوریوں کے ساتھ چائے نوشی بھی ہوتی رہتی۔ اِس عیاشی کے لئے میں پانچ روپئے اپنے پاس رکھتا تھا جبکہ باقی کے پانچ روپئے اپنی کرماں والی کو دے دیتا تھا تاکہ وہ گھریلو اخراجات احسن طریقے سے چلائے۔ 1970ء میں تنخواہ دوسو روپئے ماہوار تھی جبکہ اخبارات ایڈٹ کرنے سے تین سو روپئے ماہوار ملتے تھے۔ بے فکری کا زمانہ تھا۔ ''سندیش'' کے علاوہ ''روزنامہ ''وقت' اور سرینگر میں روزنامہ ''پولٹیکل ٹائمز''، ''زمیندار''، ''روشنی'' میں کام کرتا رہا۔ دس گیارہ سال لگاتار اخبارات کے لئے لکھا۔ یہ سلسلہ تب ٹوٹا، جب مجھے بلاک افسر بنا کر فیلڈ میں بھیجا گیا۔

☆ آپ کی شخصیت مجموعۂ اضداد کی حامل گردانی جاتی ہے۔ بہ یک وقت آپ ترقی پسند بھی ہیں اور اسلام پسند بھی۔ شاید یہ ہی سبب ہے کہ آپ کے دوستوں کی نسبت مخالفین کی تعداد زیادہ ہے؟

☆☆ میری ذات یا شخصیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام دراصل ترقی پسند مذہب ہے۔ ہمارے نبیؐ نے فرسودہ روایات کو چھوڑنے، علم حاصل کرنے، عورتوں سے اچھا سلوک کرنے اور مخالفین کو اپنے عمل سے قائل کرنے کی بات کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اُس کی مزدوری ادا کرو۔ اُن کا آخری خطبہ انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ قرآن کریم ہمارے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے اور برے فعل سے آگاہ کرتا ہے اور ہمیں نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ''اے بندے، اس زمین اور آسمانوں کے اندر جو کچھ ہے، وہ سب میں نے تیرے تابع کیا ہے بشرطیکہ تو حکمت سے کام لے''۔ جن لوگوں نے حکمت، عقل و دانش سے کام لیا، اُنہوں نے انسانوں کی سہولیت کے لئے ایجادات کا انبار لگا دیا اور کرّۂ ارض کو ہلا ڈالا، جبکہ مُلّا نے ہمیں کفر اور فتویٰ کے دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیا۔ ہمیں تنگ نظری کی اندھی کھائی میں پھینک دیا۔ ہمارے لئے سوال کرنا کفر ہوگیا۔ اکثر ملاوؤں کی کم علمی، کم عقلی اور انتہا پسند سوچ نے مسلمانوں کو دُنیا میں مذاق کا موضوع بنا دیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان دانشور نئی سوچ لے کر آیا بھی تو اسے انگریزوں کا پٹھو اور اسلام کا غدار بنا دیا۔ سر سید احمد خان پر تو کُفر کے 60 فتوے لگ گئے۔ آج سر سید کی سوچ اور تحریر کا ثمر دیکھیں اور مُلّا کی پسماندگی کا بھی، جنہوں نے اسلام کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا ہے۔ میں دقیانوسی خیالات کا مخالف ہوں اور اُن ملاؤں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اسلام کا عکس خراب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرے مخالفین کا حلقہ زیادہ ہے۔ ترقی پسندی، اپنی روایات کے مثبت پہلوؤں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کا نام ہے۔ نئے نئے علوم کو جاننے کا نام ہے۔ جدید ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کا نام ہے، اور یہ باتیں بنیاد پرست نیم خواندہ اور اَن پڑھ لوگوں کو بُری لگتی ہیں کیونکہ ترش آدمی کا شہد میٹھا نہیں ہوتا۔

☆ جموں کشمیر کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال پر آپ کو متفقہ طور پر، مستند آواز تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کی صاف گوئی اور بے باکی بھی مسلّم ہے۔ آپ کے خیال میں جموں کشمیر کی اصل صورت حال کیا ہے اور اسے کس طور سلجھایا جا سکتا ہے؟

☆☆ سیاسی میدان کے کھلاڑی کو ارسطو اور چانکیہ کی طرح فلاسفر، قانون دان، اعلیٰ مشیر، ملکی دستور چلانے والا اور مدبر سیاست دان ہونا چاہئے۔ یہ صفات قائد اعظم محمد علی جناح میں بدرجہ اُتم پائی جاتی تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد پاکستان میں سیاسی خلا کبھی پُر نہیں ہوسکا جبکہ بھارت میں مہاتما گاندھی، ڈاکٹر رادھا کرشنن، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، ڈاکٹر امبیڈکر، مولانا آزاد، اندرا گاندھی اور اٹل بہاری واجپائی ایسے بے شمار مُدبّر سیاست دان ہوئے ہیں جنہوں نے ملک کو مضبوط سیاسی بنیاد بخشی، اور ہر ادارے کو ملکی قانون کے تابع بنایا۔ جبکہ پاکستان میں وڈیرا سسٹم پروان چڑھا، جس میں ذاتی مفاد کو سیاست پر فوقیت دی گئی۔ نتیجہ دُنیا کے سامنے ہے۔ کشمیر کے معاملات میں بھی ہندوستانی سیاست دانوں نے ایک ماہر کھلاڑی کی طرح اپنی گیم کو کھیلا جبکہ پاکستان نے کشمیر مسئلے کو حل کرنے کی بجائے اِسے قومی سیاست کا ایک آلہ بنا کر رکھ دیا۔ تین

جنگیں اور کرگل کا تصادم بھی بے کار گیا۔ بالآخر بات ہمیشہ میز پر بیٹھ کر ہی طے ہوئی، تاشقند اور شملہ معاہدہ اس کی مثالیں ہیں۔ اب بھی اس مسئلہ کو بُردباری سے حل کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان اپنے قبضہ والے کشمیر کی ایک اِنچ زمین دینا نہیں چاہتا، پاکستان لینے کے قابل بھی نہیں۔ لہٰذا اِس کا صرف یہی حل ہے کہ موجودہ سرحد کو تسلیم کرلیا جائے اور اپنے علاقے کے لوگوں کی پسماندگی کو دُور کرنے کے لئے تعلیم اور اقتصادیات کو بہتر بنانے پر زور دیا جائے۔ دونوں ملکوں میں آمد ورفت شروع کی جائے اور بزنس کے ذرائع تلاش کئے جائیں تاکہ برصغیر ہندو پاک میں خوشحالی آئے۔

☆ شیخ عبداللہ کے دستِ راست اور نائب وزیراعلیٰ جناب افضل بیگ کے معاون کے طور پر آپ کا تقرر کس خوبی پر ضروری گردانا گیا اور آپ کس طور اور کس قدر اُن کی توقعات پر پورا اترے؟

☆☆ اندرا۔ شیخ اکارڈ کے بعد 1975ء میں شیخ محمد عبداللہ نے دوبارہ حکومت سنبھالی، مرزا محمد افضل بیگ اُن کے دستِ راست تھے۔ اُنہیں ایک ایسے پرنسپل اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانیں بھی جانتا ہو خصوصاً کشمیری اور ڈوگری۔ چنانچہ میرا انتخاب ہوا۔ بیگ صاحب نے میرا انٹرویو لیا۔ اُن کی تشفی کے بعد ہی میرا آرڈر نکلا۔ تقریباً تین سال تک بیگ صاحب کو پتہ ہی نہ چلا کہ میں کشمیری ہُوں یا پنجابی۔ آخر جموں کے ایک وفد نے یہ راز افشا کیا جو بیگ صاحب سے ملنے آیا تھا۔ وہ بات بات پر کہتا کہ ''پچھو ساڈے مُنڈے ہُوں'' جب مرزا محمد فضل بیگ صاحب نے میری طرف دیکھا تو میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دیا۔ اس کے بعد بیگ صاحب میرا زیادہ خیال رکھنے لگے۔ میں اُن کی توقعات پر ہمیشہ پورا اُترا اور میں نے بھی اُن سے بہت کچھ سیکھا، خاص کر انگریزی زبان اور کشمیری سیاست کی پیچیدگیوں کے حوالے سے۔

☆ اندرا گاندھی کی مرضی ومنشا کے برخلاف الیکشن لڑنے اور جیتنے کے بعد فاروق عبداللہ وزیراعلیٰ بنے تب اُن کی کابینہ کے وزیر جناب شفیع اوڑی نے تمام تر مخالفت کے باوجود آپ کو ''عوامی رابطہ افسر'' مقرر کرنا کیوں ضروری جانا؟

☆☆ 1983ء میں الیکشن سے پہلے وزیراعظم اندرا گاندھی نے فاروق عبداللہ سے کہا کہ کانگریس پارٹی اور نیشنل کانفرنس مل کر الیکشن لڑیں لیکن فاروق عبداللہ نہیں مانا۔ وہ جانتا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی فوتگی کا فائدہ نیشنل کانفرنس کو ضرور ملے گا اور وہ انتخاب جیت جائے گی۔ وہی ہوا، الیکشن میں نیشنل کانفرنس دوتہائی سیٹیں لیکر حکومت سازی کرنے لگی۔ یہ بات اندرا گاندھی کو سخت ناگوار گذری اور وہ فاروق عبداللہ کی حکومت گرانے کے لئے فاروق کو غدار، پاکستانی ایجنٹ، فرقہ پرست اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگی۔ اخبارات میں لفافے صحافیوں نے فاروق کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔ اُن حالات میں انفارمیشن منسٹر محمد شفیع اُوڑی صاحب نے مجھے عوامی رابطہ افسر بنا کر جالندھر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ پی، آر، او کی پوسٹ بہت اہم تھی اور اُس پر ہمیشہ غیر مسلم افسر ہی تعینات ہوتے تھے کیونکہ مسلم افسر اس کو کھڈے لائن والی آسامی سمجھتے تھے۔ بہرحال کافی تگ ودو کے بعد مجھے جالندھر بھیجا گیا۔ کیوں کہ محمد شفیع اُوڑی صاحب جانتے تھے کہ پنجاب کے ادبی اور صحافتی حلقوں میں میرا اثر ورسوخ ہے۔ میں نے وہاں اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دینے کی کوشش کی لیکن آخر کار گورنر جگموہن کے ذریعہ فاروق صاحب کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا، اور مجھے سیکرٹریٹ کے جنرل ڈیپارٹمنٹ میں اٹیچ کردیا گیا۔

☆ ایک زمانے تک سیکولر ملک کی شناخت رکھنے والا بھارت جس تیزی سے تعصب اور تنگ نظری کے ساتھ ہندو اسٹیٹ بننے کی جانب رواں ہے، اُس کے اثرات بھارت واسیوں کے علاوہ خطے کے دیگر ممالک پر کیا ہوسکتے ہیں؟

☆☆ دراصل برصغیر ہند میں انگریز نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو اپنا مقصد بنایا تھا۔ 1857ء کی ناکام بغاوت تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔ بغاوت کے بعد بھی مُلک کی آزادی کے لئے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن انگریزوں نے مذہبی بنیاد پر دونوں کو آپس میں لڑایا۔ یوں نفرت کے بیج ہندوستانی سماج میں اپنا رنگ دکھانے لگے۔ 1946ء تک نفرت اور بنیاد پرستی نے اپنی جڑیں مضبوط کرلی تھیں۔ ایک دوسرے کے خلاف قاتلانہ حملے شروع ہوگئے تھے۔ ہندوستان کی ہندو اکثریت یوں تو سیکولرازم کی حامی تھی لیکن اُن کا ایک بڑا طبقہ یا حصہ ''ہندوتو'' کا حامی رہا ہے۔ سب سے پہلے 1925ء میں کیشو بلرام ہیگڈے نے ''راشٹریہ سویم سیوک سنگھ'' یعنی آر، ایس، ایس کی بنیاد ڈالی جسے آپ ہندوتہذیبی قومیت بھی کہہ سکتے ہیں اور کہا کہ مسلمان اور عیسائی ہندوستان کے وفادار کبھی نہیں ہوسکتے۔ پھر ونائیک دمودر ساورکر (ویر ساورکر) نے ہندوتو کے نظریے کو پھیلانا شروع کیا۔ وہ ہندو مہاسبھا کا دس سال تک صدر بھی رہا۔ اُس کے بعد گورو گولوالکر آئے۔ یہ سبھی بنیاد پرست ہندو تھے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مخالف۔ اِسی تنظیم کے ایک سرگرم ممبر نتھورام گوڈسے نے مہاتما گاندھی کو قتل کردیا تھا کیونکہ وہ پاکستان کو اُس کے حصہ کا پیسہ دینے اور ملک میں قتل عام روکنے اور ہندو مسلم بھائی چارے کی حمایت کررہے تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد بے شک کانگریس نے حکومت بنائی۔ سیکولر بنیادوں پر ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین لکھا اور پارلیمنٹ نے اُسے منظور کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے لیکر اندرا گاندھی کے دور تک ملک کی شناخت سیکولر رہی لیکن پھر ''ہندوتو'' نظریات رکھنے والی سیاسی جماعتوں نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کردیئے۔ فوج، پولیس اور انتظامیہ میں بنیاد پرست نظریات رکھنے والے ہندوؤں کو بھرتی کروایا جانے لگا اور بالآخر نریندر دمودر داس مودی نے بھارت کی حکومت سنبھالی اور دوتہائی اکثریت سے حکومت بنائی اور یوں آر، ایس، ایس اور اُس کے نظریات کو عمل میں لانے کے لئے بھارتیہ جنتا پارٹی اپنا رول ادا کررہی ہے۔ یقیناً اس کے اثرات بھارت کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ہمسایہ ممالک پر پڑیں گے کیونکہ کسی بھی قوم کو کرۂ ارض سے ختم کرنا یا سمندر بُرد کرنا ناممکن ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ 1947ء میں مذہب کی بنیاد پر ہم لاکھوں انسانوں کا خُون بہا چکے ہیں اور کروڑوں کو بے گھر کرچکے ہیں۔ ایسا کانڈ پھر دہرانا خودکشی سے کم نہیں ہوگا۔

آوارہ جوگی

سریندر نیر
(جموں)

پاکستان ٹیلی ویژن انڈسٹری کے مایہ ناز اسکرپٹ رائٹر، محبوب شاعر اور نفیس انسان جناب خلیل الرحمٰن قمر فکری آگہی اور تخلیقی انفرادیت کے مالک ہیں۔ وہ سماجی مسائل خصوصاً نسوانی معاملات پر بے باکی سے لکھنے اور اپنی بات کہنے کے لئے مشہور ہیں۔ اُن کو میں جب اسٹیج پر گفتگو کرتے یا کسی انٹرویو میں بولتے سُنتی ہوں تو من مگن ہو جاتی ہوں۔ خاص کر جب وہ عورت کی عظمت، اور اُس کی نفسیاتی کیفیتوں پر اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ عورت کی قدر و منزلت اور محبت کو اپنے ٹیلی ویژن ڈراموں میں پیش کرنے کے لئے جو زبان وہ استعمال کرتے ہیں، انہوں نے اُسے قربِ و جوار میں رہنے والے بزرگوں، جولاہوں، موچیوں، ترکھانوں اور دُکانداروں سے سیکھا ہے۔ اُن کی باتیں سُن کر مجھے ایسے لگتا ہے جیسے سرحد کے اُس پار بیٹھا ہوا اور دردمند دِل رکھنے والا مشہور ادیب و شاعر خلیل الرحمٰن قمر میرے لئے اجنبی نہیں ہے کیونکہ وہ تو سرحد کے اِس پار رہنے والا ہمارا اپنا خالد حسین ہے۔ جس کا تخلیقی لب ولہجہ، دلکش بیانیہ اور پُرخلوص مسکان بالکل قمر صاحب ایسی ہے۔ دونوں ادبی شخصیات میں مجھے بہت یکسانیت لگتی ہے اور فخر محسوس ہوتا ہے کہ سرحد کے اُس پار اگر خلیل الرحمٰن قمر جیسے انسانی کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے والے حساس ڈرامہ نگار اور باکمال شاعر ہیں تو ہمارے یہاں بھی خالد حسین جیسا فکر رسا افسانہ نگار ہے۔ جس کی فنکارانہ صلاحیت اور قلم کی سحر کاری قابل داد ہے۔

ویسے تو پنجابی ادب کے اُفق پر کتنے ہی ایسے ادیب ہیں جو صلاحیت کے اعتبار سے اپنے حصّے کی کہکشاں کے امام ہیں، لیکن خالد حسین ایک ایسا ادیب ہے، جس نے آسمانِ ادب کے کسی حصے کی نہ تو خواہش رکھی اور نہ ہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو چاند اور سورج کی طرح پنجابی ادب کی کل کائنات کو روشن کرنے کے لئے جموں و کشمیر کے دُور افتادہ پہاڑی علاقے سے اُبھرا، اور بِنا کسی تردُّد کے ادبی اُفق پر چھا گیا۔ اُس کے تخلیقی ذہن نے حدوں اور سرحدوں کے چیلنج کو کبھی قبول نہیں کیا، بلکہ سماجی زندگی کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کی آس بندھائی۔ وہ جموں کشمیر کا ہی نہیں بلکہ عالمی پنجابی ادب کا نمائندہ افسانہ نگار بنا۔ دُنیا کے کسی بھی کونے میں رہنے والے پنجابی ادب کے قدردان اور قارئین اُس کی ٹھیٹھ پنجابی زبان اور منفرد اسلوب میں لکھی فکر و احساس اور تجرباتِ حیات سے بھرپور کہانیوں کو پڑھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

وہ جہاں اپنے پُرکشش قد و قامت کی وجہ سے کسی فلمی ہیرو جیسا لگتا ہے، وہاں اُس کا رکھ رکھاو، نفاست، کشادہ روی اور حُسنِ سلوک دوستوں اور ہمعصروں میں شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ میں اُسے کبھی کبھی شوشی کپور بُلایا کرتی تھی۔ ایسی منجملہ شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا بقول ڈاکٹر منموہن، ایک چُنوتی بھرا کام ہے میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ مجھے خالد حسین ایسی شخصیت پر لکھنے کا موقع ملے گا کیونکہ میں کہانی لکھ سکتی ہوں، ناول لکھ سکتی ہوں، کبھی کبھی شاعری پر بھی طبع آزمائی کر سکتی ہوں، لیکن کسی کی سیرت پر لکھنا میرے لئے درحقیقت ایک نیا تجربہ ہے۔ اِس عمل پر پُورا اُترنے کے لئے جب میں نے خالد حسین کے تخلیقی ادب کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے اُس کی زبان و بیان کی روانی، اور فنکارانہ چابکدستی کا بھرپور احساس ہوا۔ پھر اُس کی خودنوشت ''ماٹی کدم کریندی یار'' میرے لئے اُس کی ذات کو سمجھنے اور زندگی کے رموز کو جاننے کے لئے ایک دستاویز بنی، جس کو پڑھنے کے بعد اُس پر لکھنا میرے لئے آسان ہو گیا۔

میں خالد حسین کو صرف ایک ادیب یا افسانہ نگار کے طور پر بیان نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اُس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ میں نے اُسے جس سمت سے بھی دیکھا، وہ ایک حیران کُن معجزہ دِکھائی دیا۔ ایک جملہ اُس کے لئے عام طور پر استعمال ہوتا ہے کہ وہ ''یاراں دا یار'' ہے۔ یہ جملہ ہوا میں اُڑانے والا نہیں بلکہ حقیقت ہے اور خالد حسین کی زندگی بھر کی کمائی ہے کہ دوست تو دوست، اُس سے بغض رکھنے والے بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ بھی کہیں لیکن خالد یاروں کا یار ہے کیونکہ کسی مشکل دور سے گذر رہے دوست یا دشمن کا ہاتھ اور ساتھ وہ کبھی نہیں چھوڑتا۔ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی عمر کے ادیبوں اور شاعروں کی رہبری کرتا ہے بلکہ اپنے دوستوں، ہمعصر اور ہم خیال ادیبوں کا ایک بھروسے مند راز دار بھی ہے کیونکہ کبھی ناچارگی میں یا کبھی ہوش حواس یا مدہوشی میں کہی گئی راز کی باتیں وہ کبھی فاش نہیں کرتا بلکہ اُن کا امین ہوتا ہے۔ یقیناً وہ گہرے پانیوں کا تیراک ہے۔

ہندی کے نامور ادیب وشنو پربھاکر جب بنگالی ادب کے مشہور ناول نگار شرت چندر چیٹرجی کی ادبی سوانح ''آوارہ مسیحا'' لِکھ رہے تھے تو شرت چندر کے جگری دوست ہری داس چٹوپادھیائے نے وشنو جی کو ادیب کی ذاتی زندگی سے متعلق بڑی سنجیدہ باتیں سمجھائی تھیں۔ اُنہوں نے کہا تھا ''ادیب کی یہ مجبوری نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اُس کی زندگی کے ساتھ جُوی سبھی باتیں لوگوں کو بتائے بلکہ اُس کی تخلیقیت سے جتنی جانکاری قاری کو ملے اُسی پر اکتفا کرنا چاہئے اور یہ اُس ادیب کی صحیح پہچان بن سکتی ہے کیونکہ ادیب کی ذاتی زندگی اور ادبی زندگی کی سچائی کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ قارئین کے لئے اتنا سمجھنا ہی کافی ہے کیونکہ جب تخلیق کار یا اُس کے جاننے والے نہیں رہیں گے تو نئے پڑھنے والے اُس کی تخلیقات کو پڑھ کر ہی اُسے جاننے کی کوشش کریں گے۔ اُس کی ذات کو کُریدنے سے نہیں۔''

مگر یہ بھی سچ ہے کہ خالد حسین کے افسانوی ادب کو پڑھ کر جتنی چرچا

ہوتی ہے اُتنی ہی اُس کی ذات کے ملنگی پن کے قصے ادبی محفلوں یا بحث ومباحثوں کی مجلسوں میں گردش کرتے رہتے ہیں کیونکہ جیتے جی ''لوک کتھا'' بن جانا ہر ایک کے مقدر میں نہیں لکھا ہوتا۔ خالد حسین کسی محفل میں حاضر ہو یا غیر حاضر، اُس کے ذکرِ خیر کے بغیر وہ محفل بے رونق اور بے ذائقہ رہتی ہے۔ خالد حسین کے ادبی سفر پر میں بات نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اِس پر بے شمار مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ کئی محققوں اور اسکالروں نے اُس کے فن پر تحقیق کی ہے۔ تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ اس لئے میں اپنے مضمون میں وہی لکھوں گی جیسا میں نے اُسے ذاتی طور پر دیکھا، پرکھا، جانا اور سمجھا ہے۔ دراصل جب میں اُسے چار کھونٹ دیکھتی ہوں تو ایک جانب خالد مثبت سماجی نظریات رکھنے والا آدمی دِکھتا ہے جس کو اونچ نیچ، بے انصافی، نابرابری اور جائز، ناجائز کی تفریق، بولنے پر اُکساتی ہے لیکن وہ بنیاد پرست یا کٹر وادی نہیں ہے مگر دھرم کے نام پر ہو رہی فرقہ پرستی اور دہشت کے خلاف ہر اُس جگہ آواز بلند کرتا ہے جہاں اُسے یقین ہوتا ہے کہ اُس کے بولنے کا اثر ضرور ہوگا۔ وہ مشترکہ تہذیب وثقافت کے لئے ایک پُل کی نمائندگی کرتا ہے۔

دوسری طرف سیاسی معاملات پر اُس کا پوری طرح چوکس رہنے والا کردار ہمارے سامنے آتا ہے، ملکی اور عالمی سطح پر جُڑی جموں کشمیر کی سیاست پر خالد حسین کی گہری نظر ہے اور ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ اس حوالے سے وہ ایک جیتا جاگتا اتہاس ہے۔ اپنی مٹی کی محبت اُس کی رگوں میں دوڑتی ہے۔ اور یہ مٹی کی محبت ہی ہے جو اُسے بڑی بے باکی سے سیاسی شعبدہ بازوں اور مکاروں کے خلاف آواز اُٹھانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ وہ جموں کشمیر میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں کا نہ فقط چشم دید گواہ ہے بلکہ سیاسی بساط کے مہروں اور اُن کو چلانے والے سیاست دانوں کی بھرپور جانکاری بھی رکھتا ہے۔

تیسری طرف وہ ایک سچا گھریلو آدمی ہے۔ اپنے چاہنے والوں، یار دوستوں کے لئے بے شک وہ دِلدار یا دلبر ہو لیکن اپنے گھر والوں کے لئے وہ ایک آوارہ جوگی ہے۔ جس کے پاؤں گھر میں ٹکتے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سفر کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس تیسرے کونے سے دیکھنے پر مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ گھر سے باہر ادبی مجلسوں اور دوستوں کی محفلوں میں وہ جتنا بھی بے پرواہ، شوخ، لطیفے باز اور ظرافت کا پرکالا نظر آئے لیکن گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اُتنا ہی باوفا، شائستہ، باوقار، فکرمند اور اصول پرست بن جاتا ہے۔ اُس کے گھر جائیں تو یقین ہوتا ہے کہ یہ کسی خوش اخلاق، مہذب اور نفاست پسند شخص کا گھر ہے جہاں مہمانوں کی آؤ بھگت عزت واحترام کے ساتھ کی جاتی ہے۔ باہر کی آوارہ گردیاں اور لحاظ داریاں خالد حسین گھر کی دہلیز کے باہر ہی چھوڑ آتا ہے اور ایک شفیق باپ، نک چڑھا خاوند اور محبتی نانے اور دادے کا روپ دھار کر شب وروز گذارتا ہے۔ گھر گرہستی کے حوالے سے اُس نے بہت مصیبتیں جھیلیں ہیں۔ بچپن کی یتیمی، خانہ بدوشی سے لیکر صاحبِ اولاد ہونے کے بعد کچھ دن بُلائی آفتوں نے اُسے گھیر لیا تھا لیکن وہ کبھی ڈگمگایا نہیں۔ ہمیشہ باہمت اور توانا رہا۔ اُس نے اپنی تکلیفوں اور مایوسیوں کو اپنے چہرے پر چپکایا نہیں بلکہ گھر پر یوار کیلئے مشہور پنجابی افسانہ نگار کلونت سنگھ ورک کی کہانی ''دھرتی بھلا بلد'' بنا رہا اور دوسروں کے حصے کے دکھ درد بھی اپنے کندھوں پر اُٹھائے چلتا رہا۔ مگر اپنی گرہستی کی جڑوں کو ہلنے نہیں دیا۔ جبھی تو اپنے بچوں کے علاوہ پوتے، پوتیوں تک کی ذمے داریوں کو آخری سانس تک نبھانا چاہتا ہے۔

چوتھی جانب سے جب میں خالد حسین کو دیکھتی ہوں تو میرے سامنے ست رنگی جھولا ایک سِرے سے دوسرے سِر تک جھولنے لگتا ہے اور مجھے کائنات کے سارے رنگ خالد حسین کی شخصیت میں سے نمودار ہوتے نظر آتے ہیں اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے چڑھتے سورج کی کرنیں اندھیرے کو چیر کر آسمان میں قوسِ قزح کے رنگ بکھر رہی ہوں۔ آپ جس کسی کے سامنے اُس کا نام لیں اُس شخص کے پاس بھی خالد حسین سے جُڑا کوئی نہ کوئی قصّہ ضرور ہوگا بلکہ یادوں کی گٹھڑی ہوگی، جس میں سے وہ ایک ایک یاد نکالتا جائے گا اور ہمیں سُناتا جائے گا۔ قصے خالد حسین کے پاس بھی بے شمار ہیں۔ جس محفل میں وہ بیٹھا ہو، وہاں اُس کے قہقہے، چٹکلیں، حکایتیں اور لطیفے گونجتے ہیں۔ وہ ایک جیتی جاگتی لُغت بھی ہے۔ وہ کہانی ڈھونڈنے نہیں جاتا بلکہ کہانی خود اُس کے پاس آتی ہے۔ اسے کہانی گھڑنا نہیں پڑتی بلکہ وہ خالد کو میٹھے میٹھے سُپنے دیتی ہے، اُسے گدگداتی ہے۔ نیند سے جگاتی ہے اور کہتی ہے کہ اُٹھ جوگیا۔۔۔ جاگ ذرا، کہ اب وقتِ سخن ہے آیا۔ کہانی کہتی ہے کہ مجھے لفظوں میں ڈھال، میں کب سے چھٹپٹا رہی ہوں۔ تم اپنے فنکارانہ شدگار سے مجھے زندہ جاوید کردے۔ یہ خالد حسین کی سخن وری کی دین ہے کہ ''اشتہاروں والی حولی''، ''کنوار گندل''، ''حلالہ''، ''شاداں بلّی'' اور ''باجی بلقیس'' جیسے اُس کے نسوانی کردار اور ''عشق ملنگی''، ''بیڈے کی لنکا'' اور ''لکیر'' جیسے مردانہ کردار ہمیشہ کے لئے امر ہو گئے ہیں۔

اِتنی شہرت پانے کے باوجود بھی خالد حسین ایک عام سا آدمی ہے۔ ادب میں ناموری کمانے کے بعد بھی اُس کے مزاج میں نرمی ہے، عاجزی اور انکساری ہے۔ کوئی بھی دوست اپنے دل کا راز اُس سے ساجھا کرنے میں ہچکتا تا نہیں کیونکہ کسی کے بھید دِل کی دیواروں سے باہر نکالنے اور اُچھالنے کو وہ کمینگی سمجھتا ہے۔

خالد حسین کو جاننے کے لئے اُس کی خودنوشت ''ماٹی کدم کریندی یار'' (اُردو ترجمہ ''میں زندہ آدمی ہوں) کی ورق گردانی کرنا ضروری ہے۔ حالانکہ آپ بیتی پڑھ کر من میں یہ خیال آتا ہے کہ خالد حسین یہ خواہش کیوں رکھتا ہے کہ اللہ نہ کرے اُس کی فوتگی کے بعد اُس کے دوست احباب اُس کو ویسے ہی یاد کریں جیسا اُس نے لکھا ہے۔ کسی کے من میں اُترے بغیر کوئی کیسے فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگلا شخص بھی ویسا ہی سوچے گا جیسا وہ چاہتا ہے۔ خیر یہ تو سرسری بات تھی۔ اصل میں خالد حسین نے زندگی میں خطرے مول لینے میں کبھی ڈر محسوس نہیں کیا، نہ تو ادبی اکھاڑے میں اور نہ ہی ذاتی زندگی میں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اپنے پُرخلوص مزاج کی وجہ سے اُس نے جیون کی دشوار گذار راہوں کو یقینِ محکم

کے ساتھ پار کیا۔ وہ سرکاری نوکری میں بطور کلرک بھرتا ہوا لیکن بہ فضلِ ربّی اپنی محنت اور قابلیت کے کارن اعلیٰ عہدہ سے سبکدوش ہوا۔ اُس کا یہ بھی کمال ہے کہ بڑے عہدوں کا گھمنڈ اور مغروری اُس کی طبیعت پر حاوی نہیں ہوسکی۔ ڈپٹی کمشنر اور میجر ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ رہتے ہوئے بھی وہ اپنے فقیری مزاج کے کارن گرد آلود جگہوں میں بیٹھ کر بھی اچھے شاعروں اور نثر نگاروں کی نگارشات سنتا اور کھل کر داد دیتا بشرطیکہ شعر یا جملہ اُس کے من کو بھائے۔ خود بھی جب وہ کوئی نئی کہانی لکھتا ہے تو دوستوں کو سنانے کے لئے پُر جوش ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی نیا لکھنے والا اپنی تحریر سُنانے کے لئے بے تاب ہوتا ہے، جوش وجذبے سے بھرپور۔ یہی باتیں خالد حسین کو ہر دلعزیز بناتی ہیں۔

ادیبوں اور فنکاروں کی زندگی عام لوگوں سے تھوڑی مختلف ہوتی ہیں۔ سچا ادیب حساس طبیعت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ خالد حسین بھی ایک حساس تخلیقی رویہ رکھتا ہے۔ بچپن کی محرومیوں اور اُجاڑ کے درد نے جہاں اُس کو لفظوں کی درگاہ کا مُرید بنا دیا وہاں اُس کے جیون میں آئیں، الگ الگ قسم کی محبتوں نے اُس میں اعلیٰ ظرفی پیدا کی۔ اسی لئے عورت ہو یا مرد، اُس کی رفاقت اور دوستی کے دائرے میں آنے والے ہر بشر کو اُس نے گرنے نہیں دیا بلکہ اوپر اُٹھنے کا حوصلہ دیا اور ضرورت پڑنے پر اُس کا ہاتھ بھی تھاما۔ وہ دل آزاری نہیں بلکہ دِل جیتنے میں یقین رکھتا ہے۔ جبھی تو شہرت کی منزلیں طے کرنے کے باوجود وہ اپنے دیرینہ دوستوں کے ساتھ آج بھی محبت اور خلوص سے پیش آتا ہے۔ کیونکہ وہ نہیں بھولتا کہ مشکل وقت اور جدوجہد کے دور میں وہی اُس کے سنگی ساتھی تھے اور وہ خالد حسین کو مٹی میں سونا تلاش کرنے کیلئے اُچھل کود کرتے دیکھتے رہتے تھے۔

ایک خاص بات جو خالد حسین کے کردار کو وقار بخشتی ہے وہ صنف نازک کے لئے عزت واحترام کا جذبہ ہے۔ میں خالد حسین کو جتنا جانتی ہوں یا جتنی میری معلومات ہیں، اُس کے مطابق وہ دوستوں کی ادبی یا غیر ادبی محفلوں میں خاتون دوستوں کی نجی زندگی کے بارے میں کبھی چغل خوری نہیں کرتا اور نہ ہی ادیب اور ادب نواز خواتین کی افواہیں اُڑاتا ہے اگر کسی ادیبہ کے ساتھ دوستی رہی بھی ہوگی تو اُس میں بھی شائستگی اور تعظیم کا پہلو نماں ہوگا اور ایسا رشتہ گھر پر یوار کے لئے قابل قبول ہوتا ہے اور باہمی حُرمت میں اضافہ کرتا ہے۔ ایسے رشتوں میں سگے قرابت داروں جیسی خوشبو آتی ہے۔ ورنہ کئی بار تو ادبی حلقوں میں ایسی چغل کہانیاں دیوالی کی پھلجھڑیوں کی طرح سُلگائی جاتی ہیں جن کا حقیقت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا لیکن محفلوں کی رونق بڑھانے کے لئے خیالی اور فرضی کہانیاں بنا بنا کر اپنا سینہ چوڑا کیا جاتا ہے۔ خالد حسین کی اسی خوبی کی وجہ سے شاید ذی شعور خواتین اُسے اپنا دوست کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ چاہے اس کی کہانیوں کے نسوانی کردار کتنے ہی بے باک اور حدیں توڑتے نظر کیوں نہ آئیں۔

خالد حسین کی زندگی بھی اُس کے کرداروں کی طرح ہمیشہ رواں دواں اور سرگرم رہی ہے۔ اُس کی کہانیوں میں کہیں روک، ٹھہراو یا تعطل نہیں ہے اور نہ ہی اُس کی زندگی میں۔ بچپن میں بے کیف زندگی جینے والا خانہ بدوش خالد جوان ہوتے ہی نام پیدا کرنے کی خواہش میں داخلی بے چینی کا اظہار کہانیوں کے کرداروں کے ذریعہ کرتا رہا۔ اُس نے زبان وبیان کی کرنوں سے اپنے اندر کے تاریک کونوں کو نہ فقط روشن کیا بلکہ جموں کشمیر کے پنجابی ادب کے پرچم کو عالمی سطح پر لہرایا۔

آخر میں خالد حسین کی آپ بیتی کی دوبارہ بات کروں گی۔ ہر کوئی اپنی خودنوشت نہیں لکھ سکتا کیونکہ کوئی بھی اتنا راست گو اور بہادر نہیں ہوسکتا کہ وہ زندگی میں درپیش حادثات وواقعات کو جُوں کا تُوں لکھ سکے، لیکن جب خالد حسین جیسے لوگ اپنی بات دلیری سے کہتے ہیں تو اُس میں ادیب اور اس کے ادب کی سچائی نظر آتی ہے۔ ادیب کی تُرش بیانی کو بھی ایماندارانہ تخلیقی عمل سمجھ کر اُس پر تعمیری تنقید ہوسکتی ہے۔ انسان کو صرف فرشتہ یا شیطان یعنی اچھائی اور برائی کے یکطرفہ ترازو میں تولا نہیں جاسکتا۔ کسی کی زندگی کو سمجھنے کے لئے اُس سے جڑی وارداتوں یا اہم یاداشتوں کو قلمبند کرنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں جا کر خامیوں اور خوبیوں کو گہرائی سے سمجھنا ہی کسی خودنوشت کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ خالد حسین کی کہانیاں اُس کا ادبی اثاثہ ہیں، اُس کی ذات کا حصہ نہیں۔ اِسی لئے اُسے اپنی اظہاریت اور حقیقت بیان کرنے کے لئے خودنوشت لکھنا پڑی۔ بقول انور جلال پوری

میرا ہر شعر حقیقت کی ہے زندہ تصویر
اپنے اشعار میں قصّہ نہیں لکھا میں نے

خالد حسین کے افسانوی کردار پھول کی پنکھڑیوں میں بند خوشبو کی طرح ہیں جو اُس کی عبارت آرائی اور لسانی خوش بیانی سے آراستہ ہیں۔ میں اِس مایہ ناز ادیب کے لئے دُعا گو ہوں کہ اللہ اِسے صحت منداور توانا رکھے۔ آمین

اپنے حصے کی لڑائی

سماج کے لیے لڑو
لڑ نہیں سکتے تو لکھو
لکھ نہیں سکتے، تو بولو
بول نہیں سکتے تو ساتھ دو
ساتھ بھی نہیں دے سکتے، تو جو
لکھ، بول اور لڑ رہے ہیں، اُن کی مدد کرو
اور، اگر مدد بھی نا کر سکو، تو، اُن کے حوصلوں کو
گرنے نہ دو۔۔۔ کیوں کہ وہ،
آپ ہی کے حصے کی لڑائی لڑ رہے ہیں

(کارل مارکس)

کچھ یادیں کچھ باتیں

نورشاہ
(سری نگر)

خالد حسین نے جب اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا تو اُس وقت ریاست اور بیرونِ ریاست کے افسانوی منظر نامہ پر ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے چند اُردو افسانہ نگار جیسے ٹھاکر پونچھی، حامدی کشمیری، موہن یاور، علی محمد لون، ویدراہی، پُشکر ناتھ، نُور شاہ، مخمور بدخشی، حسن ساہو، وریندر پٹواری اور برج پریمی وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ خالد حسین کی پہلی اُردو کہانی کا عنوان تھا ''گھر کی جنت''۔ یہ 1969ء کی بات ہے اور یہ کہانی ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' میں شائع ہوئی۔ جب یہ کہانی منظرِ عام پر آئی تو ادبی محفلوں اور ادبی گوشوں میں ایک نئی آواز کا احساس اُبھرنے لگا۔ دو چار کہانیاں لکھنے کے بعد خالد حسین کی ایک اور کہانی ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے مقامی اخبار میں شائع ہوئی۔ اِس کہانی کی اشاعت کے ساتھ ہی ریاستی انتظامیہ کی سطح پر ایک بھونچال سا آ گیا کیوں کہ اِس افسانے کا مرکزی کردار ایک بیوروکریٹ تھا۔ اِس تعلق سے خالد حسین کو ایک جنگ لڑنا پڑی لیکن خالد حسین نے کہانی کے مثبت پہلو کی روشنی میں یہ جنگ جیت لی اور اُس کے بعد خالد حسین نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔

خالد حسین کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے کے فن سے بخوبی واقف ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُس کے دوست واحباب کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک خوبصورت شخصیت کا مالک ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر ہمیشہ پھولوں جیسی نرم ونازک مُسکراہٹ دِکھائی دیتی ہے۔ باتیں کرنے کے انداز میں بھی اُس کی شرافت اور شائستگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ مَیں جب بھی اُس کی پوری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو وہ مجھے آج بھی دوستوں کی محفلوں میں بے تاج بادشاہ کے روپ میں نظر آتا ہے۔

خالد حسین یکم اپریل 1945ء کو اُدھم پور (جموں) میں پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ اُس کی پیدائش کے دو سال بعد مُلک تقسیم ہوا۔ ہر سمت ایک طوفان بپا ہوا۔ ایک اَن دیکھی آگ پھیل گئی۔ وہ گھر سے بے گھر ہو گیا۔ زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں سے محروم ہو گیا لیکن قدم قدم پر طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ڈور اور نزدیک میں پھیلی ہوئی آگ کو بُجھاتا رہا۔ والدہ صاحبہ نے بڑی مصیبتیں برداشت کر کے پالا پوسا اور پڑھا لکھا کر نہ صرف روزگار کے قابل بنایا بلکہ زندگی کے دُکھوں کو ہنستے ہوئے اپنانے کی ترغیب بھی دی اور پھر رفتہ رفتہ کہانی کار خالد حسین کا روپ نکھرنے لگا۔

خالد حسین کا پہلا اُردو افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' 1981ء میں شائع ہوا۔ پھر ایک اور افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' 1991ء میں شائع ہوا۔ اب اُس کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''ستی سر کا سورج'' 2011ء میں شائع ہو رہا ہے۔ اِن تینوں افسانوی مجموعوں کی اشاعت کے درمیان جو طویل عرصہ نظر آ رہا ہے اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ خالد حسین بُنیادی طور پر پنجابی زبان میں افسانے لکھتا ہے اور یہ کہنا مناسب ہے کہ وہ آج پنجابی زبان کا ایک اہم اور معتبر افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اور برِصغیر ہندو پاک کے پنجابی ادبی حلقوں میں اپنا ایک مُنفرد مقام بنا چکا ہے۔ پنجابی میں اُس کے اب تک چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ''جہلم وگدا ریہا''، ''گوری فصل دے سوداگر''، ''ڈونگے پانیاں داڈکھ'' اور ''بلدی برف دا سیک''۔ پنجابی زبان میں اُس کی چند ایک تخلیقات اور بھی ہیں۔ خالد حسین کے اُردو اور پنجابی افسانوں کے ترجمے انگریزی اور ہندی کے معتبر جریدوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ڈوگری، کشمیری اور دوسری زبانوں میں بھی اُس کے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور جموں یونیورسٹی کے نصاب میں خالد حسین کے افسانے پڑھائے جا رہے ہیں۔ لکھنے اور چھپنے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اِس پسِ منظر میں اُس کی افسانہ نِگاری کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بات ہو رہی ہے خالد حُسین کے اُردو افسانوں کی۔ اُس کی تازہ تخلیق ''ستی سر کا سورج'' میں 22 کہانیاں شامل ہیں۔ مجموعے میں شامل کُچھ کہانیاں تاریخی نوعیت کی ہیں۔ کُچھ افسانے علامتی اور استعاراتی انداز سے لکھے ہوئے ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مجموعے میں آج کے کشمیر کی کہانیاں بڑے پُر درد اور کرب ناک انداز میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بیشتر کہانیوں میں کشمیر کی زندگی کے تلخ اور کڑوی کسیلی حقیقتوں کی عکاسی پُر اثر انداز میں کی گئی ہے۔ اِن کہانیوں میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ موجودہ دور کے سماجی مسائل اور معاشرتی حالات کے علاوہ اِنسانی رِشتوں کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز سے کی گئی ہے۔ خالد حسین کی زندگی کے بے شُمار تجربات اور مشاہدات نے اِن کہانیوں کو فکر وفن کے نئے سانچے میں ڈھالنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ خالد حُسین کی کہانیوں میں رومان ہے اور پیار ومحبت بھی، لیکن یہ پیار ومحبت یا رومان سطحی نہیں ہے۔ اِس کی اپنی ایک گہرائی ہے، گیرائی ہے، ایک خوشبو ہے، ایک مہک ہے۔ ایک ایسی مہک جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ زندگی کے بے شُمار سرد اور گرم موسم دیکھنے کے باوجود آج خالد حسین کے پاس کہنے اور لکھنے کو بہت کُچھ ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو افسانوی روپ دینے میں مصروفِ عمل ہے۔ یہ بھی بڑی مسرّت کی بات ہے کہ اِس تخلیقی عمل میں وہ نہ تو مذہب کی طرف داری کرتا ہے اور نہ ہی کسی مُلک اور نہ کسی قوم کی۔ وہ اپنے افسانوں میں اِنسان اور اِنسانیت کی بات کرتا ہے۔ سچ اور سچائی کی بات کرتا ہے۔ وہ بات کرتا ہے وفا کی، وفاداری کی، اعتماد اور بھروسے کی، امن، آشتی اور سلامتی کی۔ وہ اپنے افسانوں میں تہذیبی زندگی کے گھر درے پن اور تضادات کی بات کرتا ہے۔ اُس خلیج کی بات کرتا ہے، جو ایک ناسور بن کر ہماری قومی شخصیت اور ہماری انفرادیت کو داغدار بنا رہا ہے اور

میری نظر میں اُس کی کہانیوں کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اِن ہی باتوں میں پوشیدہ ہے۔ اِس تعلق سے اُس کی کہانیوں سے چند اقتباسات دیکھیے:

''اُن کا مُرشد اپنے جسم پر سات رنگوں کا چولا پہنے گھومتا تھا مگر اُس چولے کو آگ کے شعلوں نے جلا ڈالا۔ راکھشسوں نے نند رشی کو اپنی طرف سے ننگا کر دیا تھا، لیکن وہ ننگا نہیں ہوا تھا۔ اُس کے جسم پر پاکی اور قلندری کا لباس تھا جو کوئی بھی نہ اُتار سکا۔ طاقت اور دہشت ستی سر کی شناخت ختم کرنا چاہتی ہے، پر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں سُولی پر تو لٹکایا جا سکتا ہے۔ ہمارا سر دھڑ سے تو الگ کیا جا سکتا ہے لیکن سچ اور حق کو جُھکایا نہیں جا سکتا۔ ہم ظاہری عقائد اور سیاسی دستور کے پابند نہیں ہیں۔ ہم مست مولا ہیں۔ ہمارے پاس فقیری کا چولا ہے۔ درویشی کی دولت ہے۔ صوفیوں کی رمز ہے۔ اور رَبی عشق کی مستی ہے''

(از: ''ستی سر کا سورج'')

''بھارت اور پاکستان کے رشتوں کے بارے میں یہ محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے کہ لوہار کی سانسی کبھی آگ میں اور کبھی پانی میں۔ ایسے رشتوں کے باوجود بھی دونوں حکومتوں کا یہ فیصلہ قابلِ ستائش تھا کہ کشمیر کے دونوں اطراف بسنے والے لوگوں کو آپس میں ملنے دیا جائے''

(از: ''لکیر'')

''اُس نے فیصلہ کر لیا کہ جھوٹے رشتوں کے جال سے جتنی جلدی باہر نکلا جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔ اُس کے پاس جتنے بھی سانس باقی بچے تھے وہ اُس کی زندگی کا کُل سرمایہ تھے اور وہ اپنی بچی ہوئی سانسوں کو اب ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے دِل کے طاقچے سے یادوں کی کتابیں، موہ کی پوٹلیاں اور خواہشوں کی گانٹھیں اُٹھا کر باہر پھینک دیں۔۔۔ اُس نے اپنے ساتھ بیتے حادثات کے اتہاس کو سینے کی قبر میں دفن کر دیا۔ اپنے کرموں کی زوئی کو ڈھنا۔ عملوں کے چرخے پر سُوت کاتا۔ انحد کی کھیسی بُنی۔ رُوح کو کھیسی میں لپیٹا اور یوں زندگی کے دریا کو شانت سا گر کے اندر جذب کر دیا۔۔۔''

(از: ''پریم کھیلن کا چاؤ'')

''جناب! دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ ہماری حالت شودروں سے بھی بدتر ہو گئی۔ ہماری پہچان مُلک دُشمن، غدّار، جُونی اور دہشت گرد کی بنا دی گئی ہے۔ ہمیں ہر میدان میں پچھاڑ دیا گیا ہے۔ ہم غُربت اور مسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں۔ ہم لاچار ہو چکے ہیں۔ ہماری لاچاری پربت سے بھی بھاری ہے۔۔''

(از: ''آدمی کے اندر چُھپا آدمی'')

''سیاست کا ایک دُمن چکر چل رہا ہے۔ کبھی آگ بھڑکائی جاتی ہے اور کبھی بُجھائی جاتی ہے۔ گولہ بارود کا یہ کھیل دونوں طرف سے کھیلا جا رہا ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ بارود کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ ٹینک اور توپیں کسی عقیدے سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ یہ ہمارے پاس ہوں یا اُن کے پاس، اِن کا کام تباہی اور بربادی پھیلانا ہے۔ اِن کا دھرم دھرتی کو بانجھ بنانا ہے۔ ہلاکتیں کرنا ہے۔ گولی اپنی ہو یا پرائی۔۔ یہ زندگی کا شکار کرتی ہے۔ آنسو رُلاتی ہے۔ سُہاگ اُجاڑتی ہے۔ یتیم بناتی ہے۔ ماؤں کی گود سونی کرتی ہے۔''

(از: ''درد وِچھوڑے کا حال'')

''پنڈت جی! بھلا ہم اُپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔۔۔ ہمارا خون ایک ہے۔ ہماری نسل ایک ہے۔ ہماری زبان ایک ہے۔ ہمارا تمدّن ایک ہے۔ تہذیب ایک ہے۔ ہمارے سنت فقیر اور رِشی سانجھے ہیں۔ ہمارے گیت سانجھے ہیں۔۔۔ وہاں ہر کوئی اپنے پھل کو میٹھا کہتا ہے۔ کھوٹی تو ہماری تقدیر ہے۔ بڑی طاقتیں بیان بازیاں کر کے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتی رہتی ہیں۔ یوں سمجھیں کہ رَنڈی کے گھر منڈی لگی ہوئی ہے۔۔''

(از: ''سانجھا درد'')

''راجاں کوئی بہتی ہوئی شہتیری نہیں تھی جسے نواب دریا سے پکڑ کر لایا ہو۔ وہ تو بھری بہاروں کی گھنی چھاؤں میں پلی بڑھی، ہنستے بستے گھر کی اولاد تھی۔۔۔ سہاگ رات کو صندلی رنگ کی راجاں صندل کی گہری خوشبو کی طرح نواب کے دِل میں اُتر گئی تھی۔ اُس کے گالوں پر بہاریں مُسکرا رہی تھیں۔ عنابی ہونٹوں پر مستی کی چکنائی تیر رہی تھی۔ گہری سیاہ زُلفیں جب پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح مخملی تکیے پر بکھریں تو نواب سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنے بے قابو من کو گرم گرم سانسوں کی ٹکور دینے لگا۔۔۔''

(از: ''حلالہ'')

یہ اقتباسات پیش کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ خالد حسین کی تحریروں کا ایک مختصر سا جائزہ سامنے آئے۔ اُس کے قلم میں جو شگفتگی اور شائستگی ہے، اُس کا اظہار ہو۔ زبان پر جو اُس کی گرفت ہے، اُس کا تجزیہ کیا جائے اور اُس کی فنی مہارت کی پہچان ہو سکے۔

خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کُھردری سطح اور اِرد گرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کے اُس کی کہانیوں میں جہاں حُسن و جمال اور پیار محبت کی نزاکتیں ملتی ہیں، وہیں موجودہ پُر آشوب دَور کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تصویریں ضرور بدصورت ہیں لیکن خالد حسین اِس بد صورتی کو خوبصورتی میں تبدیل کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ اِن تصویروں کے ذریعہ امن اور سلامتی سے بھرپُور زندگی کا احساس دِلانا چاہتا ہے اور ایک نئی فِضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ میری نیک خواہشات اُس کے ساتھ ہیں۔

انسانیت

''کیونکہ انسانیت کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، اور جو کچھ اس وقت انسانیت کے ساتھ ہو رہا ہے، وہ ہم سب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ظلم کتنا ہی چھپا ہوا ہو، درد اور دہشت کی چیخیں کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں، ہم ایک ہی دنیا میں رہتے ہیں۔''

ایلس واکر

عشق سمندر

پروفیسر قدوس جاوید
(سری نگر)

خالد حسین اپنی ذات کے قلم کو زندگی اور زمانہ کی سچائیوں میں ڈبو کر ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی لئے افسانہ ہو یا خاکہ، مضمون ہو یا خودنوشت، اختصار یا تفصیل کے ساتھ ان کی ذات کا حوالہ لازمی طور پر آتا ہے لیکن ہر حوالے سے ان کی جھیلی اور برتی ہوئی زندگی اور زمانہ کے صدرنگ تجربات ومشاہدات، اور ان کے پیدا کردہ جذبات وکیفیات ہی لفظ لفظ سے ٹپکتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زبان (الفاظ، محاورات، ضرب الامثال) کا نادر و نایاب تخلیقی برتاؤ ''خالدیات'' کا سب سے روشن چراغ ہے۔ لیکن خالص لب ولہجے میں استعمال ہونے والے اردو اور پنجابی، کے الفاظ اور محاورات، ان کی عبارتوں میں صرف اور محض لغت کے معانی کا نہیں، صورت اور اصوات کا بھی اخراج کرتے ہیں۔ خالد کی کسی بھی تحریر کی قرات کے تفاعل کے نتیجے میں، ان کے الفاظ صرف جہان معانی کے در ہی نہیں کھولتے، واقعات کی تصویروں کو متحرک کرتے ہیں اور ان کے اندر سے کرداروں کے انفراد واتمیاز، رنج وکرب اور، لُطف وانبساط کی کیفیتوں کو بھی مجسم کردیتے ہیں۔ میر کی طرح خالد حسین کی ذات مجسم عشق ہے اور ان کی تخلیقات' عشق کا سمندر۔ خالد حسین کو عالمِ غیاب میں رکھ کر حاضر راوی اعلان کرتا ہے کہ،

''پیار سمندر اس کے اندر ٹھاٹھیں مارتا تھا، وہ آپ عشق تھا، عاشق تھا اور معشوق بھی۔ وہ قدرت کی بنائی ہوئی کائنات میں رچ بس گیا تھا۔ وہ سچ اور حق کے مذہب کو ماننے والا تھا۔ وہ انتہا پسند مولویوں اور جنونی تِلک دھاریوں سے دُکھی تھا۔ وہ دنیاوی دولت کو بُوٹ کی نوک برابر سمجھتا تھا۔ اسی لئے شاہ خرچ تھا اس نے ساری زندگی 'گیان' کی دولت حاصل کرنے میں گزار دی۔ وہ اپنے دوستوں کو پیار کی سوغاتیں بانٹتا رہتا۔ اس نے کبھی رشتے نہیں گنوائے، بلکہ رشتوں کو پالا، سنوارا اور نبھایا''۔ ص۔۹۔

خالد حسین کے اب تک پنجابی کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔۱۔ ''تے جہلم وگدا رہیا'' (۱۹۷۶ء)، ۲۔ ''گوری فصل دے سوداگر'' (۱۹۸۱ء) ۳۔ ''ڈونگھے پانیاں دا دُکھ (۱۹۸۸ء)۔ ۴۔ ''بلدی برف دا سیک'' (۲۰۰۵ء)، ۵۔ ''سولاں دا سالن'' (۲۰۱۵ء)، ۶۔ ''عشق ملنگی'' (۲۰۱۹ء)۔ ان کے علاوہ خالد حسین کی پنجابی میں اپنی سوانح عمری ''ماٹی کدم کرینڈی یار (۲۰۱۳ء) غیر مسلم بچوں کے لئے آں حضرت ﷺ کی بائیوگرافی ''نوری رشماں (۲۰۰۴ء) ،مضامین کا مجموعہ ''میرے رنگ دے اکھر'' (۲۰۱۳ء) اور ایک ناولٹ ''گواچی جھانجردی چیک'' (۲۰۱۰ء) وغیرہ بھی خالد حسین کے ادبی اعمال نامے میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اردو میں اب تک چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔۱۔ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' (۱۹۸۱ء)۔ ۲۔ ''اشتہاروں والی حویلی'' (۱۹۹۱ء)۔ ''ستی سرکا سورج'' (۲۰۱۱ء)۔ اور ۴۔ ''جنت گرہن'' (۲۰۲۱ء) اس کے علاوہ بہت سارے افسانے ابھی رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

خالد حسین کے کئی افسانوں کا ترجمہ ہندی، بنگلہ، ملیالم، ڈوگری، کشمیری اور انگریزی میں ہو چکا ہے۔ خالد حسین کی منتخب کہانیوں کا ایک مجموعہ ہندی میں ''گھر میں ہے بیراگ'' کے نام سے ۲۰۱۷ء. میں شائع ہو چکا ہے۔ ۴۱ کہانیوں کے مترجم دیپک آرسی ہیں۔ خشونت سنگھ، ڈاکٹر للت گپتا، آدرش اجیت، مشتاق برق، شفیع احمد، سمن کمار شرما اور سیما جین کے علاوہ کئی اور لوگوں نے خالد حسین کے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ خالد حسین کی ایک کہانی ''لکیر'' پر پہلی پوٹھوہاری فیچر فلم بنائی گئی جس نے سِلور جوبلی منائی۔ افسانہ ''عشق ملنگی'' کو تھیٹر ڈائریکٹر مشتاق کاک نے ہندوستان کے ۱۲. بڑے شہروں میں اسٹیج پر پیش کیا۔ خالد حسین کی شخصیت اور فن پر ہندوستان اور پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم. فِل. اور پی. ایچ. ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی بھی جا ری ہے۔ خالد حسین کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہندو پاک کے معتبر ناقدین نے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ پنجابی میں تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''خالد حسین دا کتھا جگت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خالد حسین کی، ان کی ادبی خدمات کے لئے ہند و پاک کے کئی اداروں کی جانب سے عزت افزائی کی جا چکی ہے۔ حکومت پنجاب نے انہیں ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' (شرومنی پنجابی ساہتیہ کار پُرسکار) سے نوازا ہے، جس میں خلعتِ فاخرہ کے علاوہ پانچ لاکھ روپے نقد بھی شامل تھے۔ خالد حسین جموں کشمیر کے پہلے ادیب ہیں جنہیں ''پنجاب رتن'' کے اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ان کے ساتھ ہی انہیں اور بھی ایسے متعدد انعامات واعزازات سے سرفراز کیا جا چکا ہے جن کا شمار مشکل ہے۔ خالد حسین کی افسانہ نگاری سے متعلق ہند و پاک کے جن درجنوں معتبر ناقدین نے مضامین لکھے ہیں ان میں ڈاکٹر ستیندر سنگھ نور حامدی کاشمیری، ڈاکٹر لِلت منگوترا، ویدراہی، نور شاہ، ڈاکٹر اگنی شیکھر، قدوس جاوید، تقی عابدی اور پنجابی کے نقاد اور فکشن نگار ڈاکٹر منموہن وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ خالد حسین کی اس مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ ناقدین کے مطابق، خالد حسین اپنے افسانوں کا مواد زمین کی کُھردری سطح اور ارد گرد کے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ برِصغیر ہند و پاک کی مشترکہ تہذیب، آپسی بھائی چارہ، ملک کی تقسیم، قبائلی حملہ اور الحاق کی حقیقت، جموں کشمیر کی سیاست، ہوس اقتدار کے ماروں کی سازش اور غداری، ۱۹۹۰ء. کے بعد ریاستی عوام کے مسائل، بے بسی اور بے کسی، فسادیوں اور جہادیوں کی سرکاری پُشت پناہی۔ پسماندہ قبائل کی ان دیکھی، اور ریاستی خواتین کے مسائل کو پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان سب سے آگے ان کی یہ 'خودنوشت ... جو. اردو میں شائع ہو رہی ہے اس سے کشمیر اور کشمیر کے عوام کی غربت وافلاس اور سیاست دانوں کی

منافقت اور مصلحت پسندی کے حوالے سے خالد حسین کی شخصیت، ادبی کارناموں اور سماجی و ثقافتی خدمات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل خالد حسین کی حیات اور .ادبی کائنات سے گزریئے تو اندازہ ہوگا کہ دین و مذہب اور مقام و مرتبہ سے ماورا صوفی منش خالد حسین کو مختلف زاویوں اور حوالوں سے جاننے پہچاننے کے باوجود، ہر شخص کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خالد حسین کی ذات میں ابھی اور بہت کچھ ہے جسے جاننا ضروری ہے۔

'کشپ رشی' تو محض ایک افسانوی کردار تھا جو 'ستی سر' کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کے اوراق میں کہیں گم ہو گیا ہے لیکن انسان دوستی کے حوالے سے 'ستی سر کا سورج' (شیخ العالم ایک ایسا زندہ اور متحرک استعارہ ہے۔ جس کی روحانی قیادت آج بھی بھٹکے ہؤوں کو راستہ دکھاتی ہے۔ خالد حسین کی تخلیقی ذات زندگی کے مرکز میں 'ستی سر' کے اس سورج کے اجالے بھرے پڑے ہیں جو خالد کے قلم سے 'سانجھی تہذیب، انسانی مذہبی اور جمہوری قدروں کے احترام اور ادب و صحافت میں حق گوئی کی مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔ خالد حسین کا فکر و فن ریاست جموں و کشمیر کی سرزمین اس گرہن سے نجات اور سورج کے ایک بار پھر سے طلوع ہونے کے انتظار میں ہے حالانکہ 'اٹوٹ انگ' اور 'شہ رگ' کے حوالے سے 'جموں کے 'فسادیوں' اور کشمیر کے 'جہادیوں' نے ریاست کے امن وامان میں ''گرہن'' کی جو کیفیت پیدا کی ہے اس کے سارے اندھیارے، ذہن اور ضمیر کو تاریک کر رہے ہیں۔ خالد حسین کی یہ 'خودنوشت ۔۔۔ ہر حساس انسان کے اندر اس احساس کو جھنجھوڑتی ہے۔

خالد حسین نے اپنی اس تصنیف کو 'خودنوشت' کے نام سے پیش کیا ہے لیکن اسے محض 'ادبی رسم' کی ادائیگی جانیے، کیونکہ اس تصنیف کی ساخت (Structure) میں، 'خودنوشت' کے عام صنفی مزاج کے برعکس 'خود' سے زیادہ 'خُدائی' کا بیان ہے۔ یہ تصنیف مروجہ صنفی حدود ڈھوس کے بجائے 'سیال ہو کر، (جموں و کشمیر کے حوالے سے) تاریخ، تذکرہ، ناول اور افسانہ کو مَس کرتے نظر آتے ہیں، اور یہ عہد حاضر کے ہمہ جہت بحران کا ایک فطری رویہ ہے دراصل تکثیریت (Pluralism) انسانی زندگی اور ادب سمیت تمام فنون لطیفہ کا خاصہ بن چکی ہے۔ اسے عیب جانئے یا ہُنر لیکن حقیقت یہی ہے کہ عہد حاضر کے مباحث اور مسائل نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان، ادب، سماج اور ثقافت کا بھی، کسی بھی طرح کی آئیڈیالوجی (نظریہ، مفروضہ) سے رشتہ بدل گیا ہے اور مستقل بدلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جن 'آئیڈیالوجیز' اور نظامات (Systems) کے تحت انسان زندگی جیتا رہا ہے وہ سارے کے سارے بے فیض اور کھوکھلے ثابت ہو رہے ہیں۔ ادب چونکہ، مثبت یا منفی، تعمیری یا تخریبی آئیڈیالوجی اور نظام سے متاثر بھی ہوتا ہے اور ان کو متاثر بھی کرتا ہے اس لئے جینوین ادیب وہی ہوتا ہے جو اپنے عہد کی نبض پر ہاتھ رکھ کر معمولہ اور متعین ہیئتی و تکنیکی ضابطوں کو ایک طرف سرکا کر آزادانہ اپنے 'بیانیہ' کو سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آ کر کسی بھی ادبی تحریر کے صنفی لبادے میں کئی دوسری اصناف کی بھی چمک دمک صاف نظر آتی ہے۔ صنفی حدود کی خلاف ورزی، یا سیالیت (Liquidity) کی عمدہ مثال بہت پہلے گیبریل گارشیا مارکیز کے ناول .One Hundred Years Of Solitude میں سامنے آئی تھی اردو میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں (مثلاً 'آگ کا دریا) مشرف عالم ذوقی کے افسانوں (مثلاً اصل واقعے کی زیراکس کاپی) وغیرہ میں صنفی حد بندیاں، ٹھوس کے بجائے سیال نظر آتی ہیں۔ اسی مناسبت سے خالد حسین کی خود نوشت 'میں رندہ آدمی ہوں' ایک روزنامچہ بھی ہے، اور اس میں جموں و کشمیر کی تاریخ بھی ہے، (جدید) تذکرہ بھی ہے اور گذشتہ ساٹھ، ستر برسوں میں جموں و کشمیر کی سماجی پسماندگی، معاشی بدحالی، ثقافتی لیل ونہار اور سیاسی کھیل تماشوں کی، سیدھے سچے کرداروں اور واقعات کے حوالے سے تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ اس کی مثالیں اس خودنوشت میں بھری پڑی ہیں۔ لیکن ان تفصیلات تک جانے سے پہلے عام قارئین کو یہ پتہ تو چلنا ہی چاہئے کہ خودنوشت نگار خالد حسین نام کے انسان اور قلم کار کون ہیں اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کن ناقابل یقین، حوصلہ شکن اور عبرتناک مرحلوں سے گزر کر ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل باب ''آگ کی ندی میں تیراک'' میں درج ہے۔

۱۹ سال کی عمر میں، جناب سعید اللہ ملک کی دُختر محترمہ نسیم فردوس سے خالد حسین کی شادی کر دی گئی۔ تقریباً تین سال کے بعد پہلی بچی سمیہ تبسم کی پیدائش کے بعد، بقول راوی (نصیر احمد میر) خالد حسین کی ساری 'خرمستیوں' پر روک لگ گئی۔ گھر گرہستی کو مزید خوشگوار بنانے کے لئے خالد حسین نے ملازمت کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور 'کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں بی۔اے اور ۱۹۷۲ء میں صحافت میں ڈپلومہ بھی کیا۔ جموں میں خالد حسین نے ''سندیش'، 'وقت'، اور ''عمارت'' جیسے روزناموں کی ادارت کی اور سری نگر کشمیر میں بھی ''زمیندار'، روشنی اور ''پولیٹیکل ٹائمز'' وغیرہ کئی مشہور اور معتبر روزناموں کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ جوانی کے ان دنوں میں شرارتیں بھی ہوتیں اور دوست یاروں کی محفلیں بھی سجتیں۔ خالد حسین، نصیر احمد میر، تاج محی الدین، شجی احمد، شجاع سلطان، اور رام لال ان محفلوں کی ''جند جان'' ہوا کرتے تھے۔ کبھی کافی ہائس تو کبھی قاضی نصیر کے تکئے پر جمنے والی ان محفلوں میں کشمیر اور ہندوستان پاکستان کی سیاست سے لے کر جموں کشمیر کے مسائل، کلچر اور ادب کے موضوعات پر سرد و گرم بحثیں اور گپ بازیاں ہوتیں۔ مئی ۱۹۷۰ء میں دوسری بیٹی ثُما تبسم کی اور ۲۵ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بڑے بیٹے ذاکر حسین کی پیدائش ہوئی۔

خالد حسین کے ہم دفتر گہرے دوست اور پانچویں راوی محمد یاسین ہمدانی کے مطابق خالد حسین خوش طبع اور ہنس مُکھ نوجوان تھے اکثر بزم نشاط سجائے رکھتے۔ زندہ دل تو تھے ہی رحم دل بھی تھے اور بے شمار لوگوں کی مدد کی۔ لوگوں کے

مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے طریقے اس نے اپنی سابقہ پریشاں حال زندگی کے تجربوں سے کشید کئے تھے۔ شروع سے ہی خالد حسین کو ادبی اور تاریخی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اسے اردو اور پنجابی کے سینکڑوں اشعار یاد تھے شیخ سعدی کی ''گلستاں، بوستاں اور خاص کر روسی ادیب رسول حمزہ توف کی کتاب ''میرا داغستان'' اس کی پسندیدہ کتابیں تھیں پنجابی ادب کا تو وہ دلدادہ تھا پنجاب کے گیت اور صوفیوں کا کلام اسے ازبر تھا۔ جس محفل میں بیٹھتا لطیفوں، چٹکلوں اور برمحل اشعار سنا کر محفل کو گلزار بنا دیتا۔ خالد حسین کی یہ زندہ دلی عمر بھر اس کے ساتھ رہی۔

خالد حسین نے جموں کشمیر کے مفاد میں ہمیشہ ایک خاموش سپاہی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں اس خودنوشت سے درجنوں واقعات دُہرائے جا سکتے ہیں۔ خالد حسین کو انگریزی، اردو، ہندی، پنجابی، ڈوگری اور کشمیری وغیرہ کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۷۵ء میں ''اندرا ایکارڈ'' کے بعد شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ بنے تو ان کے دست راست، نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ کو اپنے پرسنل اسسٹنٹ کے لئے ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص کی تلاش ہوئی جو انگریزی اردو کے علاوہ مقامی زبانوں اور تہذیبی رنگا رنگیوں سے بھی واقف ہو۔ ایسا نادر روزگار شخص خالد حسین کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ محمد یوسف ٹینگ کی نشاندہی پر خود بیگ صاحب نے تحریری اور زبانی انٹرویو کے بعد خالد حسین کو منتخب کر لیا۔ مرحوم بیگ صاحب ایک منجھے ہوئے سیاست داں اور وکیل تو تھے ہی انگریزی، اردو اور فارسی زبان و ادب کی بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ خالد حسین کو ان سے سیاست کے اسرار و رموز کے علاوہ، ادب میں اظہار و بیان کی باریکیوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملی۔ لیکن تقریباً پونے چار سال بیگ صاحب کے ساتھ کام کرنے کے بعد جب شیخ صاحب کے داماد اور کابینہ کے وزیر غلام محمد شاہ (گل شاہ) کی حاسدانہ سازشوں کے سبب بیگ صاحب کو استعفیٰ دینا پڑا تو خالد حسین بھی اپنے اصل محکمے میں لوٹ آئے اور ماہنامہ ''دیہات سدھار'' کے 'مُدیر' کا عہدہ سنبھالا۔ ان دنوں خالد حسین کا دفتر Kashmir Administrative Service کے نئے افسران کی سیاسی اور ادبی غور و فکر اور بحث و مباحثہ کا بھی مرکز بن گیا تھا۔ ان نئے افسران میں مشہور اردو شاعر پرتپال سنگھ بیتاب، مُنہ بولی بہن تنویر جہاں، نسیم لنکر، دلیپ سنگھ، سید فضل اللہ، اوتار کرشن رینہ، سُنیتا گپتا اور مسعود سامون وغیرہ شامل تھے۔ ان کے بارے میں راوی نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ سرکاری مراعات کا کبھی ناجائز استعمال نہیں کیا۔ یہ سبھی افسران۔ I.A.S. کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان میں محترمہ تنویر جہاں واقعی خالد حسین کو بھائی مانتی تھیں۔ J.N.U سے انگریزی میں ایم۔اے، اور۔ K.A.S کا امتحان پاس کر کے 'سول سروس' میں آنے والی تنویر جہاں بڑے گھر کی، بڑے دل والی خاتون تھیں۔ گھر سے عمدہ پکوان بنوا کر لاتیں اور خالد حسین، نور شاہ اور سوامی راج بھگت جیسے غریب غربا نما ساتھیوں کو چاؤ سے کھلاتیں اور اکثر جب موڈ ہوتا، کینٹین سے کباب، کانتی اور چائے سے بھی خاطر تواضع کرتیں۔ ایک دن پتہ نہیں کیا معاملہ ہوا کہ تنویر جہاں صاحبہ نے خالد حسین سے کہا کہ 'چائے منگواؤ'۔ خالد صاحب نے عذر پیش کیا کہ ''پیسے نہیں ہیں''۔ تنویر جہاں صاحبہ نے دو چار صلواتیں سنانے کے بعد اسی دفتر میں کام کرنے والے (مشہور افسانہ نگار) نور شاہ سے کہا کہ وہ خالد حسین کی مسکینی (غُربت) دور کرنے کے لئے اسے بلاک ڈیولپمنٹ افسر بنائیں، نور شاہ نے کہا ''یہ ناممکن ہے'' تنویر صاحبہ بھی اڑ گئیں، فائل بنوائی اور ذاتی کد و کاوش اور دلچسپی سے کمشنر سکریٹری جناب محمود الرحمٰن (جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے) سے لے کر متعلقہ وزیر پنچایت جناب محمد اشرف خان سے بہ نفس نفیس مِل کر خالد حسین کو ''بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کے عہدے پر فائز کروایا۔ بحیثیت بی۔ڈی۔او۔ خالد حسین کی پہلی پوسٹنگ ''ارناس'' میں ہوئی۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک وہ ارناس کے بی۔ڈی۔او۔ رہے۔ ۱۹۸۳ء۔ میں فاروق عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس نے اندرا گاندھی کی مرضی کے خلاف، تن تنہا الیکشن لڑ کر بھاری اکثریت حاصل کی اور حکومت بنائی۔ اندرا گاندھی سخت ناراض ہوئیں اور ان کی شہ پر ملک اور خصوصاً جالندھر پنجاب سے ''ہند سماچار، ملاپ، پرتاپ، پنجاب کیسری، اجیت، جگ بانی، نواں زمانہ، وغیرہ اور انگریزی اخبارات'' ٹریبیون، انڈین ایکسپریس، ٹائمز آف انڈیا، اور ہندوستان ٹائمز'' وغیرہ چنڈی گڑھ سے شائع ہوتے تھے۔ یہ سبھی اخبارات ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو 'غدار' اور 'دیش دروہی' ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے۔ پنجابی کے ادیب اور صحافی ہونے کی حیثیت سے، پنجاب کے ادیبوں اور صحافیوں سے خالد حسین کے گہرے مراسم تھے۔ اس صورت حال کو بدلنے، منفی پراپگنڈے کو روکنے اور جموں و کشمیر کی صورت حال اور فاروق عبداللہ کی وطن دوستی کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے اس وقت کے وزیر جناب شفیع اوڑی نے خالد حسین کو ''عوامی رابطہ افسر'' بنا کر جالندھر کے 'انفارمیشن سینٹر' میں تعینات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے 'کمشنر اطلاعات' پنڈت اونکار ناتھ دھر نے اس کی شدید مخالفت کی لیکن شفیع اوڑی بھی اپنے فیصلے پر اڑے رہے اور وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کی منظوری لے کر خالد حسین کو جالندھر اطلاعاتی مرکز کا ''پبلک ریلیشنز افسر'' تعینات کر دیا۔ جالندھر میں دو روز تک اخبارات نے جموں کشمیر کی خبروں کا بائیکاٹ کیا۔ خالد حسین نے خود ہندی اور گورمکھی کی خبروں کی تصحیح کر کے اخبارات میں بھجوائیں۔ خالد حسین نے اپنے دوستوں ''ہند سماچار'' کے نائب مدیر پریم پرکاش کھنوی اور مالک رمیش چوپڑہ کی مدد سے جموں کشمیر سے متعلق افواہوں کی مدلل تردید کی۔ اور اصل حقائق جاننے کے لئے انہیں ریاستی سرکار کی طرف سے شائع کردہ کتابچے بھی دئے۔

گر دیکھا جائے تو پندرہ سال کی عمر سے جدوجہد بھری زندگی کی شروعات کرنے والے خالد حسین ایک Self Made شخص اور افسانہ نگار اور صحافی ہیں، جنہوں نے تمام تر حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرتے ہوئے مثالی انداز میں نہائت آن بان اور شان کے ساتھ ملازمت بھی کی، اپنی ریاست اور

عوام کی بے بہا خدمت بھی کی اور اس دوران اپنے اندر کے کہانی کار کو بھی زندہ رکھا اور پنجابی اور اردو کے افسانوی ادب میں یادگار اضافے بھی کرتے رہے۔

خالد حسین کی اس خودنوشت میں صرف ان کی 'ذات' نہیں، زمین بھی ہے اور زمانہ بھی اسی لئے اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ گذشتہ ستر بہتر برسوں میں جموں کشمیر پر کب کیا گذری، اور فساد اور جہاد سے لے کر الحاق اور آزادی تک کے نام پر مرکز سے لے کر ریاست کے ایوانوں تک، سیاسی سازش، ضمیر فروشی اور غداری کے کیسے کیسے کھیل تماشے ہوئے، تو پھر خالد حسین کی اس خودنوشت سے زیادہ سچی باتیں کہیں کسی اور تصنیف میں مشکل سے ملیں گی۔

خالد حسین نے اپنی یہ خودنوشت اردو کی پہلی جدید داستان، میرا من کی ''باغ و بہار/ چہار درویش کی طرز، تکنیک اور محاورے میں بیان کی ہے۔ زبان بھی میرا من کی طرح ایسی ہے کہ ''لڑکے بالے سبھی کی سمجھ میں آجائے۔ لیکن خالد کے ادبی مشرب میں کسی کی بھی تقلید حرام ہے۔ ان کے یہاں موضوع، تکنیک، اسلوب اور بیانیہ میں ایجادی اور اختراعی رویہ کی وجہ سے ان کا فن اپنی ایک الگ ہی پہچان قائم کرتا ہے جو انہیں سے مخصوص ہے۔ اس خودنوشت کی ابتدائی سطریں خالد حسین کے ہمزاد نے انہیں 'عالمِ برزخ' میں رکھ کر ان کی ذات اور صفات سے قارئین کو متعارف کروایا ہے۔ یہ خالد حسین کا تکنیکی اجتہاد ہے۔ اختراع یہ ہے کہ خالد حسین نے اپنا یہ 'زندگی نامہ' 'خود' کے بجائے کئی راویوں کی زبانی بیان کروا کر 'خودنوشت' کی صنف کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ پہلی راوی خالد حسین کی بڑی بہن زبیدہ بیگم ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں گھر خاندان کے لُٹنے اجڑنے کے بعد خالد حسین اور بچے کھچے اہل خانہ کو پالا پوسا۔ دوسرا راوی، خالد حسین کے بچپن کے دوست نصیر احمد میر ہیں جنہوں نے خالد حسین کے بچپن کی عادتوں اور شرارتوں سے لے کر، جدوجہد بھرے روز و شب کی حکایات بیان کی ہیں۔

اردو اور کشمیری کے مشہور ادیب، شاعر اور ادبی مورخ جناب ولی محمد اسیرؔ خالد حسین کی داستان حیات کے چوتھے راوی ہیں۔ اسیر صاحب اور خالد حسین نے ضلع ڈوڈہ میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے تقریباً چھ سال تک ایک ساتھ کام کیا۔ دونوں ادبی قلم کاروں نے ادبی تنظیم بنا کر ترقیاتی کمشنر جناب اقبال کھانڈے کی مدد سے کئی کُل ہند مشاعرے کروائے، جن میں ملک کے نامور شعرا نے شرکت کی۔ اسیر صاحب نے اپنی روائت میں، ایک انتہائی دردناک سفر کا ذکر کیا ہے جس میں اقبال کھانڈے، خالد حسین اور جموں کشمیر بینک کے ڈسٹرکٹ منیجر عبدالرشید تیلی اور ڈاکٹر ریاض شامل تھے۔ لیکن گھڑ سواری کرتے ہوئے کشتواڑ سے آگے ایک پہاڑی سے گزرتے ہوئے عبدالرشید تیلی گھوڑے کے ساتھ ہی پگڈنڈی سے لُڑکتے ہوئے تقریباً ۶۰۰ فٹ نیچے دریائے چناب کے پاس پہنچ گئے۔ ''یہ منظر دیکھ کر خالد حسین اور ڈاکٹر ریاض ڈھلان کی طرف چھلانگیں مار کر تیلی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ عبدالرشید تیلی کے بازو کی ہڈیاں چکنا چور ہو چکی تھیں۔ پاؤں اور کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے پانی مانگا تو خالد حسین نے ایک مردہ جانور کی کھوپڑی دھو کر تیلی صاحب کو پانی پلایا۔ خالد اور ریاض کسی طرح ہمت کر کے عبدالرشید تیلی کو پگڈنڈی پر لے آئے۔ لیکن تیلی نے دم توڑ دیا۔

اسیر صاحب نے اپنے حصے کی روداد میں خالد حسین کی انسان دوستی اور رحم دلی کے اور بھی کئی واقعات بیان کئے ہیں جو خالد حسین کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خالد حسین ایک نڈر اور بے خوف شخص ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے چنانچہ اسیر کشتواڑی نے لکھا ہے کہ، جن دنوں خالد حسین پونچھ میں اسسٹنٹ کمشنر تھے ''ملیٹینسی'' اپنے شباب پر تھی، لیکن خالد حسین دور دراز علاقوں کے دورے کرتے اور بیروزگار نوجوانوں کو چھوٹے موٹے کام دیتے۔ دوست احباب انہیں اکیلے دورے پر نہ جانے کا مشورہ دیتے لیکن خالد حسین کا جواب ہوتا کہ ''جو گولی اس کے لئے بنی ہے وہ اسے ضرور لگے گی، اور جو نہیں بنی وہ اسے کبھی نہیں لگ سکتی۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔

خالد حسین کی اس تصنیف میں ایک اہم ترین باب ''سورج کا مرثیہ'' کے عنوان سے شامل ہے، جس میں کشمیر کی تقسیم، قبائلی حملہ، ہندوستان کے ساتھ جموں کشمیر کے ''الحاق'' مرکزی حکومت کی وعدہ خلافی، شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری، مہاراجہ کا اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر سے فرار، جموں صوبے میں تقریباً دو لاکھ سینتیس ہزار مسلمانوں اور ستر ہزار ہندوؤں اور سکھوں کی ہلاکت (U.N.O کے مطابق) ہوئی۔

شیخ صاحب کا جموں و کشمیر کی مکمل داخلی خودمختاری کا مطالبہ، ہند پاک جنگ بندی، لائن آف کنٹرول کی نشاندہی، پنڈت نہرو کی ''رائے شماری'' کروانے کی تحریری یقین دہانی، ڈکسن (Sir Owen Dixan) پلان، ''دلی ایگریمنٹ'' میں ٹال مٹول، بخشی غلام محمد، شمس الدین اور غلام محمد صادق کی حکمرانی، صدر ریاست کی جگہ گورنر اور وزیراعظم کی جگہ وزیراعلیٰ بنائے جانے کا فیصلہ، ریاست میں مرکزی قوانین کا نفاذ، اور شیخ محمد عبداللہ پر غداری کا مقدمہ وغیرہ واقعات و سانحات کا ذکر پوری غیر جانبداری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس باب کے یہ چند جملے تو حد درجہ عبرت ناک ہیں کہ ''جو شخص ۱۹۵۳ء سے پہلے وزیراعظم تھا اور پنڈت نہرو جس کو ایک سربراہ مملکت کے طور پر استقبال کرنے ایئرپورٹ آتے تھے، جو کشمیری عوام کا ہر دل عزیز لیڈر تھا، جس نے 'رائے شماری' کرانے کے لئے ۲۲ سال جیل میں کاٹے، جس پر مرکزی سرکار نے 'غداری' کا مقدمہ چلایا۔ وہی شیخ عبداللہ ایک سمجھوتے کے تحت وزیراعلیٰ بن گیا، ہائے رے سیاست تیرے رنگ نرالے''۔ ریاست جموں کشمیر کے مسئلے کو سیدھے سادے انداز میں سمجھنے میں خالد حسین کی خودنوشت کا یہ باب جتنا معاون ثابت ہوگا شاید تاریخ کی دوسری کتابوں میں نہ ہو سکے۔

خالد حسین کی داستان حیات کے ایک راوی جموں کشمیر کے شہرت یافتہ افسانہ نگار جناب نورشاہ بھی ہیں۔ ''سخن شناسی'' کے عنوان سے خالد حسین کی سخن پروری۔ یعنی افسانہ نگاری (اور صحافت) پر روشنی ڈالی ہے۔ نورشاہ اور خالد

حسین محکمہ زراعت کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔نورشاہ ماہنامہ دیہات سدھار کے مدیر تھے اور خالد حسین نائب مدیر۔دونوں مانے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔نورشاہ کو ’رومانیت‘ سے ’حقیقت نگاری تک آتے آتے بہت وقت لگا لیکن خالد حسین کی افسانہ نگاری کا ’انکُر‘ پھوٹا ہی ’سچ‘ کے ’منتھن‘ سے۔جہاں پر سچ کی اصل سچائیاں کُھل کر سامنے نہیں آپاتیں ،اور سچائیوں کا جاننا بھی کافی نہیں ہوتا ،وہیں سے خالد حسین کے افسانہ کی شروعات ہوتی ہے۔خالد حسین کی یہ روش اکثر ان کے لئے مصائب بھی کھڑی کرتی ہے۔خالد صاحب کا پہلا اردو افسانہ ’’گھر کی جنت‘‘ ماہنامہ ’’دیہات سدھار‘‘ کے اکتوبر نومبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔اس افسانے کی مقبولیت کے بعد خالد حسین کے کئی اور اردو افسانے شائع ہوئے۔۱۹۷۱ء.کے اوائل میں خالد حسین کا ایک افسانہ ’’شمع ہر رنگ میں جلتی ہے ‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا۔اس افسانہ کے چھپتے ہی ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔یہ افسانہ سچے واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔خالد حسین پر مقدمہ چلایا گیا۔لیکن نو مہینوں کے بعد وہ ہر غلط الزام سے بری ہو گئے اور نوکری پر بھی باعزت واپس لوٹ آئے۔لیکن ان کی اہلیہ کے سارے زیورات مقدمہ بازی کی نذر ہو گئے۔ خالد حسین کو ان کی ایمانداری اور انصاف پسندی کے لئے ایسے اور بھی کئی عذابوں سے گذرنا پڑا مثلاً جن دنوں خالد حسین ’’پونچھ‘‘ میں ڈپٹی کمشنر تھے، ’’رہبر تعلیم‘‘ کی اسکیم آئی۔ایک بار سورن کوٹ کے ایم.ایل.اے اور وزیر مملکت جناب مشتاق بخاری کے چچازاد بھائی،سورن کوٹ کے میڈیکل افسر ڈاکٹر ممتاز بخاری نے بغیر اختیارات ۴۵.ناجائز تقرریاں کی تھیں،اپنی بیوی کو بھی مِڈ وائف کی آسامی پر لگایا تھا۔خالد حسین نے جانکاری ملتے ہی کارروائی کی۔ممتاز بخاری کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی۔انتقام کے طور پر خالد حسین پر بھی کئی جھوٹے الزامات عائد کر دئے گئے۔مثلاً یہ کہ رہبر تعلیم کے تحت استاد لگانے کے لئے خالد حسین نے فی امیدوار بیس ہزار روپئے لئے ہیں۔دوئم خالد حسین نے مِلی ٹنٹوں کو بندوق کے لائسنس جاری کئے۔سوئم اساتذہ کی تقرری میں بے ضابطگی کی گئی ہے۔ڈائریکٹر جنرل گور بچن جگت جی نے ہریانہ سے پولس ٹیم بُلوا کر تفتیش کروائی۔پندرہ دنوں کے بعد چیف سکریٹری اور ڈاکٹر گربچن جگت نے خالد حسین کو بتایا کہ ان کے خلاف تمام الزامات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ’’اس طرح کی الزام تراشیاں ملازموں پر لگتی رہتی ہیں لیکن ایمان داری اور ضابطے کے مطابق ڈیوٹی سرانجام دینے والوں کو صرف اپنے مالک سے ڈرنا چاہیئے۔‘‘

لیکن ایسے سارے معاملات نے خالد حسین کے اندر کے افسانہ نگار کو اور زیادہ پُختہ اور پُر اعتماد بنا دیا۔اسی دوران ان کے دوست ہر بھجن سنگھ ساگر نے خالد حسین کو پنجابی میں بھی لکھنے کا مشورہ دیا۔خالد حسین نے پنجابی میں نئے انداز کا اپنا پہلا افسانہ ’’ٹھنڈی کانگڑی‘‘ کے عنوان سے لکھا۔اور اسے بین الاقوامی شہرت کی مالک ،بے باک شاعرہ اور دانشور محترمہ امرتا پریتم کی کی ادارت میں شائع ہونے والے پنجابی کے مشہور رسالہ ’’ناگ منی‘ میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔’ناگمنی‘ میں خالد حسین کا افسانہ نمایاں طور پر شائع ہونے کے بعد اس افسانہ کو لاہور کے مشہور ادیب اور شاعر احمد سلیم نے اپنے ماہنامہ ’’گونج‘‘ میں ’شاہ مکھی ‘(فارسی) رسمِ خط میں شائع کیا۔اس ایک افسانہ کی اشاعت سے ہی بحیثیت پنجابی افسانہ نگار خالد حسین کی دھوم مچ گئی۔اس کے بعد امرتا پریتم کی فرمائش پر خالد کی کئی کہانیاں ’’ناگ منی‘‘ میں شائع ہوئیں امرتا پریتم نے خالد حسین کا ایک انٹرویو بھی شائع کیا۔پاکستان کے پنجابی رسائل میں بھی خالد حسین کے افسانے تواتر سے شائع ہونے لگے۔اس طرح خالد حسین پنجابی قارئین کے لئے ایک جانا پہچانا نام بن گئے اور ان کی افسانہ نگاری پر مضامین لکھے جانے لگے۔اس دوران خالد حسین اردو میں بھی افسانے لکھتے رہے۔ہندوستان اور پاکستان کا شاید ہی کوئی قابل ذکر پنجابی اور اردو کا رسالہ ہو گا جس میں خالد کے افسانے نہ شائع ہوتے ہوں۔ہندو پاک کے کئی کُل ہند اور ہند پاک ادبی کانفرنسوں میں خالد حسین نے حصہ لیا۔۱۹۷۵ء.میں خالد حسین کو پنجابی ساہتیہ سبھا سری نگر کا صدر منتخب کیا گیا۔اس وقت خالد کی عمر صرف تیس سال تھی لیکن اس کی پچاس سے زیادہ پنجابی کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔کالجوں،یونیورسیٹیوں میں اس کے فن کا ڈنکا بج رہا تھا۔اسی دوران خالد حسین نے سری نگر میں ’’دو روزہ پنجابی کانفرنس منعقد کروائی۔اس تاریخی کانفرنس میں ملک بھر سے ڈھائی سو سے زیادہ شاعروں ادیبوں ،دانشوروں ،پروفیسروں اور تحقیق کاروں نے شرکت کی۔کانفرنس کی صدارت شیخ محمد عبداللہ نے کی جبکہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ مہمان خصوصی تھے۔اس کانفرنس سے پنجاب اور جموں کشمیر کے آپسی رشتے تو مزید گہرے ہوئے ہی، پنجابی اور اردو ادب اور ادیبوں کے مابین بھی قربتیں بڑھیں۔حالانکہ اس کانفرنس کو ناکام بنانے کی سازشیں بھی کی گئیں لیکن خالد حسین کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے آخر کار دشمن بھی دوست بن کر آگئے اور کانفرنس کو کامیاب بنانے میں خالد حسین کے ساتھ تعاون کیا۔

خالد حسین نے اپنی زندگی میں دوست اور دوستی بہت کمائی ہے۔اس خودنوشت میں خالد حسین نے بچپن سے لے کر نوجوانی تک اور پھر ریٹائرمنٹ اور اسکے بعد کے دنوں کے سینکڑوں دوستوں کا ذکر کیا ہے۔لیکن جگری اپنائیت کی غیر معمولی حرارت جن دوستوں کے ذکر میں ملتی ہے ان میں چودھری تاج محی الدین، اقبال کھانڈے،فخر زماں،افضل ساحر۔۔۔وغیرہ شامل ہیں۔تاج محی الدین، خالد حسین کے بچپن کے جگری دوست ہیں۔تاج محی الدین کئی بار الیکشن لڑے، ہارے بھی اور جیتے بھی۔دو بار وزارت بھی سنبھالی۔تاج محی الدین نے اپنی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ریاست کے مفاد میں ’اوڑی‘ اور ’سلال پروجیکٹ‘ اور ’ولر بیراج کی تعمیر جیسے کئی انقلابی اقدامات کئے،خاص طور پر N.H.P.C سے معاہدہ کر کے ریاست میں ’بجلی‘ اور آب پاشی کے انتظام کو بہتر بنایا اور آبیانہ وصول کیا جو کہ ایک تاریخی کامیابی ہے۔خالد حسین دعوے کے ساتھ ہیں کہ ’’تاج میرے اچھے برے وقتوں کا دوست ہے۔شاید میں واحد ایسا دوست ہوں جس پر

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ کیجیے

کہانی ہو تو ایسی ہو

ڈاکٹر سید تقی عابدی
(کینیڈا)

جس طرح ہر انسان ایک نیا چہرا اور ایک نیا رجحان لے کے دُنیا میں آتا ہے اُسی طرح تخلیقی ادب بھی ہر زمان و مکان میں نئے افکار، گوناگوں موضوعات اور جذبات و تاثیرات سے اقلیم سخن کو لبریز کر دیتا ہے چناں چہ خالد حسین کی کہانیوں کا مجموعہ ''جنّت گرہن'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

خالد حسین ایک فطری معتبر کہنہ مشق تخلیق کار ہیں جن کو اپنے فن پر کامل گرفت اور مہارت حاصل ہے ان کے کئی اُردو، پنجابی افسانوی مجموعوں کے علاوہ مختلف عمدہ مضامین، تراجم اور انتخابات نے انھیں منتخب افسانہ نگاروں اور مقبول کہانی نویسوں، عمدہ ادیبوں اور ماہر مترجموں میں شمار کیا ہے۔

خالد حسین کی کہانیاں دِل رُبا، دِل کش، دِل گداز، دِل سوز، دِل درد اور دِل میں اتر جانے والی کہانیاں ہیں جو مدتوں دِل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں اور پڑھنے والے کی زندگی میں جذبات کی لہر بن کر دوڑتی رہتی ہیں۔

قدیم داستانوں اور کہانیوں میں عموماً درباروں اور دُرباروں کی رنگین زندگی کے ساتھ بادشاہوں، امراؤں، پریوں، دیوتاؤں اور جنوں کے قصّے اور اثرات ہمیشہ شامل رہے۔ یہاں منطق اور استدلال کا عمل دخل کم تھا، یہاں عموماً تفریح اور طبیعت کا صرف سرور پیش نظر تھا اس لیے زیادہ تر قدیم کہانیاں ارتقائی اذہان کو اپنی گرفت میں نہ لے سکیں اور اپنے دور ہی میں کتابوں میں دفن ہو گئیں یا دیمک کی غذا بن کر خاک ہو گئیں اور آج چند مقبروں میں تاریخی کتبوں کی صورت میں موجود ہیں، جیسے انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی''، میر امن کی ''باغ و بہار''، ''چہار درویش''، حیدر بخش حیدری کی ''آرایشِ محفل''، خلیل علی خاں اشک کی ''امیر حمزہ''، بہادر علی حسینی کی ''بے نظیر''، للّو رام کی ''بیتال پچیسی''، مہجور کی ''نورتن''، نیم چند کشمیری کی ''گلِ صنوبر'' اور ''الف لیلیٰ''، ''طلسم ہوش رُبا''، ''فسانۂ عجائب''، ''فسانۂ آزاد'' وغیرہ وغیرہ۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ان داستانوں اور کہانیوں میں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کا فقدان ہو بلکہ اس طرف توجہ کم اور تفریحات کی جانب تخلیق نگار کی توانائی زیادہ صرف ہوئی جس کے باوجود ابتدائی دور میں ڈپٹی نذیر احمد، سرشار اور شرر نے اور اس کے دوسرے دور میں مرزا رسوا اور محمد سعید اور درجنوں دوسرے ناول نگاروں نے داستان گوئی کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے کہانی کو حقیقت سے نزدیک اور فنّی تقاضوں سے روشناس کروایا۔ اس کو سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا آئینہ بنایا اور اصلاح کا کام اس کے سپرد کیا چناں چہ ناول کئی راستے طے کر کے راشد الخیری، سجاد حسین وغیرہ سے ہوتے ہوئے پریم چند پر پہنچ کر تکمیل کے مرحلے پر پہنچا۔ پریم چند نے فرد اور ملّت، سماج اور سیاست کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد ناول میں فکر اور جذبات کے ساتھ خلوص اور اصلاح پسندی کے رویّہ سے ناول کے چہرے کو درخشاں کر دیا جو آگے منٹو اور قرۃ العین حیدر کی پہچان اور شناخت بنی۔

زندگی کی تیز رفتار اور مشینی سماج نے ناول کو مختصر کر کے اس کے نقطۂ نظر اور کہانی کو ایک نئی صورت دی جسے ''مختصر افسانہ'' کا نام دیا گیا جس کے پہلے مستند افسانہ نویس پریم چند نہیں بلکہ سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ 1900ء میں ''معارف'' میں چھپ چکا تھا۔ یہاں اس مختصر تحریر میں اس تمہید کی ضرورت اِس لیے بھی ضروری تھی کہ ہم کئی صدیوں میں پھیلے ہوئے کہانی کے اذہان اور ان کے رجحانوں کو سمیٹ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح ہر شخص کا چہرہ منفرد ہوتا ہے اُسی طرح ہر کہانی کی تصویر اور اس کا تاثر جدا ہوتا ہے اور افسانہ نگار کا ذہن جو مبدۂ تخیّل ہوتا ہے دراصل ایک نگار خانہ ہوتا ہے جس میں ہر وقت ایک نئے نقش کی نقاشی اُبھرتی رہتی ہے۔

خالد حسین کی کہانیوں میں ان کے وسیع مطالعے سے کئی ایسے تاریخی واقعات بھی ظاہر ہوتے ہیں جو شاید دوسروں کی یادداشت کے ملبوں سے کبھی برآمد نہ ہوں۔ ان کی ''عشق ملنگی'' کہانی جو اُردو کہانیوں کی صف اوّل میں رکھی جائے گی جموں کے اُردو بازار کی جھلک سینے، الفاظ کا چناؤ، مضامین کا نبھاؤ، مطالب کا بہاؤ جیسے مضامین کی صرف سپاٹ واقعات نگاری نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی فلم آنکھوں اور کانوں کے ذریعے ذہن میں نقش ہوتی جا رہی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اُردو بازار بڑا رونق والا بازار تھا۔ یہاں کسبّیوں اور ڈیرے دارنیوں کے چوبارے تھے اور چوباروں کے نیچے پھولوں، عطر، پان، سگریٹ، چائے، دودھ دہی، مٹھائی اور نہاری کی دُکانیں تھیں۔ شیشے، کنگے، پراندے، چُوڑیاں، کنگن، جھمکے اور چھلّے کی چھابڑیاں تھیں۔ برف، گُلفی، شربت، سوڈا اور نمبو پانی کی ریڑھیاں تھیں۔ افیم، چرس، گانجا اور شراب بے حساب دستیاب تھی۔ اس بازار میں ملکہ پکھراج، اُس کی پھوپھیاں نیلو اور فیلو، ماموں زاد بہن زنیرہ، بھاگو پیرنی کی بیٹی گوہر جان، اقبال بالی، تاجی، زُمّرد، سردار بیگم اور موتی جان اپنے حُسن کے جلوے لُٹاتیں اور موج مستی کے شوقین نوجوانوں، خضاب رنگے اور مہندی رچے عاشقوں کی جیبیں ہلکی کراتیں۔ گانے بجانے کی محفلیں رت جگا کرتیں۔ موتیے، گلاب اور مُول سری کے پھولوں کی خشبوئیں دِل رُبائی کرتیں۔ الھڑ جوانیوں اور سُریلی آوازوں کا سنگم قیامت ڈھاتا اور من چلے فرشتوں کو ترساتا۔

یہ شاید سن چالیس کی بات ہے کہ پٹیالہ گھرانے کے مشہور گائیک اور کلاسیکی سنگیت کے ماہر خان صاحب اُستاد عاشق علی خان پٹیالے سے جموں آئے تھے۔ اُنھوں نے ریذیڈنسی روڈ پر بنی کشمیر سوپ فیکٹری کی چھت پر گیت سنگیت کی محفل میں شرکت کی اور اپنی گائیکی کا کمال دکھایا۔ اُستاد عاشق علی خان صاحب کو

سننے کے لیے ملکہ پکھراج، گوہر جان، سردار بیگم اور موتی جان بھی آئیں تھی۔ گوہر جان اور سردار بیگم نے تواز راہِ عقیدت خان صاحب کے پاؤں بھی دبائے تھے۔ وہاں کسی نے خان صاحب سے فرمائش کی کہ وہ کُندن لال سہگل کی راگ گندھاری میں گائی ہوئی ٹھمری ''جُھولنا جُھلاؤری، انبوا کی ڈالی پہ کوئل بولے'' سُنائیں۔ خان صاحب ہلکا سا مُسکرائے اور پھر اُنھوں نے گندھاری شروع کی اور اپنی آواز سے محفل کو مست بنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کے گندھاری کا اصل روپ کیا ہے اور پٹیالہ گھرانے کی لَے کاری کسے کہتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے ایک دادرا سُنایا۔ بول تھے۔ ''کہاں گری رے مورے ماتھے کی بندیا''۔ محفل ختم ہوئی۔ خان صاحب کی عزّت افزائی کی گئی۔ انعام واکرام سے نوازا گیا۔ شال دوشالے پیش کیے گئے اور کئی رئیس گھرانوں میں اُن کی دعوتیں بھی ہوئی۔ ملکہ پکھراج نے اُن کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور پھر سنگیت کی دُنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔''

کالے خان ایک معمولی ٹانگہ چلانے والا جوان ہے جو گامی نائی کی دوکان کے مقابل چوبارے میں گانے بجانے اور رقص کرنے والی حسینہ فیروزہ کا عاشق ہو جاتا ہے لیکن فیروزہ اس کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی، یہاں کہانی نویس نے گامی نائی سے جو بول بلوائے ہیں وہ کہاوتوں، محاوروں اور دِل سے نکلے ہوئے وہ سُر اور نغمے ہیں جو ہر حساس دل کے تاروں کو چھیڑ کر اس کی سنگیت کو اپنے سنگ کر لیتے ہیں۔ سینے!

''فیروزہ بی بی! کالے خان تمہارا سچا عاشق ہے۔ وہ تمھیں دِل کی دولت دے سکتا ہے۔ جان تمہارے نام کر سکتا ہے۔ اُس کا عشق اذان کی طرح پاک ہے۔ اُسے تمہارے حُسن نے ٹھگ لیا ہے۔ اُسے تمھیں دیکھنے کا چسکا لگ گیا ہے۔ وہ تڑپ رہا ہے اُس کی زندگی خاک میں نہ ملا، ورنہ اُس کے دِل کی دہلیز کو دیمک کھا جائے گی اور آنکھوں کا کوٹھا ٹپک پڑے گا۔ وہ سرد، گرم موسم میں تمہارا ساتھ دے گا۔ فیروزہ بی بی! جوبن کے دن چار، پھر نہیں ملتے یار، اور جب تن طنبورے کی تاریں ڈھیلی ہو جائیں تو عمر کی سانس اُنھیں کس نہیں سکتی۔ مگر کالے خان تیز دوپہر میں تمہاری گھنی چھاؤں بنے گا اور ڈھلتی شام میں تمہارا سہارا۔ بی بی! رُوپ سُروپ کی مایا کا مان نہ کر۔ یہ سب چھل فریب ہے، مگر اُس کا عشق امبری سیب ہے۔ میٹھا اور جھرنے کی طرح پاک وصاف۔ فیروزہ! تمہاری دُنیا جھوٹ ہے، اُس کی دُنیا سچ۔ اور جھوٹ سے بڑا چھل کوئی نہیں جب کہ سچ سے میٹھا پھل کوئی نہیں۔ یہ رئیس زادے اور وڈیرے جسموں کے بھوکے ہوتے ہیں پر کالے خان تمہاری رُوح کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ تمھیں اپنانا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ بے رُخی چھوڑ۔ حُسن کا گمان نہ کر۔ یہ مٹی میں مل جاتا ہے باقی صرف اللہ کا نام رہتا ہے۔''

اُدھر کالے خان کو گامی نائی سمجھاتا ہے۔ ''تمھیں یہ کون سا عشق کا جن چڑ گیا کہ فیروزہ کے چولہے کی راکھ چھان رہے ہو۔ ان کوٹھے والیوں کے چکروں میں نہ پڑو، ہوش کرو۔ عقل کو ناخن نہ مارو اور دل کے تار کُھرچنے بند کرو، خواہشوں کی بستی میں صرف اندھیرا ہوتا ہے۔ اس پر بھی کالے خان نہیں مانتا اور فیروزہ سے مل کر کہتا ہے۔

''میں اپنے دِل کے کہنے پر تم سے پیار کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اپنی محبّت کا شربت پلا۔ تجھے بسم اللہ کا ثواب ملے گا۔ فیروزہ! میری دِل کی کُٹیا میں بڑی سیلن ہے تو موہ کی اگنی بال تا کہ میں ہو جاؤں نہال۔''

اس پر فیروزہ کہتی ہے:-

''خبردار، جو دوبارہ یہاں قدم رکھا، حرام کے تُخم۔ خنزیر کی اولاد۔ تم جاتے ہو یا بُلاؤں مُشٹنڈوں کو۔'' فیروزہ کی اونچی آوازیں سُن کر ایک بھڑوا آیا اور اُس نے کالے خان کو دھکے مار کر کوٹھے سے باہر نکال دیا''۔

ہم نے اس کہانی کے مکالموں اور جملوں کو اس لیے پیش کیا ہے کہ یہاں پلاٹ مسلسل آگے بڑھتے ہوئے کہانی کی دلچسپی اور حیرت کو بڑھا رہا ہے یہاں الفاظ سے زیادہ اس کے معنی مضمون میں رنگ و بو شامل کر رہے ہیں۔ الفاظ کا استعمال لہجوں کا اختلاف یہ بتاتا ہے کہ خالد حسین کو لفظوں پر وہ قدرت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق پر، چناں چہ جب وہ محبت اور رحم و کرم کی بات کرتے ہیں تو الفاظ نرم عجز و انکسار سے گردن جھکائے ہوتے ہیں مگر جب وہ گرم اور شعلہ ور کریکٹر کے منہ سے کہلواتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ انگارے اور آتش پیکر بن گئے ہیں جو بڑی تخلیق کی شناخت ہے۔

اس کہانی ''عشق ملنگی'' میں عشق کا انجام، زندگی کے درد اور ہجرت کے سوز و گداز کا خوب صورت ملاپ ہے جس میں عمدہ جدید محاورے، مقامی الفاظ کی خوشبو کے علاوہ دِل میں پیوست ہونے والے الفاظ کے تیروں کی کمی نہیں۔ کہانی کے آخیر میں نارووال میں پتھر پھوڑنے والا کالے خان کا جملہ ہر حساس دِل کو توڑنے کے لیے کافی ہے جو کامیاب کہانی کی نشانی ہے۔ ''بابو! یہ پتھر تو میں توڑ لیتا ہوں پر فیروزہ کے دل کا پتھر مجھ سے ٹوٹ نہیں سکا۔''

راجندر سنگھ بیدی مختصر افسانے اور کہانی کے ذیل لکھتے ہیں: ''کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ آتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور انسانی اساس کا احساس بن جاتا ہے اور جب کہانی کا ترنم آپ کے بدن میں چلا آئے تو آپ کو سڑک کے ہر کونے کھدرے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کہانی نہیں ڈھونڈیں گے۔ کہانی اٹھتے بیٹھتے پھرتے چلتے سوتے جاگتے آپ کو آلے گی۔'' خالد حسین کی ان دو درجن کہانیوں کو پڑھ کر یہی احساس ہو رہا ہے کہانی کا فن ان کے رگ و پے میں بھرا پڑا ہے، انھیں کہانی کی تلاش نہیں بلکہ کہانی ان کی تلاش میں ہے کہ اس کے خاکے میں یہ اپنی تخلیق کا رنگ بھریں اور اپنے ماحول معاشرے اور زندگی کے ساتھ اور اطراف فضاؤں میں بکھری جوان کہی بے زبان نشانیاں ہیں ان کو الفاظ کے رشتے میں پرو کر کہانیاں بنا دیں بلکہ اُسی طرح جیسے مجسمہ ساز چٹان کے اندر صنم دیکھ کر اُسے تیشہ سے آزاد کر لیتا ہے۔

خالد حسین نے انسانی قدروں کو پیش کرنے میں کسی عصبیت یا ایجنڈے سے کام نہیں لیا وہ معاشرے کی اچھائیوں، کمیوں اور خامیوں کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ خالد ستم زدہ محرومین کے زخموں کا مرہم تلاش کرتے ہیں۔ خالد کی بیشتر کہانیوں میں وطن کی چاہت مٹی کی محبّت ہجرت کا کرب اغیار اور رشتہ داروں کی بے اعتنائی وغیرہ شامل ہے۔ ''یادرفتگان'' میں کہانی کا محور رشتے ناتوں کی بے رنگی کا نقش ہے جہاں لہو سفید اور کوکھ کا رشتہ راکھ بن جاتا ہے۔ یہاں بیان میں متانت کے ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ ''عام ساسوں کی طرح اس کی ساس بھی شروع شروع میں انڈے دینی والی مرغی کی طرح اس کے ساتھ کڑ کڑ کرتی رہی۔''

خالد حسین کہانی سے کئی کام لیتے ہیں یہاں زبان دانی کے کمال سے بلیغ بات آسانی سے عامی اور عالم کی فکر میں سما جاتی ہے۔ جدید محلی کہاوتیں ہوں جیسے ''تھنوں سے دھویا ہوا دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا۔'' یا ''ایسے سنجوگ بنے کہ آنسوؤں کے گلے آنسو لگے۔'' قتل و غارت کے ذیل میں یہ جملے انسانی فطرت کی شناخت کو کس طرح پیش کرتے ہیں۔ ''زمین کی یہی خصلت ہوتی ہے کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے لاشیں مانگتی ہے اور موت کا کام ہے کہ کھلونے توڑتی رہے اور زمین کا پیٹ بھرتی رہے۔

خالد حسین کی کہانیوں میں بناوٹ نہیں وہ کہانی کی سجاوٹ میں ابرو کی آرایش کرتے ہوئے آنکھ نہیں پھوڑتے بلکہ کرداروں کو مرحلۂ اوّل ہی سے موضوع کے قالب میں ڈھالنے کا فن جانتے ہیں۔ عورت پر ظلم اور اس کی ناقدری ہمارے معاشرے کی جہالت کا نتیجہ بھی ہے ''اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رگ'' میں کہانی نویس کو ایک ایسے بداخلاق بے ترتیب جوان کی تصویر کشی کرنی تھی کہ کہانی کی ریل پٹریوں پر چڑھ جائے، یہاں اس کہانی کے آغاز ہی میں اُس کے کرتوت کے ظاہر کرنے کے لیے روزمّرہ، تجنیس، مترادف الفاظ کا سہارا لیا گیا۔ یہ تاثیراتی لحاظ سے کامیاب تجربہ ہے۔

قادرا اپنی قسم کا ایک عجیب، سرِ پھرا اور ہٹیلا جوان تھا۔ بھینسے جیسی چال اور گینڈے جیسی کھال۔ ذلالت رزالت، اور خجالت کی کھائی میں غرق، زبان کا کڑوا۔ قادرا چھوٹی چھوٹی باتوں پر رگیں پُھلا لیتا۔ جب دیکھو دانت پیستا رہتا اور مغلظات بکتا رہتا۔ کبھی کسی کی داڑھی پر ہاتھ ڈالتا تو کبھی کسی کی پگڑی اُچھالتا۔ اُس میں ذرا بھی شرافت نہیں تھی۔ ہمیشہ غلط حرکتیں کرتا رہتا اور رام رولا ڈالے رکھتا۔ وہ آوارہ سانڈ، آگ نِگلتا اور انگارے اُگلتا اور اپنے اندر کی سڑاند باہر نکالتا رہتا۔ قادرا روز صبح تڑکے اپنی بیوی رابعہ کو صلواتیں سُنانی شروع کرتا۔ اُسے پھٹکارتا اور دُھتکارتا رہتا۔ اُس کے دانت گِنتا رہتا۔ لعن طعن کرتا رہتا اور لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر کے اسے لہولہان کر دیتا۔ معمولی سی بات پر اُس کے ماں باپ کو گالیاں بکتا۔ رابعہ درد سے کراہتی رہتی۔ کبھی اُس کا چہرہ سُوجا ہوتا تو کبھی ہونٹ زخمی ہوتے۔ وہ بے چاری اپنے جسم کی چوٹوں کو ٹکوریں کرتی اور زخموں پر مرہم لگاتی۔ مختصر یہ کہ قادرا ہر وقت رابعہ کے ساتھ کڑھ کڑھ لگائی رکھتا اور اسے جُوتیوں میں روٹی پروستا۔ رابعہ کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ''اندر کُتا باہر کا گ، بچ کے جاؤں کہاں بھاگ۔'' وہ ضدی سانڈ کبھی پیار کی بات نہیں کرتا تھا۔ اکثر اس پر دھونس جماتا اور کہتا، ''سالی کُتیا: تیری اوقات ہی کیا ہے۔ تو تو تین لفظوں کی مار ہے۔۔۔''

خالد حسین کی کہانیوں میں کئی زبان اور بیان کی خوبیاں ہیں۔ کہانی کے لوازمات کے علاوہ موضوع کے وسیع کینوس پر سطروں سے زیادہ سطروں کے مابین مطالب ذہن اور جذبے کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں جن کو عبارت کے پنجرے میں قید کرنا آسان نہیں۔ ہم انھیں محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے یہ ان کی کہانیوں کی گیرائی اور گہرائی ہے۔ اس تحریر کو سمیٹتے ہوئے ہم خالد کی کہانیوں کے چند اہم نکات اور محاسن یہاں بیان کر دیتے ہیں جن کی روشنی میں آیندہ اسکالرس ان کی تخلیقات میں اُن پھولوں کے نام بھی دیں گے جو ان کے گلشن میں ابھی بے نام ہیں۔ اس گلزار ہست و بود میں لاکھوں پھول ابھی ایسے موجود ہیں جن کے نام ابھی دُنیا نے نہیں دیئے ہیں۔

خالد حسین کی کہانیوں میں پلاٹ یعنی کہانی کی ترتیب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس سے ان کی کہانیوں کی شناخت بھی کی جا سکتی ہے۔ کہانی میں اسی وجہ سے قاری کی دلچسپی اور ذہنی تفریح باقی رہتی ہے۔ خالد کی کہانیوں کی انفرادیت اور عمدگی یہ بھی ہے کہ کہانی کا پلاٹ ایک خاص اور مستحکم نقطۂ نظر کے اطراف گردش کرتا رہتا ہے جس میں ایسے کرداروں کو ہی پیش کیا جاتا ہے جو اس خاص نقطۂ نظر کو گہرا رنگ دے سکیں اور اس طرح کہانی کے کہانی پن کو مزید رنگیں کر سکیں۔

خالد حسین کی کہانیوں کی زبان اُردوئے محلّہ کی شیریں اور سادہ زبان ہے اس میں پنجابی الفاظ اور لہجے کی مٹھاس کام دہن کو شیریں کر دیتی ہے۔ پنجابی محاورے، کشمیری کہاوتیں اور اُردو کی ضرب المثلیں کہانی کے دسترخوان کو خوش ذائقہ اور خوش رنگ بنا دیتی ہیں بلکہ زبان پر اس کا چٹخارہ بڑی مدت تک باقی رہتا ہے۔

اگرچہ بعض کہانیاں طویل ہیں اور بعض مختصر لیکن ان کی کہانیوں کی دِل پذیری اس لیے بھی قایم رہتی ہے کہ ان کے کرداروں کی تراش خراش پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور بعض لکھاریوں کے پاس اس پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے کہانی رپورتاژ یا خاکہ نویسی بن جاتی ہے۔

خالد حسین کی کہانیوں میں احساسات کی ندی اور جذبات کا دریا، قدرتی بہاؤ کی طرح ہے، جو کوہ دشت سے گزرتے ہیں چناں چہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے آہستہ اور تیز سکوت اور شور کے ساتھ رواں دواں نظر آتے ہیں جس میں کہانی سے سچائی اور صداقت چھلکتی رہتی ہے اور اسی سے کہانی پن باقی رہتا ہے۔ جو کہانی نگار کی فطری اپج کی شناخت بھی ہے۔

خالد حسین کی کہانیوں کی خوب صورتی یہ بھی ہے کہ وہ کہانی کے تاثر کو، جو اُن پر مسلط ہوتا ہے اُسی طرح سے سننے والے یا کہانی کے پڑھنے والے پر منتقل

کردیتے ہیں، یہی نہیں بلکہ وہ کہانی میں جس طرح زندگی کو دکھانا چاہتے ہیں اس کا اظہار بھی کردیتے ہیں جو ایک مثبت اور روشن وژن کی علامت بھی ہے۔

خالد کی کہانیوں میں خطیبانہ، واعظانہ یا جارحانہ انداز بیان نہیں۔ان کی کہانیوں میں جو کردار نگاری کی دلکشی اور حیرت زدگی ہے اُس کی وجہ ان کریکٹروں کی ذہنی نفسیات سے تعلق بھی ہے۔

خالد حسین کی کہانیوں کی بول چال، زبان اور اُسلوب جدید طرز پر مشتمل ہے، پرانی کہانیوں کے متروک الفاظ اور محاورے نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے کہانیاں اکیسویں صدی سے جڑی ہوئی ہیں۔ان کہانیوں میں غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش ہے۔

ان کہانیوں میں زندگی چھلکتی ہے، یہاں ہر فرد میں نیکی اور اچھائی کی جستجو ہے یہاں ع: ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' کی تلقین ہے۔یہاں سکّے کے دونوں رخ دکھانے اور دیکھنے کی توفیق ہے۔یہاں مذہبی صحیفوں میں محبت اخوت اور انسانیت کی تلاش کی گئی ہے۔یہاں انسانی حقوق کی پائمالی اور انصاف کی کمی پر سخت احتجاج کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

آخیر میں امید ہے کہ خالد حسین اسی طرح کہانیاں برصغیر کی فضاؤں میں بکھیرتے رہیں کیوں کہ یہ انسانیت کے زخموں کا مرہم ہیں اور یہ دلوں میں بس جاتی ہیں اور

ع جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہیں

- بقیہ -

عشق سمندر

تاج نے مکمل بھروسہ کیا، بھرپور اعتماد کیا، میں نے بھی اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے دیا۔ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم راز ہیں اور زندگی کے اہم فیصلے باہمی مشورے سے کرتے ہیں۔ایسے سچے دوست اللہ کسی کسی کو ہی بخشتا ہے۔

تاج محی الدین کی طرح جناب اقبال کھانڈے بھی خالد حسین کے عزیز ترین دوست تھے۔جموں کشمیر انتظامیہ'' کی تاریخ میں اقبال کھانڈے سے زیادہ ذہین، زیرک، فعال، حوصلہ مند، ایمان دار اور جگر والا ADMINISTRATER اس سے پہلے اور بعد کوئی دوسرا نہیں ہوا۔۱۹۸۵ء میں اقبال کھانڈے ضلع ڈوڈہ میں ڈپٹی کمشنر تھے اور خالد حسین پروجیکٹ آفیسر۔خالد تو ادیب تھے ہی، اقبال کھانڈے کو بھی شعر وادب سے دلچسپی تھی۔وہ شاعروں ادیبوں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی بڑی عزت کرتا تھا اور خود چونکہ وہ خوش شکل، خوش مزاج اور خوش اطوار کے علاوہ ''خوش گلو'' بھی تھا اس لئے اکثر شاعروں کے اشعار، فلمی گیت گانے اور گلوکاروں کے گائے ہوئے نغمے گنگناتا اور کبھی دوستوں کو گا کر بھی سناتا۔ایک ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اقبال کھانڈے کی فتوحات بے شمار ہیں۔اقبال کھانڈے واحد ڈپٹی کمشنر تھا جو عوام اور علاقے کے مسائل کا بہ چشم خود جائزہ لینے کے لئے، دور دراز اور دشوار گذار علاقوں کا پیدل دورہ کرتا۔خالد حسین ہر دورے میں ان کے ساتھ ہوتے۔ان دوروں سے متعلق کئی واقعات کا ذکر اس خودنوشت میں موجود ہے۔عبدالرشید تیلی کے دل دہلانے والے سانحے کا ذکر کیا جاچکا ہے۔لیکن سینکڑوں واقعات خالد حسین زبانی بھی سناتے ہیں۔اقبال کھانڈے کی پوری زندگی چیلنجز کا سامنا کرتے گزری جس کا بیان خالد حسین نے انتہائی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔خاص کر 'اگروادیوں' کے خاتمے کے نام پر، عام کشمیریوں کی ہلاکت کے سوال پر گورنر جگموہن اور ان کے درمیان مکالمے کا بیان۔خالد حسین نے پاکستانی فکشن نگار فخر زماں، ڈاکٹر اظہر محمود، اوتار سنگھ چندن، شیخ غلام رسول وغیرہ دوستوں کو بھی بڑے خلوص کے ساتھ یاد کیا ہے۔اس تصنیف میں جن دیگر اہم شخصیات کے بارے میں کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے ان میں، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاراجہ ہری سنگھ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، شیخ محمد عبداللہ، مولانا مسعودی، مرزا افضل بیگ، گُل شاہ، بخشی غلام محمد، شریمتی اندرا گاندھی، بلراج ساہنی، خواجہ احمد عباس، امرتا پریتم، محمد یوسف ٹینگ، نور شاہ، میاں بشیر احمد، ملکہ پکھراج، اور دھیریندر برہمچاری جیسی کئی شخصیتیں شامل ہیں۔

یہ 'خودنوشت'۔۔۔اردو اور پنجابی کے صفِ اول کے افسانہ نگار خالد حسین کی ذات، زندگی اور زمانے کی کھلی کتاب بھی ہے اور تقسیم ملک کے آس پاس سے لے کر، آج اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک، ریاست جموں وکشمیر میں ''اٹوٹ انگ'' اور ''شہہ رگ'' کے نام پر ہونے والی سیاسی شعبدہ بازیوں کی دستاویز بھی۔لہٰذا خالد حسین کے اس ''زندگی نامہ'' کے ساتھ ساتھ جموں وکشمیر کے ''سیاست نامہ'' کی ایماندارانہ آگہی حاصل کرنے کے لئے خالد حسین کی اس تصنیف ''میں زندہ آدمی ہوں'' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

''زہرِ عشق'' کے انگ سنگ

ڈاکٹر ہرچند سنگھ بیدی
(امرتسر)

خالد حسین نے اکثر معیاری کہانیاں لکھی ہیں، جو ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اُس کے افسانوں کا منظر نامہ سماج کے پچھتے لیکن اہم مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ معاشرے میں پھیلی منفی سوچ اور سیاسی کھردرے پن کو بڑی بے باکی سے بیان کرتا ہے۔ خالد حسین زبان کی تہذیب سے واقف ہے۔ ضرب المثلیں، کہاوتیں، ترکیبیں، محاورے، استعارے، اور تشبیہات ہر کہانی کی آرائش وزیبائش کو گوہر بار کرتی ہیں۔ اُس کے افسانے اپنی مٹی کے خمیر سے جنم لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خالد حسین نے اپنی کہانیوں کی وجہ سے پنجابی اور اُردو میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ اُس کے موضوعات منفرد ہوتے ہیں۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسے دِل کی دہلیز کے اندر خوشنما غالیچہ بچھا ہو۔ کہانیوں کے پلاٹ زمینی حقائق سے جُڑے ہونے کی وجہ سے قاری کی دلچسپی آخری جملے تک برقرار رہتی ہے کیوں کہ ان کہانیوں میں فنکارانہ اور ایماندارانہ تخلیقی رویہ ملے گا۔ میری بات کی تصدیق کے لئے تقریباً چالیس سالوں میں لکھی گئی خالد حسین کی کہانیاں ہیں۔

میں نے اپنے اِس مضمون کو خالد حسین کی ایک خوبصورت کہانی ''زہرِ عشق'' کے انگ سنگ رکھا ہے جو اُس کے تازہ اُردو افسانوی مجموعے ''جنت گرہن'' میں شامل ہے اور جو پنجابی میں ''شاداں بلی جموں ولی'' کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔ یہ کہانی حقیقت نگاری کی چاشنی سے سجی ہوئی ہے۔ جذبات اور کیفیات کا بیان کرداروں کی سچائی کو عیاں کرتا ہے۔ سادہ، عام فہم لیکن بامحاورہ زبان ''زہرِ عشق'' کے بیانیے کی خصوصیت ہے۔

کہانی میں سات کردار ہیں۔ یعنی نصیبو، سردار خان، شاداں بلی، یوسف، گجے سنگھ چاڑک، غفورا پہلوان اور تھانیدار۔ کہانی کا آغاز بوڑھے تھانیدار کی چکردار سیڑھیاں چڑھنے سے ہوتا ہے جو شاداں بلّی کو ٹھے والی سے ملنے اُس کی سیلن بھری کوٹھری کے اندر جاتا ہے تاکہ اپنے بوڑھاپے کے چھچھڑے شاداں بلی کو کھلا سکے اور تھانیداری کے سُنہرے دِنوں کی راکھ کو کُرید سکے لیکن وہاں ایک کونے میں پڑی گدلی عمر کی شاداں بلی کو نماز اور تسبیح پڑھتے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے جبکہ کہانی کے اختتام میں یہی سیلن والی کوٹھری بُوڑھے تھانیدار کو لُوبان کی رُوحانی خوشبو میں لبریز دِکھائی دیتی ہے، اور جب وہ شاداں بھگتن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے تو اُسے شاداں کی آنکھوں میں رابعہ بصری کی مستی دِکھائی دیتی ہے اور اُس کا انتر من بول اُٹھتا ہے۔۔۔ 'سانسوں کی مالا پہ سمروں میں پی کا نام۔''

اس کہانی میں نصیبو عورت کے استحصال کی علامت ہے جسے جاگیردار سردار خان نے اپنی رکھیل بنا کر رکھا تھا تاکہ پیسے کے عوض وہ اُس کے جنسی تقاضے پورے کرتی رہے۔ جس کے نتیجہ میں شاداں بلّی کا جنم ہوتا ہے۔۔۔ اِسی طرح شاداں بلی عورت کے استحصال بالجبر کی علامت ہے، جسے گجے سنگھ چاڑک زبردستی حاصل کرنا چاہتا ہے، اور اُسے اپنی ذاتی جاگیر سمجھتا ہے۔ یہ استحصالی قوتیں گلوبل سماج میں ہر جگہ ملیں گی۔ لیکن خالد حسین نے اِن کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کمزوریوں کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ نصیبو اور سردار خان کے تعلق کو بیان کرتے خالد حسین کی زبان دانی کا کمال دیکھیں۔

''وہ (شاداں) ایک اصیل ڈیرے دارنی نصیبو کی بیٹی تھی جو جاگیردار سردار خان کی رکھیل تھی اور رکھیل تو خالص سرسوں کا تیل ہوتی ہے۔ اس کڑوے تیل نے سردار خان کے نتھنوں سے خوب پانی نچوڑا تھا اور آنکھوں کو دُھواں دیا تھا۔ سردار خان نصیبو کے رنگ رُوپ کا مارا تھا۔ اُسے اپنی جنسی تڑپ کا داڑو نصیبو کے کوٹھے پر ہی ملتا تھا کیوں کہ پکی رنگت اور کچی سنگت والے گبھرو۔۔۔ گوری شکلوں کے عاشق ہوتے ہیں اور جلد ہی اس کیچڑ میں لتھیڑے جاتے ہیں۔ ایسے عاشق رنڈی کے کٹے کے مونہہ پر لگے شہید کو بھی چاٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ دُنبے اور نیل کا چربیلا گوشت کھانے والے یہ عاشق قد کاٹھ نکالتے ہی آوارہ گردی کی جُوتیاں پاؤں میں پہن لیتے ہیں اور جگہ جگہ بدکاری کی دُھول اُڑاتے پھرتے ہیں۔''

سردار خان کی جوانی کی بھٹکن آخر نصیبو کے کوٹھے پر ختم ہوتی ہے، جو یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ نصیبو کے جسم کا نمک کوئی دوسرا چکھے۔ کہانی پڑھتے یوں لگتا ہے جیسے ایک جیتی جاگتی فلم آنکھوں کے ذریعے ذہن و دِل میں اُترتی جا رہی ہے۔

نصیبو چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی شاداں اُس کے بوڑھاپے کا سہارا بنے۔ اسی لئے اُس نے شاداں کو سُر سنگیت کی باریکیاں سمجھانے کے لئے اُستاد فن کاروں کی شاگردی میں دیا تھا۔ جلد ہی وہ اپنی ماں کے ساتھ مُجرے میں بھی سنگت کرنے لگی۔ نصیبو کی فوتگی کے بعد کوٹھے کی حکومت شاداں بلی کے ہاتھ آ گئی اور ساز و آواز کا جل ترنگ محفلیں گرماتا رہا۔ لیکن ایک جنسی مریض اور اڑیل سانڈ گجے سنگھ چاڑک شاداں کو حاصل کرنے کے لئے گالی گلوچ، دھمکیوں اور غنڈہ گردی جیسے حربے استعمال کرنے لگا جبکہ شاداں بلی کا خاموش عاشق اور اُس کو 'سُر وں کی سرکار' کہنے والا غفورا پہلوان اُس کی سردل کا اردل بن گیا۔ اسی دوران شاداں بلی کی زندگی میں اُس کا من پسند ماہی یوسف آ گیا جس نے شاداں کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ یوسف شاداں بلی کو کوٹھے اور مُجرے کی دُنیا سے نکال کر صوفیوں کے حُجرے میں لے گیا۔ جبھی تو شاداں بلی بول اُٹھی۔

''میں پُرانی دیگچی تھی۔ مجھے قلعی کرانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میرا اندر کھنڈر بن چُکا تھا۔ میرے نفس کو پاک شفاف بنانے کے لئے صفائی ستھرائی کی ضرورت تھی اور مجھے معرفت کے نُور کی۔ اِس لئے گانا بجانا بند کر دیا۔ ساز

برباد کردیئے۔ صرف صوفیوں کے کلام کے ذریعے گیان دھیان کی دُنیا کو کھوجنے کے لئے پڑھنا شروع کیا۔ قلندری رمزوں کو جب سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ انسانی قلبُوت کے اندر ایک دُنیا سمائی ہوتی ہے۔ صوفی اپنے قلبوت کے اندر کوٹھے اور حُجرے بناتے رہتے ہیں۔ جلال اور جمال والے صوفی راج، تاج اور سماج کی پرواہ نہیں کرتے۔ بس مولاُ سائیں کی درگاہ کے اندر تصوّف کی ست رنگی مدھُوشالا میں مستی کی مدھرا پیتے رہتے ہیں۔''

تصوف کی دُنیا میں سفر کرنے والی شاداں بلی اب تھانیدار سے کہتی ہے، ''تھانیدارا! درویشی اور فقیری سُوئی کے سوراخ میں سے اونٹ نکالنے والی بات ہے اور اس کا علم مجھے صوفیوں کا کلام پڑھ کر ہوا۔''

یوسف اور شاداں کی محبت گجے سنگھ کو ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ یوسف کو قتل کر دیتا ہے۔ شاداں کے مجازی خُدا کو قتل ہوتے دیکھ کر خاموش عاشق غفورے پہلوان سے رہا نہ گیا اور وہ گجے سنگھ کی گردن کاٹ دیتا ہے اور دس سال کے لئے جیل چلا جاتا ہے۔

''زہر عشق'' میں محبت کے پیمانے الگ الگ ہیں۔ سردار خان کا عشق جسمانی لذّت تک محدود ہے۔ گجے سنگھ کا عشق زبردستی اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے۔ یوسف کا عشق روحانی ہے اور غفورے پہلوان کا عشق بے لوث اور حقیقی ہے۔ کہانی میں کوئی بھی کردار خود مختار نہیں ہے بلکہ محتاج ہے۔ یہ سبھی کردار غلام گردش کی بھول بھلیوں میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن محبت اور چاہت کا سِرا کِسی کی کے ہاتھ نہیں آتا۔ سبھی پیاسے رہتے ہیں یعنی شاداں بلی، یوسف، غفورا پہلوان اور گجے سنگھ چاڑک۔

کوٹھے کے حوالے سے خالد حسین کی منظر نگاری دیکھئے۔

''شاداں سُر بھگتن تھی۔ اُسے سُر کی پہچان اور راگوں کا گیان تھا۔ گانا اُس کا شوق بھی تھا اور روزی روٹی کا وسیلہ بھی۔ سُر میں سجی اُس کی ٹھمریاں، کافیاں، گیت، غزلیں، دادرے اور خیال، کمال تھے۔ سازوں کو سُر میں لانے کے لئے سازندے، تان پُورے، ستار، سرنگی، سرود، ڈھولک اور طبلوں کی کھچائی، کسائی، رگڑائی اور ٹھکائی کرتے رہتے اور رونق میلہ لگا رہتا۔''

لیکن جب یوسف کہانی میں داخل ہوتا ہے تو من اور مُراد کا آپسی رشتہ اٹوٹ بن جاتا ہے، کیوں کہ قدرِ مُشترک گلوکاری ہے۔ زمانی اور روحانی گلوکاری کا سنگم آخرش روحانیت، طریقت اور معرفت میں تحلیل ہو جاتا ہے اور شاداں بلی صوفی چولا پہن کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتی ہے۔ اس گوشہ نشینی میں صرف اُس کا خاموش عاشق اور اُسے سُر کی سرکار کہنے والا غفورا پہلوان ہی اُس کا سنگی ساتھی ہے۔ وہ بِلا کسی معاوضے، لالچ یا تقاضے کے اُس کا ساتھ نبھاتا ہے اور اُسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یوں فقیری چولے نے دونوں کو ایک کر دیا ہے اور اب اُن کا کوئی الگ وجود نہیں ہے اور یہی عشقِ حقیقی کی آخری منزل ہے۔

''زہر عشق'' میں نصیبو اندر سے باہر کا سفر کرتی ہے جبکہ شاداں بلی باہر سے اندر کا سفر کرنے لگتی ہے اور یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب ایمان کی دولت زندگی کے دستُور، سوچ اور فکر کو تبدیل کر دے۔ ایک طرف نصیبو سردار خان سے دولت اینٹھتی رہی تو دوسری طرف شاداں بلی دولت اور شہرت کو تیاگ کر یوسف کی زلیخا بن گئی اور اُس نے معرفت کی چادر اوڑھ لی۔ بیراگ کا یہ فیصلہ بہت اہم ہے جِسے کہانی کار نے فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

میری نظر میں اس کہانی کا اصلی ہیرو اور اہم کردار غفورا پہلوان ہے جو اپنی ''سُر کی سرکار'' کا ہر حکم بجالانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ خلوص و محبت کا پیکر ہے اور باقی کرداروں سے منفرد ہے۔

اس کہانی کا بنیادی نقطہ ''تصوف'' ہے۔ جِسے خالد نے خوبصورتی سے اُبھارا ہے۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے یہ کہانی خالد حسین کی نمائندہ کہانی ہے۔

(ڈاکٹر ہرچند بیدی کے پنجابی مضمون کی اُردو تلخیص)

معتوب کہانی

"حضور، آپ گھوڑا تانگہ بھی ضبط کرلیں، پر مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت کیوں ٹانگہ نہیں جوت سکتی، عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں۔ عورتیں ٹوکری ڈھو کر روزی کما سکتی ہیں۔ عورتیں لینوں پر کوئلے چن چن کر اپنی روٹی پیدا کر سکتی ہیں۔ میں ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی۔ مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں۔

ٹانگہ گھوڑا میرے خاوند کا ہے۔ میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں؟۔ حضور آپ رحم کریں۔ محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟۔ میں کیا کروں، بتایئے نا مجھے!"

افسر نے جواب دیا۔ "جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو۔ وہاں زیادہ کمائی ہے۔"

یہ سن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہو گئی۔ ہولے سے "اچھا جی" کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داموں ٹانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لمحے کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ وا ہوئے اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی۔

"ابو۔ تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مر گئی۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن عرضی دی۔ اس کو اپنا جسم بیچنے کا لائسنس مل گیا۔"

سعادت حسن منٹو

چوتھی سمت کا شہزادہ

خالد کفایت
(مالیرکوٹلہ)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اسسٹنٹ کمشنر تھا، بلاک ڈیولپمینٹ بلکہ سیدھے سبھاؤ ایک حال مست قسم کا کلرک تھا جو سیکریٹریٹ میں فائلوں سے اور محلے میں بیڈے سے الجھتا رہتا۔ جی ہاں۔۔۔ وہی بیڈا جس کی لنکا بڑے بڑے حادثوں، بھونچالوں اور طوفانوں کے باوجود بھی استاد محلے میں کھڑی تھی۔ اس سے فرصت ملتی تو وہ ان حویلیوں کو تکنے لگتا جن کی دیواریں اشتہاروں کے بوجھ سے خمیدہ ہو رہی تھیں مگر ان کے مکین آنے والے خطروں سے قطعی بے نیاز تھے۔ سیکریٹریٹ میں اس کا کام سرکاری اخبار ''دیہات سدھار'' ایڈٹ کرنا تھا۔ اسی میں چھپی تھی خالد حسین کی پہلی کہانی ''گھر کی جنت''۔۔۔ سننے میں آیا ہے کہ حقیقت اور افسانے کے تانے بانے سے بنی گئی اس کہانی کی بنیاد کسی ''معرکہ خیزی'' پر تھی جس میں خالد نے عین آخری وقت پر ایک زوردار دھماوا بول کر مورچہ جیت لینے کی بجائے پسپائی اختیار کر لی تھی۔ کہانی کی شانِ نزول تو خود خالد ہی سے پوچھیے کہ جنگی معرکوں کی داستانیں فوجی جرنیل مزے لے لے کر سنایا کرتے ہیں۔ البتہ اس کے ''عذرِ گناہ'' کو بدتر از گناہ گردانا گیا اور کئی روز تک گھر کی فضا گرد آلود رہی، تاہم مطلع صاف ہوا تو استاد محلے کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بڑا فن کار ضرور جنم لے چکا تھا اور اعتماد، محبت اور خود سپردگی کی شاخوں پر وفاداری بشرطِ استواری کے پھول کھل اٹھے تھے۔

غالباً یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے جب خالد نے لکھنا شروع کیا تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس جادو نگری میں پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے۔ خالد کی کہانیاں اس کی فطرت کی آئینہ دار ہیں۔ مہیب چٹانوں سے ٹکرانا اور انہیں چور چور کر دینا ہمیشہ سے اس کی ہابی (Hobby) رہی ہے۔ وہ سر جو کسی بیڈے کے آگے جھکا ہے نہ کسی باس کے آگے خم ہوا ہے اور ہمیشہ کج کلاہوں کو خون تھوکنے پر مجبور کرتا رہا ہے، آج بھی سربلند ہے۔

حقیقت بیانی اس کے فن کا خاصہ ہے اور اس معاملے میں وہ کسی سمجھوتے کا قائل نہیں۔ اسے نہ مال و دولتِ دنیا ڈگمگا سکتے ہیں نہ رشتہ و پیوند اس کے پیروں میں زنجیر ڈال سکتے ہیں۔ اب بتانِ وہم و گمان کے آگے سجدہ ریزی سے وہ ہمیشہ منکر رہا ہے۔ وہ پامال راہوں کا مسافر نہیں بلکہ نئی نویلی راہ گزاروں کا شائق ہے۔ اسی لیے اس کی مثال داستانوں کے اس باغی و خودسر شہزادے کی سی ہے جس نے تین محفوظ سمتیں چھوڑ کر ہمیشہ اس چوتھی سمت کی جانب قدم بڑھائے ہیں جو خطرات سے پُر اور تحفظات سے عاری ہے۔

ضد ہیں تو شان ہوا کرتی ہیں رئیسوں کی
جو چوتھی سمت نہ جائے وہ شاہزادہ کیا

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو بیچ میں آ ٹپکا۔ بات ہو رہی تھی خالد حسین کی پہلی کہانی کی جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے مَیں نے بھی اسی سال علیگڑھ میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس سے پورے دس سال بعد مَیں نے پہلی پنجابی غزل کہی جو امرتسر کے رسالے ''ساہت کار'' میں شائع ہوئی۔۔۔ اس دوران خالد حسین پنجابی ادب میں ایک منفرد اور معتبر نام بن چکا تھا اور کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ تنقید پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ اسی رسالے کے تنقیدی کالم۔۔۔ 'پرکھ پڑچول' میں خالد حسین اور خالد کفایت کی پہلی ملاقات ہوئی جو بہت عرصہ تک ''آدھی'' سیآ گے نہ بڑھی۔ کاغذی ہاتھوں کے سلام آتے رہے اور ہم برابر ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اپنے اپنے حسابوں خوب خوب حملے کیے گئے۔ کبھی زبان و بیان کے مسئلے اٹھائے گئے تو کبھی اُردو پنجابی کے جھگڑے نپٹائے گئے۔۔۔ تکلفات کی انہیں پرچھائیوں تلے کافی سفر طے کر چکے تو استاد ذوق کی یاد آئی جن کے بقول تکلف میں تکلیف سراسر تھی اور ہمیں ضرورت تھی آرام کی جو تکلف نہ کرنے والوں کو ہی میسر ہے۔ لہٰذا یکلخت دونوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''آپ''، ''جناب''، اور ''صاحب'' کے مورچوں سے باہر نکلے۔۔۔ اور۔۔۔ ''تم'' اور ''تو'' کی جنگ بندی کی لائن پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اپنائیت و یگانگت کی فضاؤں میں پہلی بار مجھے خالد کی وہ پرخلوص دعوت یاد آئی جو وہ بہت دنوں سے کشمیر کی سیر کے لیے دے رہا تھا اور جسے اس سے پہلے مَیں محض تکلف سمجھ کر نظر انداز کرتا چلا آ رہا تھا۔

ابھی کشمیر جانے کا پروگرام بن ہی رہا تھا کہ ایک روز وہ خود ہی مالیرکوٹلہ پہنچ گیا اور آن دھمکا عصمت منزل میں ذاتی طور پر دعوت دینے کے لیے۔۔۔ اب تو کسی انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ راہِ فرار مسدود تھی۔۔۔ خالد سے اس پہلی ملاقات میں ہی مَیں اس کے جذبۂ خلوص کی شدّت و حدّت کا پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔

آئندہ چھٹیوں میں کشمیر جانے کے لیے پروگرام فائنل ہو گیا۔ مشتاق وارثی ساتھ جانے کے لیے تیار تھا۔۔۔ جی ہاں! مشتاق وارثی۔۔۔ ''پچھلے پہر'' کا تخلیق کار۔۔۔ بڑی عجیب شے ہے۔ سگریٹ اور ساتھی میسر ہوں تو اسے قطب شمالی تک جانے میں بھی تکلف نہیں لیکن اکیلے میں وارث لاج سے حبیب کلینک کا فاصلہ طے نہیں ہوتا جو بمشکل پچاس قدم ہوگا۔ جموں داخل ہوتے ہی اس کی سگریٹ نوشی خالد حسین کے حساب میں ہونے لگتی ہے کہ پرانے حاکم یوں ہی خراج وصول کیا کرتے تھے۔۔۔ بہر حال مشتاق تو کسی وجہ سے ساتھ نہ جا سکا لیکن پراکسی (Proxy) کے طور پر عارف میرے ہمراہ تھا اور ہماری منزل تھی تلسی باغ سری نگر کا وہ سرکاری کوارٹر جہاں خالد اور نسیم فردوس کے شاداں و فرحاں چہرے ہمارے منتظر تھے اور کوارٹر پہلے سے ہی ہمارے لیے ریزرو کر دیا گیا تھا۔

مہمان نوازی خالد فیملی پر ختم ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جموں کا چکر لگے اور اس کے گھر پر کسی نئے ادیب یا شاعر سے ملاقات نہ ہو۔ اسی لیے تو مَیں نے ''الفردوس'' کا نام ''ادبی دھرم شالہ'' رکھ چھوڑا ہے اور اس کا کریڈٹ خالد سے

کہیں زیادہ نسیم فردوس کو جاتا ہے جس نے بارہا اپنے زیورات کی قربانی دے کر مہمان نوازی کی لاج رکھی ہے۔ عبدالعزیز سے عارف حلیم تک اور طارق کفایت سے انوار صدیقی تک سبھی اس بات کی تائید کریں گے کہ خالد وہی مردِ مومن ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال فرما گئے ہیں:

ع ''مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا''

عام طور پر طور دیکھا گیا ہے کہ ادیب شاعر وغیرہ عملی زندگی میں بے کار محض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خالد کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ (nothing for good) اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ جموں کشمیر میں آل انڈیا پنجابی کانفرنس کا انعقاد اس کی انتھک محنت اور بے پایاں لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ادبی مجالس اور خالد حسین لازم وملزوم ہیں۔ اور وہ جہاں بھی گیا ہے ادبی خوشبو بکھیرتا گیا ہے۔ جموں کشمیر کا ایک دور افتادہ مقام ہے 'ڈوڈہ'، خالد کی کوشش سے وہاں بھی چار آل انڈیا مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے ان چاروں ہی مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا ہے اور جہاں دوسرے بہت سے مخلص دوستوں اور ڈوڈہ نواسیوں کی محبت کا تحفہ ملا ہے وہیں محترم اقبال کھانڈے (ڈپٹی کمشنر)، برادم اسحاق زرگر (سیکریٹری بزمِ ادب) اور پیارے پیارے ظفر احمد (اسسٹنٹ ڈائریکٹر دوردرشن) کی علم دوستی، ادب نوازی اور ادیب پروری کی دولت بھی نصیب ہوئی ہے۔۔۔ یہ تیسرے مشاعرے کا ذکر ہے جب مشتاق وارثی اور رمضان سعید بھی ہمراہ تھے۔ سعید ان دنوں قرآن پاک کے پنجابی ترجمہ میں مصروف تھا۔ چلتے چلتے چند اجزا ترجمے کے بھی لے لیے کہ خالد کے ساتھ بیٹھ کر اس کی زبان کے بارے میں گفتگو کی جا سکے۔ مشاعرے سے اگلے روز دو تین بھرپور نشستیں جمیں اور سورہ یوسف کا ترجمہ زیرِ بحث آیا۔ خالد کی زبان دانی کے تو ہم پہلے سے ہی قائل تھے لیکن اس روز اس کے دینی شغف اور اسلامی شعائر کی جز رسی کے بھی قائل ہو گئے۔ یقیناً 'ترقی پسند' خالد حسین کا یہ ایک نیا چہرہ تھا جو اس روز ہمارے سامنے آیا۔۔۔ حیران کن اور مسرت خیز۔

خالد کہانی لکھنا ہی نہیں جانتا، کہانی سنانے کے فن پر بھی مکمل دسترس رکھتا ہے۔ مالیر کوٹلہ کی محفلیں اس کی گواہ ہیں جہاں اس نے جوان راتوں کو ڈھل ڈھل کر صبح کاذب میں تبدیل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ کمبخت کہانی یوں سناتا ہے جیسے شاعر مشاعرے میں غزل ارشاد کرتا ہے۔ ناصر، یاسین بیگ اور برج نندن ان محفلوں کے گواہ ہیں جب واہ واہ، مرحبا، بہت خوب، مکرر کی صداؤں سے گونجتی ہوئی مجلسوں کو اس نے تاتاری حملہ آوروں کی طرح لوٹا ہے۔ صرف ایک محفل میں پوری انتیس کہانیاں خالد نے مالیر کوٹلہ میں ہی سنائی ہیں۔ اگر مالیر کوٹلہ کو خالد حسین جیسا سنانے والا نہیں ملا تو اسے بھی کہاں مالیر کوٹلے جیسے باذوق سامعین نصیب ہوئے ہوں گے جنہوں نے بنا پہلو بدلے اسے لگاتار کئی کئی گھنٹے سنا ہے اور بڑے بڑے وسیع ہال تنگ دامانی کے ثنا کی بنا دیے ہیں۔

کہتے ہیں ہر مرد کی ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ کسی اور کے بارے میں تو کہا نہیں جا سکتا لیکن خالد حسین کے بارے یہ قول حرف بہ حرف صحیح ہو سکتا ہے اگر اس میں عورت کی بجائے 'عورتوں' استعمال کیا جائے۔ بھلے ہی وہ اس سے اتفاق نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ازدواجی زندگی میں نسیم فردوس اس کے لیے سچ مچ ''جنت کی ہوا'' ثابت ہوئی ہے۔ اس نے خالد کی شخصیت کو ہی نہیں ابھارا فن کو بھی نکھارنے میں مدد دی ہے۔ خود خالد نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، چاہے دبے لفظوں میں سہی۔۔۔ دوسرے بہت سے دوستوں کے ساتھ ساتھ تنویر جہاں اور ڈاکٹر کیرتی کیسر نے بھی اس کا ادبی قد بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور اس پر مستزاد خالد کی مشہور و معروف کہانیاں جن میں صنفِ نازک پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ عورت کی معاشرتی مشکلات اور نفسیاتی الجھنوں کے بیان میں وہ منٹو سے بھی دو ہاتھ آگے دکھائی دیتا ہے۔ کہانی پر تنقید اس خاکے کا موضوع نہیں ہے ورنہ مَیں مثالیں دے کر واضح کرتا کہ نسوانی کرداروں کی پیش کاری اور کردار نگاری سے خالد حسین نے کس طرح اپنے فن کی زیبائش و آرائش کا کام لیا ہے۔ نسوانی مسائل کو جتنی اچھی طرح وہ سمجھتا ہے وہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسے اونچے پربتوں کی اداسی کا راز بھی معلوم ہے اور گہرے پانیوں کے دکھ کا بھی اندازہ ہے اور وہ اپنے قاری تک ان کی ترسیل کے فن سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔

دوست بنانے کا فن اسے خوب آتا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ دوستی نبھانے کے لیے وہ آخری حد تک جانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ کی اس کے نزدیک کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اپنی بیشتر کہانیوں کے پلاٹ اسے انہیں لوگوں سے ملے ہیں جنہیں ''سڑک چھاپ'' کہا جاتا ہے۔ اس کا ہر ایک دوست یہی سمجھتا ہے کہ وہی خالد کے سب سے زیادہ نزدیک ہے اور اس کا یہی کمال ہے کہ وہ کسی کو اس خوش فہمی کے جال سے نکلنے نہیں دیتا۔۔۔ خواہ خود اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے وہ دوستی کے ناز کا آبگینے کو ٹھیس نہیں لگنے دیتا۔۔۔ خیالِ خاطرِ احباب کے لیے سینکڑوں بار نقصان اٹھانے کے باوجود بھی اس نے اپنی روش نہیں بدلی اور لگتا ہے کہ بدلے گا بھی نہیں۔۔۔ یوں تو پنجاب بھر میں، بلکہ پورے ہندوستان بھر میں اس کے دوست احباب بکھرے ہوئے ہیں مگر مالیر کوٹلہ سے اس کو دوگنا تعلق ہے۔ یہاں اس کے دوست بھی ہیں اور عزیز بھی۔۔۔ اور کسی حد تک اس کی کھوئی جنت بھی یہاں موجود ہے جو تقسیم وطن کے ہنگاموں میں اودھم پور میں اس سے چھن گئی تھی۔۔۔ یہاں اس کا خاندان بھی ہے۔ اس کے بھائی بہن، عزیز و اقارب، سگے سمبندھی سب موجود ہیں جن کی محبت بہت عرصہ تک اس کے لیے خواب و خیال ہی بنی رہی ہے۔۔۔ اسی لیے تو خالد حسین کا دوسرا گھر مالیر کوٹلے میں ہے۔

خالد کی شخصیت مختلف و متضاد کیفیات و احساسات کی آئینہ دار ہے۔ کبھی وہ انتہائی نرم دل ہے تو کبھی حد سے زیادہ سخت گیر۔ ٹوٹنے کی اسے پروا نہیں لیکن جھکنا اس کے لیے ناممکن ہے۔۔۔ کبھی وہ حد سے زیادہ روشن خیال اور ترقی پسند دکھائی دیتا ہے تو کبھی بنیاد پرست بن کر مسجدوں کے لیے چندہ جمع کرتا پھرتا ہے۔ دراصل جو بات اسے صحیح محسوس ہو اس پر سمجھوتہ کر لینا اس کی شریعت

میں کفر ہے۔اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی پردہ پوشی کرنا وہ گناہ سمجھتا ہے اور موقع بے موقع بھی ان کا ڈھنڈورا پیٹنے سے باز نہیں آتا۔خامیوں کی بات چلی تو کہنا پڑے گا کہ وہ بھی انسان ہے فرشتہ نہیں۔۔۔اور بشری کمزوریوں سے اس کا دامن بھی آلودہ ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ وہ انہیں چھپانے کی بجائے ان سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

جیسے کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے کے فن میں اسے معراج حاصل ہے۔اس میں جہاں اس کی مقناطیسی شخصیت کا دخل ہے وہیں جذبۂ ایثار وخلوص کی کارفرمائی بھی ہے۔کاروبارِ دوستی میں وہ سود وزیاں کی پروا نہیں کرتا۔۔۔''حسابِ دوستاں در دل'' کا قائل ہے۔اسی لیے اس کے حلقۂ یاراں میں ادیب وشاعر ہی نہیں افسران وسیاست دان بھی شامل ہیں۔۔۔اپنے ماتحتوں سے بھی اس کا سلوک دوستانہ اور مربیانہ ہے، نہ کہ افسرانہ۔۔۔یہ روش بارہا اس کے لیے نقصان کا باعث بھی ہوئی ہے اور بہتیروں نے بنامِ دوستی اسے زک بھی پہنچائی ہے مگر پھر بھی کبھی اس کے لب پر حرفِ شکوہ نہیں آیا اور نہ ہی وہ اس ''چوتھی سمت'' سے مراجعت پر مائل ہے جسے اس نے رہ گزارِ حیات قرار دے رکھا ہے ۔۔۔بڑی سے بڑی مشکل میں بھی مَیں نے اسے کبھی جی ہارتے نہیں دیکھا بلکہ ہمیشہ مسکراتے ہی پایا ہے۔یہی ہنسی بے تکلف دوستوں میں فلک شگاف قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ایک ہاتھ داد لینے کی کوشش میں مسلسل کسی نہ کسی مقابل پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔حملہ آور ہی نہیں ہوتا بلکہ شدت خلوص سے جکڑ بھی لیتا ہے۔یہ ادا اس وقت اور بھی پیاری لگتی ہے (خالد حسین کو زیادہ، مقابل کو کم) جب مقابل ہاتھ نرم بھی ہو اور گداز بھی۔۔۔کیوں کہ بے تکلف دوستوں کی فہرست بناتے وقت اس نے کبھی تذکیر وتانیث کی تخصیص روا نہیں رکھی ہے۔۔۔خلوص ومحبت کا یہ جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے تو خالد کی زبان پر انتہائے یگانگت میں ایسے الفاظ بھی مچلنے لگتے ہیں جنہیں 'بد ذوق' حضرات 'غیر پارلیمنٹری' کہہ کر محفل بدر کر دیتے ہیں۔ پنجابی زبان کا مشہورِ عام فقرہ ''یاراں نال بہاراں، دنیا لکھ وسدی'' شاید ایسے ہی یاروں کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

خالد کے دوستوں کی فہرست طویل سہی، اس کے دشمنوں کی فہرست طویل تر ہے کہ دنیا حاسدوں سے کبھی خالی نہیں رہی جن کی آنکھوں میں اس کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔کسی کو اس کی مقبولیت سے بَیر ہے تو کسی کو اس کی ترقی سے کد ہے۔حاسدوں اور دشمنوں کی ایک بڑی تعداد ہمہ وقت اسے زک پہنچانے کے درپے رہتی ہے لیکن خالد انہیں نگاہِ غلط انداز کا سزاوار بھی نہیں سمجھتا۔درگزر کرنا اور کرتے ہی چلے جانا اس کی عادت ہے۔۔۔مگر اپنی ہی دھن میں مست فیلِ بے پروا سگانِ راہ کو کچل دینا بھی جانتا ہے کہ اپنے وجود کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کبھی یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔وہ دوستوں کے لیے دستۂ گل ہے تو دشمنوں کے لیے شمشیرِ بے نیام:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے ''خالد''

اخلاقیات

دوڑ کے مقابلوں میں فنش لائن سے چند فٹ کے فاصلے پر کینیا کا ایتھلیٹ عبدالمطیع سب سے آگے تھا، مگر اس نے سمجھا کہ وہ دوڑ جیت چکا ہے۔

اس کے بالکل پیچھے سپین کا رنر ایون فرینڈز دوڑ رہا تھا- اس نے جب دیکھا کہ مطیع غلط فہمی کی بنیاد پر رک رہا ہے تو اس نے اسے آواز دی ''دوڑو ابھی فنش لائن کراس نہیں ہوئی''

عبدالمطیع اس کی لینگویج نہیں سمجھتا تھا۔

یہ بہترین موقع تھا کہ فرینڈز اس سے آگے نکل کے دوڑ جیت لیتا مگر اس نے عجیب فیصلہ کیا اس نے عبدالمطیع کو دھکا دے کے فنش لائن سے پار کروا دیا۔

تماشائی اس اسپورٹس مین اسپرٹ پر دنگ رہ گئے، فرینڈز ہار کے بھی ہیرو بن چکا تھا۔

ایک صحافی نے بعد میں فرینڈز سے پوچھا تم نے یہ کیوں کیا؟

فرینڈز نے جواب دیا

''میرا خواب ہے کہ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جہاں کوئی دوسرے کو اس لئے دھکا دے تا کہ وہ جیت سکے۔''

صحافی نے پھر پوچھا:

''مگر تم نے کینیا کے ایتھلیٹ کو کیوں جیتنے دیا؟''

فرینڈز نے جواب دیا:

''وہ ویسے ہی جیت رہا تھا، یہ دوڑ اسی کی تھی''

صحافی نے اصرار کیا ''مگر تم یہ دوڑ جیت سکتے تھے؟''

فرینڈز نے اس کی طرف دیکھا اور بولا:

''اس جیت کا کیا میرٹ ہوتا؟

اس میڈل کی کیا عزت ہوتی؟

میری قوم میرے بارے میں کیا سوچتی؟''

اقدار نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ہمیں اپنے بچوں کو کیا سکھانا چاہیئے،

''بلاشبہ یہ کہ جیتنے کیلئے کوئی بھی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرنا۔''

وہ آپ کی نظر میں جیت ہو سکتی ہے، دنیا کی نظر میں آپ کو بددیانت کے علاوہ کوئی خطاب نہیں ملے گا!

☆

حیات وکائنات کا عکاس

ڈاکٹر ندیم احمد ندیم
(مالیر کوٹلہ)

خالد حسین کی تحریروں میں پہاڑوں کا حسن بھی ہے اور میدانوں کی زرخیری اور شادابی بھی، یعنی آپ جموں کشمیر سے لے کر پنجاب تک کی تہذیب وثقافت، زبان وبیان کو بہترین محاوراتی اسلوب ونگارش سے مزین کرنے والے فنکار ہیں۔ ان کی تحریروں میں گرتے جھرنوں کی سی شفافیت بھی ہے اور بہتے دریاؤں کی سی پاکیزگی بھی۔

فن کوئی بھی ہو، اُس کا مقصد انسانی جذبات اور خیالات کی عکاسی کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خالد حسین زندگی کا فہم وادراک رکھنے والے معتبر قلم کار ہیں جو چھوٹے چھوٹے لطیف جذبوں سے ایک بڑا کینوس ابھارنے اور اپنے قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے ہنر سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ اُن کی یہ خوبی انفرادیت کی حامل ہے۔

خالد حسین کی زبان شائستہ، سادہ اور شیریں ہے اور ساتھ ہی اُس میں پنجابی الفاظ اور لہجے کے رچاؤ نے ایک وقار عطا کیا ہے جو کشش اور پسندیدگی کی وجہ بنتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری لکھنا اپنے آپ میں بڑے حوصلے اور ہمّت کا کام ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی خودنوشت دلچسپ اور کارآمد ہو تو آپ کو اپنی زندگی کے تمام تر واقعات کو سچائی اور ایمانداری سے تحریر کرنا ہوتا ہے جس میں آپ کی خوبیاں بھی شامل ہیں اور کمیاں بھی۔ تاکہ قارئین آپ کو کامرانیوں کے ساتھ ساتھ آپ کی ناکامیوں سے بھی سبق حاصل کر سکیں اور حقیقی زندگی کا لطف لے سکیں۔ خالد حسین کی خودنوشت کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جہاں اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے وہیں اپنے بچپن کی شرارتوں سے لے کر موجودہ دور تک کی تمام کھٹی میٹھی یادوں کا تذکرہ بحسن وخوبی کیا ہے۔

لکھتے ہیں، ''جب ہم کھیلتے ہوئے تھک جاتے اور بھوک سے نڈھال ہو جاتے تو اُن کھیتوں شام، مولیاں، گاجریں اور کڑم کی مُنڈیاں چوری کرتے اور پانی سے دھو کر کھاتے، کمیٹی باغ میں املوک توڑ کر کھاتے، کئی بار سبزیاں اُگانے والے ارائیں ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کرتے لیکن ہم بھاگ جاتے۔۔۔ سرینگر کا سول سیکرٹریٹ ہمارے بچپن میں زنانہ پارک ہوا کرتا تھا۔ اس میں رنگ برنگے پھول، سیب، ناشپاتی، آلو بخارے، خوبانی، چیری اور مُشک بید کے درخت تھے۔ ہم لوگ مالی کی نظر بچا کر پارک میں گھس کر پھل کھایا کرتے تھے جب کبھی ہم میں سے کوئی مالی کے ہتھے چڑھ جاتا تو مالی اُس سے پھلوں کے پیسے مانگتا اور پیسے نہ دینے پر اسے پکڑ کر اُس کے گھر لے جاتا اور والد سے رقم کا تقاضا کرتا، مالی کے جانے کے بعد مولا بخش سے اس کی خاطر تواضع کی جاتی۔''

اس طرح کے تمام واقعات کی جزئیات نگاری مضمون کو دلچسپ اور پُر تاثیر بناتی ہے اور لکھنے والے کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہے۔ خالد حسین ایک کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں اُردو اور پنجابی زبانوں پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ ایک کامیاب ادیب اور عمدہ مترجم ہیں، درجنوں کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم ہیں۔ اُردو کی بات کریں تو اُن کے افسانوی مجموعوں میں 'ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'، 'اشتہاروں والی حویلی'، 'ستی سرکا سورج' اور 'جنت گرہن' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اُن کی یہ سوانح حیات پہلے 'مائی کدم کریندی یار' کے عنوان سے پنجابی میں شائع ہو چکی ہے جسے اب ''میں زندہ آدمی ہوں'' کے نام سے اردو میں منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔ خالد حسین کی خودنوشت کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف دردمند دل رکھنے والے ادیب ہی نہیں بلکہ اُن کی شخصیت میں ایک بہادر، نڈر اور نہایت حوصلہ مند انسان بھی جلوہ افروز ہے۔ وہ قدرت سے پیار کرنے والے ہیں پہاڑوں اور دریاؤں کے گرد گھوڑ سواری کرنا بھی اُن کے مشاغل میں شامل ہے۔

اُردو زبان وادب میں پائی جانے والی شائستگی، شگفتگی، حلیمی اور شیرینی ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور تقریباً تقریباً یہی اوصاف خالد حسین کی شخصیت سے بھی اُجاگر ہوتے ہیں۔ محبت اور اپنے پن کی ایک خاص رو ہے جو جھرنے کی طرح بہہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالد حسین نے اپنی پنجابی خود نوشت سوانح کو اردو کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ زبان وبیان ہو یا اسلوب نگارش یا واقعات کی منظر کشی انہیں ہر چیز پر کمال حاصل ہے اور پھر اُردو زبان میں جو پنجابی کا تڑکا لگایا ہے اُس نے کتاب کی زینت وزیبائش میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کے مشمولات میں آگ کی ندی کے تیراک، دلداریاں، سخن شناسی، دل خراشیاں، رہے نام سائیں کا، میں خطاوار تو بخشہار، دل دریا بہتا جائے، مومن کافر میں کیا جانوں، کون دلوں کی جانے ہو، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے وغیرہ عنوانات کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔

خالد حسین کی تحریروں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا طرز تحریر جدید اسلوب نگارش پر مشتمل ہے اُن کے یہاں متروک الفاظ ومحاورات کا استعمال نہیں ملتا۔ ایک منجھے ہوئے فنکار کی طرح بات کرتے وقت کسی طرح کا جارحانہ انداز نہیں اپناتے بلکہ حقائق کو پیش کرتے ہوئے ان کا لہجہ نرم اور سہل رہتا ہے۔ اُن کی خودنوشت میں زندگی اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو بلاشبہ ایک فنکار کی بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

اس خودنوشت سوانح حیات کا ایک اور وصف جو انفرادیت کا حامل ہے وہ یہ کہ خالد حسین نے اپنی حیات کے رموز ونکات کو سیدھے طور پر خود بیان نہیں کیا بلکہ خود پس پردہ رہ کر انھوں نے یہ سب راویوں سے بیان کروایا ہے۔ اُردو ادب میں غالباً یہ نیا تجربہ ہے اور خالد حسین کی اختراع ہے جو قابل قدر ہے۔ اس کا استقبال ہونا چاہئے۔

کہانیاں من لبھانیاں

منموہن

(دہلی)

خالد حسین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے دو باتوں کا شدّت سے احساس ہوا۔ پہلی، اُس کی کہانیوں میں کہانی پن کا مضبوط اظہار اور دوسری، اُسکی زبان کی خوبصورتی۔ افسانے کے بارے میں وہ خود کہتا ہے کہ وہ تخلیق جسے افسانہ کہتے ہیں ،صرف افسانہ نہیں ہوتا بلکہ اپنی زمین، سماج اور زندگی سے کشید کیا ہوا ایک تخلیقی سچ ہوتا ہے، جس میں فنکاری (Craftsmanship) اور لفظوں کی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنے کلچر کی بھی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ جب میں نے خالد حسین کا یہ کتھن پڑھا تو مجھے مغربی ادیب اور دانشور ٹام کلینسی کی بات درست لگی کہ ''افسانے اور حقیقت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ افسانے کی تہہ میں کوئی مثبت بات یا اشارہ ضرور ہونا چاہیئے اور یہ کہ زندگی بے تُکی ہو سکتی ہے لیکن افسانہ بے تُکا نہیں ہوسکتا''۔ خالد حسین نے اپنے افسانوں میں جو محاوری زبان استعمال کی ہے، اُس کی مثال دوسرے افسانہ نگاروں میں بہت کم ملتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں جو پیراڈائم (paradim) اُبھرتا ہے، اُس میں سیاسی وسماجی مسائل کے ساتھ مکالمہ (dialogue) کرتے افسانوں میں پولی میکس (Polemics) یا دلیل ، اور زبان وبیان کی انفرادیت قاری کا دھیان اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نسوانی کرداروں والی کہانیاں پڑھیئے تو موپساں اور منٹو کا گمان ہوتا ہے۔ تقسیم ہند سے جُڑی کہانیوں میں پیش کاری کمال کی ہے۔ سماجی تانے بانے اور انسانی قدروں سے جڑی کہانیاں قابلِ تعریف ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''میں اور میری تخلیق'' میں خالد حسین لکھتے ہیں۔

''جب میں نیا نیا ادبی اکھاڑے میں اُترا تو رُستم پہلوانوں نے مجھے اپنے اپنے داؤ پیچ سکھانے شروع کئے۔ شولوخوف نے کہا کہ اگر تم عام لوگوں کے اکھاڑے میں کُشتی لڑوگے۔ اُن جیسا لنگوٹ پہنوگے۔ اُنکے جیون کو سمجھوگے۔ اُن کے دُکھ سُکھ کو پہچانوگے تو لوگ تمہیں خالد حسین پٹھا شولوخوف کہیں گے۔ تمہاری تخلیق عام لوگوں کے دِلوں کو جھنجھوڑے گی۔ جیمز لِن نے کہا کہ کہانی کِسی ایک کردار، ایک واقع یا جذبے کو پیش کرنے کا نام ہے۔ لارنس نے کہا کہ ایسے افسانے لِکھو ،جن کو پڑھ کر قارئین کے جِنسی جذبے کو سکُون ملے۔ فرائڈ نے کہا کہ افسانے میں نفسیات اور جنسیات کی باتیں کرو۔ مارکس نے اقتصادی پہلوؤں پر قابو پانے اور معاشرتی مسئلوں کو سُلجھانے کے لئے کہا۔ ساتر، خلیل جبران، پُشکن ،چیخوف ،رسُول حمزہ توف ،او ہنری، سومرسٹ مام، موپساں، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی ،بلونت سنگھ ، کرشن چندر اور منٹو نے بھی بڑی مغزماری کی

لیکن میرے مُرشد بُلھے شاہ نے مجھے پڑھایا تھا کہ

عِلموں بس کریں او یار
اِکو الف تیرے درکار

بس پھر میں نے 'الف' سے آگے کُچھ نہیں پڑھا کیونکہ یہ الف جب کسی تخلیق کا حِصہ بنتا ہے تو ذہن ودِل معطر ہو جاتے ہیں اور رُوح سیراب ہو جاتی ہے''۔ ان کے کہانی مجموعے ''ستی سر کا سورج''، ''عشِق ملنگی'' اور ''جنت گرہن'' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے خالد حسین کی باتیں حقیقت لگتی ہیں۔ اُس نے اپنے وقت کی بات کی ہے۔ اُسکی کہانیوں کے پلاٹ اُسی زمین سے نِکلتے ہیں، جس میں وہ رہ رہا ہے۔ خالد حسین نے اپنے بیانیے اور منفرد اسلوب سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ جس کے لئے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

۷۔ اپریل ۱۹۷۱ء

پیارے خالد۔

تیرا خط نہیں ملیا۔ میں پونچھ دے سائیں فقیر دین نوں ملن لئی تڑف گیا ہاں۔ مئی مہینے انہاں نوں ضرور جا کے ملاں گا۔

جو کجھ وی تُوں لکھیا اے حرف بہ حرف سچ ہے۔ میں تیرا خط اپنے مِتر جسونت سنگھ کنول نوں بھیج رہا ہاں ،تاں جے کیندری سبھا دے گوچرے لیا وے۔ دو اک گلاں ذہن وچ تینوں لکھن لئی آندیاں ہن۔

۱۔ پنجابی دیاں دو ہی پردان پسیاں ہن۔ گرمکھی تے فارسی۔ ناگری پسی وچ پنجابی کدے وی نہیں لکھی گئی۔ پنجاب دے خاص حالات نوں ویکھدیاں، دوناں پنجاباں دے لوکاں نوں گرمکھی اتے فارسی دوویں پسیاں سکھنیاں چاہیدیاں ہن۔

۲۔ سبھ پاسے غلط کاریاں ہو رہیا ہن۔ ایس لئی دل نوں آزردہ کسے حالت وچ نہیں کرنا چاہیدا۔ جیہڑے بھیڑی پنجابی لکھ رہے ہن اُہی ایس ویلے پنجابی زبان نوں سبھ توں ودھ مان وی دے رہے ہن۔ ایہہ گل سانوں نہیں بھلنی چاہیدی۔

بہت بہت پیار
تیرا اپنڑا اں
بلراج ساہنی

''سانجھی مٹی''

۔ ڈاکٹر خالد حسین ہوراں دیاں چوندیاں نظماں ۔

فاری شا (لندن)

پاگل خانہ

اجکل ساڈے دیش دا منتر و
جنگل ورگا حال
ڈرنال پاگل
خلقت ساری
دہشت چلدی نال
اکّ دی فصل اُگا کے آگو
ڈینگی چلدے چال
تاں اُوں آکھے شاہ حُسینا
آہیں دا بالن بال

☆

طوطیا من موتیا

ماسٹر جی نے
بچیاں توں پُچھیا
اِک رُکھ تے بیٹھے پنچھیاں اُتے
شکاری نے بندوق چلائی
دَسو، بچی؟
کِنے مرے تے کِنّے اُڈ گئے
دو مرے
زمین تے ڈِگے
باقی سارے بیٹھے رہے
کوئی نہیں اُڈیا
کیوں جے سارے
پالتو سَن
اُڈن والے مارے گئے
غداری دے جُرم وِچ

☆

حشر دیہاڑا

سورج دی ہانڈی وِچ
چن اُبال
دھرتی آکاش نُوں
رج کھنگال
منگل تے جا پا دھمال
حشر دیہاڑا
فیر وی آوے نا

☆

اتھرا من

رِیجھاں کھڈونے ہُندیاں نیں
ٹٹ جاندیاں نیں
جاں توڑ دِتیاں جاندیاں نیں
فیر بالڑا من
اُداسی دی لوئی
لپیٹ لیندا اے
پراکھاں
چیخاں ماردیاں نیں
تے اتھرے من نُوں
سُون نہیں دیندیاں

کھنڈر ضمیر

دھرتی ونڈی سی
رشتے پکے سن
مٹی سانجھی سی
اج رشتے ونڈے نیں
شبد کھِنڈے نیں
مٹی رت رنگی اے
رشتے پھٹر نیں
جِندڑی لیرو لیر اے
کھنڈر ہویا ضمیر اے

☆

بُکھے نال گلاں

بُکھا پائے دھمال نی
گھڑولی دی؟ نکال نی
کاراں کلیاں پھوکی جائیے
اِک دُوجے دیاں لیراں لائیے
چوراچکے رجّ رجائیے
دیش بھگتی دے نعرے لائیے
رنگ محلیں پینگاں پائیے
دھرتی کریئے لال نی
بُلھا پائے دھمال نی

☆

ڈریا ہو یا ربّ

آخری ساہ لین توں پہلاں
میں رُوح نوں پُچھیا
تُوں دوجا جنم
گلوب دے، کس حصے وچ
لیناں چاہیں گی
نیل، دجلہ، ٹیکشلا
جاں فیر
موہن جودوڑو دیاں
وادیاں وچ
جاں فیر میرے
اپنے گھر وچ
رُوح نے جواب دتا
میں ربّ نُوں اکلیاں
چھڈ نہیں سکدی
ات ڈونگھے سناٹے وچ
رب نُوں ڈر لگدا اے
اسلئی میں نواں جنم
لینا نہیں چاہندی

☆

خون سمندر

نفرت ذِلّت تے حقارت
دسو میں کیہ نہیں جریا
من دی بات کہن لئی میں
ہر دِن مریا
خون سمندر
روز ہاں تریا
نرک ہنڈاواں
کدھر جاواں

کوئی نہ میرا پیر فقیر
اکھوں میرے ڈُلدے نِیر
پر دُنیا کہندی
دھرتی میری
بے نظیر

☆

سیاست دا مرثیہ

کوڑُ سیاست
ٹھگی ٹھوری
ڈاڈھی آفت
چیکڑ گارا
پھس گئی خلقت
مورکھتا دا پاٹھ پڑھاندے
سورگاں دی نیں
سیر کراندے
پھٹیا ہویا دُودھ جماندے
جھوٹھ تماشے
چارو پاسے
نیّت کھوٹی
رِزق نہ روٹی
خلقت پئی کُرلاوے
راجیتی نُوں
شرم نہ آوے

☆

فریاد

تانگھاں، رِیجھاں
درد تے چیخاں
گھر وِچ جمیاں
من دے دِیوے
بُجھ گئے سارے
ہُن سرداری
من لئی تیرے
توں وی میری
اِک گل من لے
پھُل چنبے دا
موڑ دے میرا

☆

سچ مچائے مچ

ٹیلی ویژن چینلاں
دی بھرمار
سرمایہ داردا
نواں ہتھیار
سچ نُوں جھُوٹھ بناندے
جھُوٹھ نُوں سچ
چارے پاسے
مچا کے مچّ
کُوڑھن نال اگ پھرولن
سچ کدے نہیں دیندے بولن
عقل نُوں نوندراں مارن
زندگی دا جُسا ساڑھن

☆

- افسانہ -

زندہ آنکھوں کی داستان

خالد حسین

میرے کوٹ کی جیبوں میں آنکھوں کے کئی جوڑے پڑے ہیں جو میری رُوح کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ اُنکی کسک میرے ذہن ودِل کو چبھتی رہتی ہے۔ دائیں جیب میں پڑا آنکھوں کا جوڑا راج ناتھ رازدان کا ہے جو میرا لنگوٹیا تھا اور جسے سن سنتالی میں قبائیلیوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ ایک گولی اُسکے سر کو دو پھاڑ کر گئی تھی۔ وہ تو مر گیا تھا لیکن اُسکی آنکھیں زندہ تھیں اور مجھے گھُور رہی تھیں۔ مجھے بڑا ڈر لگا تھا۔ اپنے آپ سے ۔۔۔ قبائیلوں کی دہشت گردی سے اور گاؤں میں پھیلی وحشت سے۔ مگر میں اُسے بچانے کیلئے کُچھ نہ کر سکا۔ بھلا چوتھی جماعت میں پڑھنے والا ڈراسہا بچہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جماعتی راج ناتھ کی خُون آلود آنکھوں کو صاف کیا اور اپنی جیب میں ڈالا تا کہ یار کے پیار کی نشانی کو سنبھال کر رکھ سکُوں۔ آنکھوں دیکھے اِس سانحہ کی وجہ سے ایک لمبے عرصہ تک ہزاروں بچھو میری روح کو، میرے ضمیر کو ڈنک مارتے رہے اور میں درد سے کراہتا رہا۔

راج ناتھ رازدان کو مارنے کا واقع اتر میں ہوا تھا جو بانڈی پور کے بغل میں ایک گنجان آباد مگر بدحال گاؤں تھا۔ یہ سانحہ احمد شیخ کے کارن ہوا تھا جسکی زمین کا جھگڑا سمسار چند رازدان کے ساتھ برسوں سے چل رہا تھا۔ احمد شیخ کی زمین سمسار چند کے کھیتوں کے ساتھ لگتی تھی اور وہ یہ زمین ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ سمسار پنڈت گاؤں کا ساہُوکار تھا اور لوگوں کو سُود پر پیسے دیا کرتا تھا۔ احمد شیخ نے بھی اُس سے سُود پر پیسے لے کر بیٹی کی شادی کی تھی اور اِس سُود کی رقم کے عوض اپنی زمین سمسار چند کے پاس گروی رکھی تھی۔ احمد شیخ کے پاس نہ تو اصل رقم واپس کرنے کی سکت تھی اور نہ ہی سُود دینے کی گنجائش۔

مقررہ وقت پر رقم واپس نہ کرنے کی صُورت میں سمسار پنڈت نے اُس کی زمین پر زبردستی ہل چلانا شروع کر دیا تھا۔ بس یہ جھگڑا اُس کی اور اُس کے بیٹے یعنی میرے دوست راج ناتھ رازدان کی موت کا سبب بنا۔ احمد شیخ نے ہی سمسار چند کی مخبری کی تھی اور قبائیلوں نے اُسے اور اُسکے پورے خاندان کو بے دردی سے مار ڈالا تھا اور اُن کی ساری جمع پُونجی لُوٹ کر لے گئے تھے۔ گاؤں کے بیشتر لوگ سمسار چند کی ساہُوکاری کا شکار تھے اور اُس سے دُکھی بھی تھے لیکن اِس خُونی واقع کے لئے وہ سب احمد شیخ کو قصُوروار سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے احمد شیخ کا حُقہ پانی بند کر دیا اور اُس کے ساتھ سارے سماجی رِشتے ختم کر دیئے۔ اِسی وجہ سے احمد شیخ معہ عیال سرحد پار کر گیا اور پاکستانی انتظام والے کشمیر میں جا بسا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

میں نے بارہ مولہ کے سینٹ جوزف سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر شری پرتاپ سنگھ کالج سرینگر میں داخلہ لیا، جہاں سے بی، اے پاس کرنے کے بعد میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانُون کی ڈگری حاصل کی۔ مجھے پڑھنے لِکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اِس شوق نے میرے اندر شاعری کی چنگاری کو جنم دیا اور میں شعر کہنے لگا۔ جلد ہی میرا نام کشمیر کے ادبی حلقوں میں لیا جانے لگا۔ میرے مرحوم والد بھی اُردو اور کشمیری کے شاعر تھے اور قومی سطح پر جانے جاتے تھے۔ شاعری کا شہد شاید ابّا مرحوم نے پیدا ہوتے ہی مجھے چٹایا ہوگا یا پھر خُم تاثیر کا اثر ہوگا، جبھی تو میں ایک شاعر بن گیا۔ میں نے اپنے بل بوتے پر آل انڈیا ریڈیو کا امتحان پاس کر کے پروگرام پروڈیوسر کی نوکری حاصل کی، اور اپنی ذمہ داریوں کو خُوب سے خُوب تر نبھایا اور آواز کی دُنیا میں نام کمایا۔ میں نے مُلک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں آکاش وانی اور دُوردرشن مراکز میں بحیثیت پروگرام پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کام کیا اور آخر ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل دُوردرشن کے عہدہ سے سبکدوش ہوا۔ اِس ساری سرکاری اور ادبی آوارہ گردی کے دوران میں اپنے یار راج ناتھ کو کبھی نہیں بھُلا پایا۔ سرکاری کام کاج تو ہر کوئی کرتا ہے مگر جب بھی کسی کشمیری پنڈت بھائی بہن کی مِسل میرے پاس آتی تو راج ناتھ کی تصویر میرے سامنے آجاتی اور خُون میں لت پت اُسکی آنکھیں، مجھے فائل پر مُثبت لکھنے کے لئے میری قلم بن جاتیں۔ میں یہ بات پورے وثوق اور ذمے داری سے کہتا ہوں کہ میں نے کبھی کسی کشمیری پنڈت کی مِسل نامنظور نہیں کی۔ کبھی اُن کا کام نہیں روکا۔ ہمیشہ اُن کی دادرسی کی اور دوسرے اداروں سے بھی اُن کے کام کرواتا رہا۔ کیوں کہ میرا اور اُن کا نسلی اور ثقافتی رشتہ تھا جسے میں کبھی نہیں بھُولا۔ ہر کشمیری پنڈت کے چہرے میں مجھے راج ناتھ رازدان نظر آتا جس کی موت کے لئے جانے کیوں میں اپنے آپ کو ذمے دار سمجھتا تھا۔

میرے کوٹ کی دوسری جیب میں جو آنکھوں کا جوڑا پڑا ہے، وہ میرے دوست، ہم پیالہ اور ہم نوالہ لسّہ کول کا ہے جو ریڈیو کشمیر سری نگر کا ڈائریکٹر تھا۔ ہم دونوں اکٹھے مدھُوشالا جاتے اور جام ٹکراتے۔ کشمیر کی سیاست، سیاسی جوڑتوڑ، غیر سرکاری اور کبھی کبھی سرکاری دہشت گردی پر باتیں کرتے اور سوچتے کہ بھارت سرکار سے 1947ء کے بعد وہ کون سی حماقتیں ہوئیں کہ وہ لوگوں کے دِل جیتنے میں ناکام رہی۔ اِن غلطیوں کو سُدھارنے کیلئے کون کون سے قدم اُٹھائے جانے چاہئیں۔۔۔ میں اُن دِنوں دُوردرشن سری نگر کا ڈائریکٹر تھا اور لسّہ کول ریڈیو کشمیر کا۔ ہم دونوں دُوردرشن اور ریڈیو کشمیر سے ایسے پروگرام پیش کرنے کی سوچا کرتے کہ جن سے کشمیری نوجوانوں کو دہشت گردی سے نجات مِل سکے۔ لسّہ کول کشمیر اور کشمیریت کی علامت تھا۔ اُسکی دوستی ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائیوں کے ساتھ بڑی گہری تھی۔ اُسکے تعلقات افسرشاہی کے ساتھ بھی بہت اچھے تھے۔ وہ درازقد، خوبصورت، ہنس مُکھ اور محفلوں کی جان تھا لیکن جنگجُو اُسے بھارتی جاسوس اور مُخبر سمجھتے تھے اور اسی الزام میں اُسے مار دیا گیا۔ اُسکی آنکھیں ہمیشہ مُجھ سے

''چہارسُو''

پوچھتی ہیں کہ اُس کا قصُور کیا تھا؟ میں کیا بتاتا کہ اِس دھرتی پر اکثر لوگ بے قصُور ہی مارے جاتے ہیں۔ مجھے خود پر غُصہ آتا۔ میں اُداسی اور بے بسی کی آگ میں جھلستا رہتا اور پھر شرمندگی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

محمد اعظم ساگر پونچھ کے پہاڑی ہوسٹل کا وارڈن تھا۔ اُس کا بیٹا نشاط اعظم اگریکلچر یونیورسٹی کانپور سے ایم،ایس سی اگریکلچر کی ڈگری لے کر گھر آیا تھا۔ ایک دِن ساگر صاحب نے اُسے اپنے گاؤں ٹکا مجوڑی بھیجا تا کہ وہ مکئی کی فصل کی کٹائی کرا سکے۔ رات کو وہ اپنے گاؤں والے مکان میں سویا ہوا تھا کہ فوجی جنگجوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے ساگر صاحب کے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں نشاط کو اکیلا دیکھ کر اُسے سوتے میں آن دبوچا۔ نشاط نے لاکھ کہا کہ وہ جنگجو نہیں ہے بلکہ کانپور اگریکلچر یونیورسٹی سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے آیا ہے۔ اُس نے سارے ثبوت دیئے لیکن فوجیوں نے اُسکی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اُسے اُگروادی بنا کر بڑی بے رحمی سے مار دیا۔ پورے گاؤں میں اِس سانحے کے خلاف غُصہ بھڑک اُٹھا۔ فوج کے خلاف دھرنے دیئے گئے اور جلوس نکالے گئے۔ فوج کا اسرار تھا کہ اُنہوں نے کسی بے گناہ کو نہیں مارا ہے بلکہ مرنے والا اُگروادی تھا۔ یہ خبر سرکاری ذریعے سے ہم نے بھی اپنے چینل سے چلائی تھی جِس کا نشاط کو بہت افسوس تھا۔ سرکار نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے ایک انکوائری کمیشن بنایا جسکی رپورٹ کبھی نہیں آئی۔ محمد اعظم میرا شاعر دوست تھا۔ اِس لئے نشاط کے جنازے میں شامل ہونے کے لئے میں خصوصی طور پر براستہ مُغل روڈ آیا تھا۔ جب نشاط کی میت کو قبر میں اُتارا گیا تو اُسکی آنکھیں کفن سے باہر نکل کر مجھے گھورنے لگیں۔ گویا کہہ رہی ہوں کہ میں نے اُسکی جھوٹی خبر دُور درشن سے کیوں چلائی۔ میں کیسے کہتا کہ سرکاری فرمان کی نافرمانی سے نوکری چلی جاتی ہے اور پھر مصیبتوں کے پہاڑ ٹُوٹ پڑتے ہیں۔ نشاط کی آنکھوں کی برہمی اور خفگی میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے اُسکی آنکھوں کو ہاتھوں میں لیا اور کوٹ کی اوپر والی جیب میں رکھ دیا، اور شانت ہو گیا لیکن نشاط کی موت کا کرب ایک مُدّت تک مجھے ڈستا رہتا۔

میرے کوٹ کی اندر والی جیب میں پڑی دو آنکھیں غلام حسین کی ہیں جو طوطا گلی کا رہنے والا تھا اور فوج کا مخبر تھا۔ وہ جنگجوؤں کے سخت خلاف تھا اور اُن کی نقل و حرکت کے بارے میں فوج کو آگاہ کرتا رہتا۔ جب اُسکی حرکات کا پتہ اُنھیں چلا تو جنگجوؤں نے اُسے خبردار کیا اور دھمکی دی کہ وہ باز آجائے ورنہ اپنی کرتُوتوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہے۔ غلام حسین کو فوج کی پُشت پناہی حاصل تھی لہذا اُس نے جنگجوؤں کی دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ خُود کو بھارت ماتا کا سچّا سپُوت سمجھتا تھا اور وقتاً فوقتاً دہشت گردوں کی جانب سے ہونے والی کاروائیوں اور اُن کے ٹھہرنے کے ٹھکانوں کی اِطلاع فوج کو دیتا رہتا۔ آخر ایک شب جنگجوؤں نے اُس کے گھر پر ہلّہ بول دیا اور غُلام حسین اور اُسکے بیوی بچوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ کسی نے اُن کی فوتگی کا سوگ نہیں منایا۔ نہ بھارت ماتا کے سپُوتوں نے اور نہ ہی اُن کے رشتے داروں نے۔ جیسے انسان نہیں، گئے مرے ہوں۔ غُلام حسین کی آنکھیں یہ سلُوک دیکھ کر بڑا تڑپیں۔ وہ مُجھ سے گِلہ کرنے لگیں کہ کیا دیش بھگتی کا صِلہ ایسے ہی ملتا ہے؟۔ میں کیا کہتا۔ اِس طرح کی سرکاری اور عوامی بے رُخی کے کئی تماشے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اِس لئے میں نے غلام حُسین کی آنکھوں کو حفاظت سے کوٹ کے اندر والی جیب میں رکھ دیا۔

موضع ہرنی کے چار بے گناہ ہندوؤں کا قتل جنگجوؤں نے دِن دیہاڑے کیا تھا۔ لوگوں میں اِس واقع پر سخت غم و غُصّہ تھا۔ مینڈھر، پونچھ، سوُرن کوٹ اور راجوری سے ہندو برادری کے لوگ اس افسوس ناک سانحے کا سُن کر جوق در جوق ہرنی پہنچ رہے تھے۔ سرکار کے خلاف نعرے بازی ہو رہی تھی۔ پُتلے جلائے جا رہے تھے۔ فوج کو بدلہ لینے کے لئے اُکسایا جا رہا تھا۔ میں اِس حادثے کی آنکھوں دیکھی سچائی کو دِکھانے کیلئے خود ہرنی پہونچا تھا۔ لوگوں سے پتہ چلا کہ پچھلی رات بلنوئی میں تعینات فوجی بٹالین کے کُچھ سپاہی شراب کے نشے میں سرحد عبور کر کے کسی شادی والے گھر کی چھت پر سوئے ہوئے چھ لوگوں کو مار کر اُن کے سر کاٹ کر لے آئے تھے جِس کا بدلہ جنگجوؤں نے ہرنی گاؤں کے چار معصوم ہندوؤں کا قتل کر کے لیا تھا۔ اُس گھر کا بزرگ کرشن لال مرتے مرتے اپنی آنکھیں میرے حوالے کر گیا اور کہہ گیا کہ کب تک ہم دُشمنیاں پالتے رہیں گے اور ایک دوسرے کے سر کاٹتے رہیں گے۔ کیا ہم سرحد کے آر پار خوش بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔ سُکھ سندیس اور خوش خلقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ میں نے کرشن لال کی آنکھوں کو کوٹ کے اندر والی دوسری جیب میں رکھا تا کہ جب کبھی سرحد پار کی دُکھ سہتی آنکھیں مجھے ملیں تو میں کرشن لال کی آنکھوں کو اُن سے ملاؤں اور وہ دونوں اپنا درد سانجھا کر سکیں۔

میرے کوٹ میں چھوٹی بڑی اور بھی کئی جیبیں ہیں، جن میں بے شمار آنکھیں پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے چٹی سنگھ پورہ کے سِکھ شہیدوں کی آنکھیں، کولگام میں مستقل رہائش پذیر نو کشمیری پنڈتوں کی آنکھیں یا پھر پتھری بل کے معصوم شہیدوں کی آنکھیں جن کو فوجیوں نے اُگروادی بنا کر قتل کر دیا تھا، لیکن جب لوگوں نے فوجی کاروائی کے خلاف زوردار مظاہرے کئے اور ثابت کیا کہ شہید ہونے والے مقامی باشندے تھے جن کو فوجی پکڑ کر لے گئے تھے اور اُنکی لاشیں چھوڑ گئے تھے جب کہ اُن کا دہشت گردی سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا اور وہ سب بے گناہ تھے۔ لوگوں کے اندر بھڑکی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سرکار نے ایک کمیشن بنایا۔ مرنے والوں کی لاشوں کو قبروں سے باہر نکالا گیا اور اُن کا ڈی،این،اے ٹیسٹ کرایا گیا۔ تب جا کر کہیں سرکار کو لوگوں کی سچائی کا یقین ہوا۔ قصوروار فوجیوں کے خلاف کورٹ مارشل اور عدالتی کاروائی شروع کی گئی لیکن سزا کسی کو نہیں ملی بلکہ سبھی بے قصُور قرار دیئے گئے۔ جبکہ چٹی سنگھ پورہ اور کُلگام کے شہیدوں سے متعلق تو کوئی کمیشن بھی نہیں بنایا گیا جس کی زوردار مانگ کشمیری پنڈت اور سِکھ بھائیوں نے کئی بار کی تھی۔ ہمارے عدالتی نظام کے طور طریقے دیکھ کر اِن آنکھوں سے ٹپکا لہو پُکار پُکار کر کہہ رہا تھا کہ اُنکو کبھی انصاف نہیں مِل سکتا۔ یہ آنکھیں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ

ہمارے ملک میں اس طرح کی تاناشاہی کب تک چلے گی۔سچ کا ترازو کب تک ڈانواں ڈول رہے گا۔ یہ کب برابر تولے گا۔۔۔ پر میں کیا بتاؤں۔میں تو چوتھی جماعت سے لے کر آج تک بس یہی دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بھینسے اور بھیڑیئے ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔

جنونی اور فسادی دھرم پرچار،منفی سیاست کے کاروبار اور حد سے زیادہ میڈیا کی دروغ گوئی نے انسانی رُوح کو مردہ بنادیا ہے اور ذہن ودِل کو بیمار کر دیا ہے۔جِسکا علاج اب مذہبی صحیفے اور دھارمک گرنتھ بھی نہیں کر سکتے۔عام جنتا یہ باتیں نہیں سمجھتی۔یہ سادہ لومخلوق لچھے دار اور جھوٹے شبدوں کے جال میں گرفتار ہوچُکی ہے۔اِنہیں کون سمجھائے کہ چُوہا سانپ کو کیسے نِنگل سکتا ہے۔کیڑیاں پہاڑ کو کیسے اُکھاڑ سکتی ہیں۔ہرن بھیڑیئے کا شکار کیسے کر سکتا ہے۔میں نے دیکھا کہ سُقراط،منصور اور سرمد ایسے دوستوں کی دُنیا اُجڑ چُکی ہے۔اُنکی لِکھی تحریروں کا آج کوئی گاہک نہیں۔للّہ ماں،نُند رِشی،وارث،ہاشم،باہُو،بُلھا سب بھُول بھُلیاں بن چُکے ہیں۔اِس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اِن آنکھوں کو میں تیزاب کے عذاب میں مزید سڑنے نہیں دُوں گا۔میں نے ایک بڑی قبر کھودی اور کوٹ کی جیبوں سے سبھی آنکھیں نکال کر قبر میں دفنا دیں اور گھر چلا آیا۔گھر پہونچتے ہی میں نے اپنے ضمیر کے بخئیے اُدھیر دیئے۔ دِل اور دماغ میں کیل گاڑھ دیئے اور اپنی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔صبح دم جب میری نیند کھُلی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دفن کی ہوئی ساری آنکھیں میرے کمرے کی دیواروں سے مُجھے گھُور رہی ہیں اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔

☆

- بقیہ -

''عشق ملنگی''

ہیرا منڈی سے لے کر راولپنڈی،پشاور اور کراچی کے مینا بازاروں میں تلاش کیا مگر اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔میں نے ہمّت نہیں ہاری اور اپنے پیار کی گٹھری کو اُٹھائے،شہر شہر،گاؤں،گاؤں گھومتا رہا،نمازیں پڑھتا رہا،دُعائیں مانگتا رہا لیکن دُعائیں قبول بھی ہوں،یہ ضروری تو نہیں،۔بابو!اِس بکھّے اور دُلےّ کے ملک میں آ کر مجھے کوئی سُکھ نہیں مِلا،بس دُکھ میرے پلے پڑ گیا۔دِلوں کے سودے میں مجھے بڑا گھاٹا پڑا۔میں تو رانجھا بن گیا مگر فیروزہ ہیر نہ بن سکی۔اور یہ زخم میرے اندر ہمیشہ ہرا رہے گا۔مجھے تڑپاتا رہے گا۔آخر میں نے اپنے عِشق کا جنازہ خود پڑھا اور نارووال آ گیا۔یہاں پنج پیر کی درگاہ کے حُجرے میں رہتا ہوں۔درگاہ میں جھاڑو پھیرتا ہوں،صاف صفائی کرتا ہوں۔اگربتیاں اور موم بتیاں جلاتا ہوں اور جب من بہت اُداس ہو جائے تو اِس سڑک پر پتھر توڑتا رہتا ہوں۔لیکن میری آنکھیں آج بھی سوتے جاگتے فیروزہ کے چُوبارے کا طواف کرتی رہتی ہیں''۔

میں نے دیکھا کہ کالے خان کے اندر آج بھی عِشق کی جوت جل رہی تھی۔ہم دونوں بہت دیر تک وقت کی کتاب کے اوراق پلٹتے رہے۔وہ اپنے زخم کُریدتا رہا اور میں مرہم لگانے کا جتن کرتا رہا۔پھر میں نے کالے خان سے واپس لاہور جانے کی اجازت مانگی۔جب میں جانے لگا تو اُس نے مجھے روکا اور کہا:

''بابو!یہ پتھر تو میں توڑ لیتا ہوں پر فیروزہ کے دِل کا پتھر مجھ سے ٹوٹ نہیں سکا۔اور اس بات کا دُکھ مرتے دم تک میرے اندر زندہ رہے گا۔''

میں نے اُسے گلے لگایا۔اُس کے آنسو پونچھے اور وہاں سے چل پڑا۔وہ دُور تک مجھے جاتا دیکھتا رہتا۔میں نے نارووال سے لاہور کی بس پکڑی اور دوسرے دن واہگہ بارڈر پار کر کے جموں آ گیا۔پر کالے خان کے الفاظ سارے راستے میرا پیچھا کرتے رہے۔

''فیروزہ کے دِل کا پتھر''۔

☆

- انشائیہ -

عشق نچائے تھیا تھیا

خالد حسین

آزادی اِنسان کا پیدائشی حق ہے تو عشق کرنا اُس کا رُوحانی اور رومانی حق۔ ابلیس میاں آباد رکھیں اپنے قاضی نزاکت علی صاحب کو، بڑی زعفرانی طبیعت کے مالک ہیں۔ اکثر اپنے گنجے سر کی قسم کھا کر کہا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی لائف ہسٹری میں صرف دو عدد عشق فرمائے۔ وہ بھی مجنوں کے ایصالِ ثواب کے لیے۔ ایک دیوانِ عام میں اور دوسرا دیوانِ خاص میں۔ یعنی پہلا عشق لڑکپن میں ٹرائل کے طور پر نوراں دھوبن کی بیٹی سلیٹی بیگم سے، جب کہ دوسرا عشق بناسپتی گھی کی طرح شُدھ، سُدھ بُدھ گنوانے والی مشہور ماڈل اور فلم ایکٹرس سنگیتا سے۔

ہم ٹھہرے اُن کے لنگوٹیے یار، خوش گوار و غم خوار، چنانچہ اُن کے ہر سکھ دُکھ میں اُن کے رفیقِ خاص بنے رہے۔ ہماری اور اُن کی یاری کالج کے زمانے میں شروع ہوئی اور پھر پانچ سالہ پلان کے تحت ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ خُدا کا شکر ہے کہ آج ہم یار بازی میں خود کفیل ہیں۔

اللہ قاضی جی کی عمر دراز کرے، بڑی دلنواز شخصیت ہیں۔ آنکھیں نوابی، چہرا کتابی، ناک دو آبی اور دل شتابی، سر کی کھیتی بروقت آبیاری نہ ہونے کی وجہ سے گو بنجر رہ گئی لیکن اس کی تہہ میں ایک زرخیز خربوزی دماغ جیسے گدڑی میں لعل۔ اور اس گدڑی کے لعل نے بڑے بڑے طلسمی کارنامے انجام دیے، جن سے لطف اندوز ہونے کی سعادت ہم نے بھی حاصل کی۔

ایک بار وہ اپنے خزاں رسیدہ سر کو گُلِ گلزار یعنی پُر بہار بنانے کے لئے ہماری رفاقت میں حکیم نتھومل کی دوکان پر تشریف لے گئے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے حکیم صاحب بھی اُسی عارضہ میں مبتلا تھے۔ قاضی جی نے بڑی معصومیت سے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

قبلہ حکیم صاحب! اس گنجے پن کا کیا علاج ہے؟'' ''حکیم صاحب نے قاضی جی کا ظریفانہ جائزہ لیا اور حکیمانہ جواب دیا۔

''میاں اپنے سر کو ہمارے گنجے سر سے رگڑو۔ بال خود بخود کیمیائی عمل سے اُگ آئیں گے۔''

ایک بار ہم تیتر کے شکار کو نکلے کہ راستے میں ''کالی تیتری کمادوں نکلی کہ اُڈ دی نوں باج پے گئے'' یعنی قاضی جی تھوڑے سے رومانی ہو گئے اور ندی میں نہاتی ایک سانولی گل بدن کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اُس ناگن صفت حسینہ نے شور مچا دیا۔ آناً فاناً پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا اور دوشیزہ سے پوچھنے لگا کہ کیا ماجرہ ہوا۔ اُس دیہاتی کلوپترا نے قاضی جی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس حرامی بدمعاش نے اُس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی۔ قاضی نزاکت علی موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بھاگنا چاہتے تھے کہ لوگوں نے اُنہیں دبوچ لیا اور غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک آدھ تھپڑ اور دو تین لاتیں وگھونسے عنایت فرمانے کے بعد قاضی جی کو پنچایت میں پیش کیا اور فردِ جُرم یہ لگائی کہ نعوذ باللہ قاضی جی نے دُخترِ گلقند کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ لہٰذا قاضی جی کو باِتفاق رائے یہ سزا سنائی گئی کہ وہ مبلغ پانچ ہزار روپے ہرجانہ ادا کریں یعنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا جرمانہ۔ بڑی مشکل سے ہم نے اپنی سفارتی کوششوں سے تین ہزار روپے میں خلاصی کروائی اور کیوپڈ کو دو چار صلواتیں سُناتے ہوئے خُدا کا شکر ادا کیا۔ قاضی جی پر کالج کے زمانے سے ہی پروفیسر سامری بننے کا بھوت سوار تھا۔ وہ اُن کے کارناموں اور شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ درسی کتابوں کو چھوڑ کر کالے جادو سے لے کر بنگالی جادو جیسے ہر موضوع پر کتابیں خریدیں اور مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ تین سال کی کٹھن محنت بھی انہیں بی۔ اے کی ڈگری نہ دلا سکی لیکن اس دوران وہ علمِ جادو کے جید عالم بن گئے اور سامری کی سامراجیت کو للکارنے لگے۔

خیر چھوڑیئے! ہم قاضی نزاکت علی صاحب کی پریم کتھا بیان کر رہے تھے کہ بیچ میں یہ پروفیسر سامری آٹپکے۔ اپنے قاضی جی کو سن پچیس میں عشق کا ایسا روگ لگا کہ عاشقی کے گھوڑے گنجے سر پر چڑھ کر دوڑنے لگے اور وہ نوراں دھوبن کی بیٹی سلیٹی بیگم پر ڈورے ڈالنے لگے لیکن ابھی عشق کی چنگاری شعلہ بھی نہ بن پائی تھی کہ ایک دن کافی ہاؤس میں قاضی جی کو ماتھے پر پٹی بندھے گرم کافی پیتے دیکھا۔ سب دوست احباب فکر مند ہوئے اور پوچھا:

''قبلہ و کعبہ! یہ نگوڑا حادثہ کیسے پیش آیا۔'' تو بڑی بے نیازی سے جواب دیا:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو مار دیا گُل ادا کے ساتھ

''پر جناب والا! پھول کی پتی سے تو ہیرے کا جگر کٹتے سُنا ہے۔ ماتھا پھٹتے کبھی نہیں سنا، تو فرمانے لگے ''اماں یار! نیک بخت نے گُلدان سمیت مارا تھا اور یوں گُل کے گلدستے سے غُل ہوا چراغِ عشق۔''

قاضی جی کا دوسرا اور آخری عشق پنوں یارا اور رانجھے دِلدار کو بھی شرماتا ہے۔ اِس عشق کو قاضی جی نے اپنے فطری اور رومانی انداز سے نکھارا۔ اِس اچھوتے عشق کی ابتدا ایک فلم دیکھنے کے ساتھ شروع ہوئی۔ فرماتے ہیں:

''فلم کا آخری شو دیکھ کر جب ہم اپنے بستر پر آرام فرمانے لگے تو نیند کے فرشتوں نے ہمیں اپنے دربار میں طلب فرمایا اور ہم پر خوابِ سحری نازل فرمائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہم عمر خیام بنے رُباعیات کی تخلیق میں گم ہیں۔ اور بیوٹی کوئن سنگیتا ساقی بنی سوم رس کے مدھر جام پلا رہی ہے۔''

دوستوں سے خواب کی تعبیر پوچھی تو سب کی متفقہ رائے تھی کہ سنگیتا رنگیلے، البیلے قاضی جی کی زندگی میں سنگیت بھر سکتی ہے اور گا سکتی ہے کہ ''سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام'' بشرطیکہ اُن کا جادو سر چڑھ کر بولے۔ بس پھر کیا تھا، اُسی روز قاضی جی نے ظہیر الدین بابر کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے شراب کا بلوری

پیالہ توڑ دیا۔ مرغ تندوری پھینک دیا۔ کباب کی پلیٹ توڑ ڈالی اور گھر جا کر گوشت کی ہانڈی پھوڑ ڈالی اور پھر اپنے سر پر بچے چند بالوں کی قسم کھا کر یہ عہد کیا کہ جب تک وہ اپنے کالے جادو کی کالکھ کا سُرمہ سنگیتا کی آنکھوں میں نہ ڈال لیں گے تب تک وہ شراب، کباب اور شباب مع پیاز لہسن اور مچھلی انڈہ کا سختی سے پرہیز کریں گے اور کرشن کنہیا بن کر خالص دودھ، دہی، مکھن اور سبزیوں کا پریوگ کریں گے۔ ہم دوستوں نے اُن کے فولادی عزم کی شان میں گلہائے عقیدت پیش کیے اور اُن کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتے ہوئے اُن سے رُخصت ہوئے۔ چند روز بعد جب ہم اُن سے ملنے اُن کے طلسم کدہ پر گئے تو اُن کی اماں مسکین بیگم سے معلوم ہوا کہ حضور اپنے طلسماتی کمرے میں بند ہیں اور حکم ہے کہ کمرے کے اندر کوئی داخل نہ ہو۔ ہم اپنا سا منہ لے کر واپس محفل یاراں میں حاضر ہوئے اور قاضی جی کی قید تنہائی کے بارے میں جانکاری بہم پہنچائی۔ یارانِ غم خوار نے تشویش کا اظہار کیا اور ناچیز کو ہدایت کی کہ ہم سارے معاملات کی تفصیل پیش کرتے رہیں۔ کچھ دنوں بعد جب ہم دوبارہ قاضی جی کے آشیانہ گم گشتہ میں داخل ہوئے تو آپ کو اپنی امی جان کے پہلو میں بیٹھے ڈنر کھاتے دیکھا۔ دال اُبلی، کدو کی یخنی تڑکے کے بغیر اور چپاتی خشک۔ بڑا ترس آیا اپنے یار کی لاچاری پر۔ ہم نے پوچھا ''میاں! یہ کیا ماجرا ہے؟'' تو اشارے سے ہم کو خاموش کیا اور جیب میں سے کاغذ اور پین نکال کر کچھ لکھنے لگے۔ اس بیچ ہم کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ پورا کمرہ لُوبان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ایک بندر کی کھوپڑی اور گدھے کی پنڈلیوں کی ہڈیاں ایک طاقچے پر دکھائی دیں۔ مصلے بچھا ہوا۔ دیواروں پر خوفناک تصویروں کے پوسٹر آویزاں اور چھوٹے میز پر پھٹی پرانی کتابوں کا ڈھیر۔ قاضی جی نے کاغذ ہمیں دیا اور خود طلسماتی کمرے میں داخل ہو کر اندر سے چٹخنی لگا دی۔ کاغذ پر لکھا تھا:

''میں سنگیتا بیگم کو حاصل کرنے کے لیے چالیس روز کا چلہ کاٹ رہا ہوں۔ ٹھیک اکتالیسویں دن سنگیتا اُڑن کھٹولے پر سوار ہو کر قاضی منزل میں اُترے گی اور ہمارے دل کی دھڑکن بن جائے گی۔ لہٰذا بولنا چالنا، ملنا جلنا، ابلیسی ہدایت کے مطابق سخت منع ہے۔ چلہ مکمل ہونے تک کوئی دوست مجھ سے ملنے کی زحمت گوارا نہ کرے ورنہ بھسم ہو جائے گا۔'' ہم ڈرے سہمے دوستوں کی چوپال یعنی کافی ہاؤس پہنچے اور قاضی جی کی تحریر آتشگیر اُن کے سامنے رکھ دی۔ سب نے قاضی جی کے صدق و محبت کی داد دی۔ مقررہ دن ہم اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے تا کہ اُڑن کھٹولے کو آنگن میں اُترتے دیکھیں۔۔۔ سنگیتا سمیت۔ بالکل اُس ہیلی کاپٹر کی طرح جو اکثر اُترتا ہے، چیف منسٹر کی کوٹھی میں۔۔۔ چیف منسٹر سمیت لیکن:

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

جوں ہی قاضی جی اپنے طلسماتی کمرے سے نمودار ہوئے۔ مُوا دُور درشن سنگیتا کے درشن کرا رہا تھا۔ وہ ایک کالے کلوٹے کرکٹر کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے وان کھیرے سٹیڈیم کے ڈریسنگ روم میں بیٹھی تھی اور وہ کمینہ بلے باز سب کی نظریں بچا کر سنگیتا کی بلے بلے کر رہا تھا۔ قاضی جی سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اُنہوں نے گھر میں ایک کہرام مچا دیا۔ اُنہوں نے دلیپ کماری انداز میں فلم دیدار کی طرح اپنی آنکھیں پھوڑنے کی کوشش کی لیکن ہم نے چھری اُن کے ہاتھ سے چھین لی۔ پھر وہ کلر ٹیلی ویژن کی طرف لپکے ہی تھے کہ ہم نے اُن کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا کہ کہیں ٹیلی ویژن کی شامت نہ آ جائے۔ بیچاری مسکین بی بی بیٹے کی حرکتوں پر لعنتیں بھیج رہی تھی اور اضافے کے طور پر بیچ بیچ میں ایک آدھ ہاتھ بھی جما رہی تھی۔ ہم نے بڑی مشکل سے ان کو قابو میں کیا۔ اُنھیں باہر لے گئے۔ اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی حلالی کمائی سے کولڈ کافی پلائی اور وہ یوں شانت ہوئے۔ دوسرے دن یاروں کی محفل میں بیٹھ کر کہنے لگے:

''یار چلّے میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے ورنہ یہ ناممکن تھا کہ سنگیتا ڈارلنگ ہمارے بجائے کسی اور کی بانہوں میں ہوتی۔ خیر! ہم بلند حوصلہ انسان ہیں۔ ابھی ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ سنگیتا ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔ ہم دوسرا چلّہ کریں گے یہ چلّہ پہلے سے بہت سخت ہوگا۔ یہ بیس روز کا ہوگا اور اس میں جادو کے نایاب اور کامیاب نسخے آزمائے جائیں گے۔ پھر دیکھنا، سنگیتا بیگم ہماری زندگی کا مدھر سنگیت بن جائے گی، لیکن دوستو! اس پراسرار چلّہ کے لیے ہم آپ کا تعاون چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں کہیں سے اُلّو لا کر دیں کہ اُلّو کے خون میں تازہ جلے مُردے کی راکھ ملا کر اُس پر کالے جادو کا منتر پھونکنے سے بڑی سے بڑی پتھر دل حسینہ بس میں آ جاتی ہے۔ لہٰذا اُلّو کے ساتھ ساتھ تازہ جلے مُردے کی راکھ بھی لا دیجیے تو پھر آپ میرے کالے جادو کا کمال دیکھیں۔''

''اگر اُلّو نہ ملے تو؟'' ہم نے پوچھا۔

''تو پھر اُلّو کا پٹھا لے آئیں یعنی اُس کا بچہ''

تفریح طبع کے لیے چند روز بعد ہم اُن کے یارِ غار نشاط باغ میں بکھری دِلکش کلیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ناشپاتی کے ایک پیڑ پر اُلّو میاں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بچپن سے ماسٹر جی سے سُنا تھا کہ اُلّو ایک حیادار مخلوق ہے اس لیے دِن کے اُجالے میں کبھی آنکھیں نہیں کھولتا۔ اس لیے ہم بلا خوف و خطر اُلّو کی جانب لپکے اور نہایت ہنرمندی سے اُلّو جی کو پکڑ لیا اور قاضی جی کے حضور میں پیش کر دیا اور بولے:

''جناب بڑی مشکل سے شیتل ناگ مندر میں بیٹھے گوسائیں بابا کو پانچ صد روپے نقد کہ نصف جس کے اڑھائی سو ہوتے ہیں، دے کر اس اُلّو میاں کو خریدا ہے لہٰذا رقم ادا کی جائے تا کہ دوستوں کا حساب کتاب صاف رہے۔ قاضی جی نے رقم ہمارے ہاتھ پر رکھتے ہوئے تازہ جلے مُردے کی راکھ کا تقاضا کیا۔ ہم سب شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ چوکیدار کے ساتھ بیٹھ کر باقی دوست دنیا کی بے ثباتی پر گفتگو کرنے لگے اور ہم چوکیدار کی آنکھ بچا کر ایک جلتے مُردے کی گرما گرم راکھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ قاضی جی نے مردہ راکھ اور اُلّو میاں کو لیا اور اپنے جادوئی کمرے میں چلے گئے اور ہم قاضی جی کے دوستوں کو ساتھ لے کر مغل دربار ہوٹل جا پہنچے اور کانتی اور کباب مزے لے لے کر کھائے۔

قاضی جی نے اپنا دوسرا چلّہ بڑے زور و شور سے شروع کیا اور جب آخری دن ہم نے کھُل جا سم سم کہا تو قاضی جی اپنے سامری کمرے سے بڑے

خوش وخرم باہر نکلے اور فرمانے لگے:

ہم نے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ بالکل پرتھوی اور غوری کی طرح۔ کل ہم آپ سب کو ایک سرپرائز دیں گے یعنی آپ دیکھیں گے کہ ہماری محبوبہ سنگیتا بیگم ہماری بانہوں میں ہوگی۔

دوسرے روز ہم قاضی جی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اُن کی محبوبہ کا انتظار کر رہے تھے اور وقت گزاری کے لیے سٹار ٹیلی ویژن سے نصرت فتح علی خان مرحوم کو اپنی مشہور قوالی ’’اکھیاں اُڈیکدیاں، دل واجاں ماردا، آجا پردیسیا، واسطہ اُو پیار دا۔ آجا تینوں اکھیاں اُڈیکدیاں‘‘ گاتے دیکھ رہے تھے کہ اناؤنسر نے قوالی روک کر یہ خبر تصویروں کے ساتھ نشر کی کہ آج شام مشہور فلم ایکٹریس اور ماڈل سنگیتا بجلانی کرکٹر اظہر الدین سے شادی کے بندھن میں بندھ گئی ہیں۔ بس پھر کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہوا۔ اک قیامت برپا ہوگئی گھر پر جیسے ٹاسک فورس نے تلاشی کے لیے یلغار کر دی ہو۔ قاضی جی نے سارا سامان کھڑکی کے راستے باہر پھینک دیا۔ ماں کو دھکا دیا، ہمیں صلواتیں سنائیں۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور اپنے گنجے سر کو پیٹ پیٹ کر لال کر لیا۔ ہم نے ڈھارس بندھائی اور کہا:

قاضی جی! صبر کریں۔ ہوش میں آئیں۔ اگر آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ ہم تو زندہ درگور ہو جائیں گے۔ اس لیے حوصلہ رکھیں۔ ہم اس المناک واقع پر آپ کے ساتھ ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا کرے اور سنگیتا کو اظہر کی پہلی بیوی کے علاوہ آپ کی بھی آہ لگے۔ اُس کے حُسن کو زوال آئے۔ وہ ایک پوری کرکٹ ٹیم کو جنم دے اور ہر بچہ اُس کو ایسے ایسے بونسر مارے کہ اُس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے اور ہمیشہ کھانس کھانس کر اظہر کو گانا سُناتی رہے۔ ’من لاگو میرو یار رنجوری میں‘۔ اُس کا رنگ اُتر جائے اور اُسے اور تو اور خود اظہر بھی نہ پہچان پائے۔‘‘ ہم ڈھارس بندھاتے رہے۔ قاضی جی کے منہ سے جھاگ نکلتی رہی اور سٹار ٹیلی ویژن سے نصرت فتح علی خان مرحوم کی قوالی چلتی رہی:

ایس توں ڈاڈھا دُکھ نہ کوئی پیار نہ وچھڑے
کسے دا یار نہ وچھڑے، کسے دا یار نہ وچھڑے

...... افسانہ ......

کھیڈن نوں منگے چن ...... خالد حسین

آزادی دا اندولن ایتھے پچھلی اِک صدی توں چل رہیا ہے۔ ایس اندولن وچ لکھاں بندے مرے نیں تے ہزاراں بندھی بنائے گئے نیں۔ گُم نام قبراں دا کوئی حساب ہی نہیں۔ تن صدیاں توں ایتھے بندوق دا راج چل رہیا ہے۔ رتّ لبڑیاں سڑکاں اُتے فوجی بُوٹ مارچ کردے رہندے نیں تے اپنی طاقت دی دھمک نال لوکاں نُوں دھمکاندے رہندے ہن پر نہ آزادی لئی سنگھرش مُکیا ہے، نہ جلسے جلوس تے ہڑتالاں مُکیاں نیں اتے نہ ہی آزادی دے حق وِچ نعرے لگنے بند ہوئے نیں، ’’اِہ ملا ساہڈا اے، ایس دا فیصلہ اسیں کراں گے‘‘ ورگے نعرے ماردے ماردے کئی نسلاں مُک گیاں تے کئی نسلاں پیدا ہوئیاں۔

اِہ نعرے اج وی لگ رہے نیں۔۔۔ گلیاں محلیاں وِچ، کھیت کھلیاناں وچ، پہاڑاں، میداناں وچ۔ ہُن تاں معصوم نیانے نِکیاں نِکیاں ٹولیاں بنا کے آزادی دی کھیڈ کھیڈ دے نیں۔ اپنے اپنے گلی محلیاں وچ اتے سڑکاں تے آ کے جلوس کڈھدے نیں تے نعرے ماردے نیں:

’’آزادی ساہڈا اجماندرُو حق اے تے ساہڈا حق ایتھے رکھ‘‘

فوجی بچیاں نُوں سمجھاندے نیں، ڈراندے نیں پر اتھرے بچے نہیں من دے۔ اُہ اپنی کھیڈ بند کرن نُوں تیار نہیں ہوندے۔ فوجی طاقت تے بل دا پریوگ (استعمال) کردے نیں تے بندوقاں دے گھوڑے دبا دیندے نیں۔ بچے جوابی حملہ پتھراں نال کردے نیں۔ گولیاں دا مقابلہ پتھراں نال ہُندا اے پر پتھر گولیاں دا مقابلہ بھلا کِنجھ کر سکدے نیں۔ ہِسے وجوں کُجھ نیانے مارے جاندے نیں، کُجھ پھڑّ ہُندے نیں، کیوں جے نیانیاں نُوں آزادی تے بربادی دی کوئی سمجھ نہیں ہُندی۔

پر اج اِک عجیب گھٹناں گھٹی۔ نیانیاں دے جلوس نُوں تتر بِتر کرن لئی فوج نے ہلّا بولیا۔ کُجھ بچے مارے گئے، کئی زخمی ہوئے۔ فوجی کارروائی کارن دُکاندار اپنیاں دُکاناں چھڈ کے بھج گئے تے سڑکاں اِک دم ویران ہوگیاں۔ اِک جیپ وِچ بیٹھے فوجی افسر نے ویکھیا کہ اک دو ڈھائی سال دا جاتک اِک لاش کول بیٹھا رو رہیا اے۔ فوجی افسر نُوں بچے تے ترس آ گیا۔ اُہ جیپ توں اُتریا تے اُس بچے دے کول گیا۔ اوہنیں بچے نُوں چُکیا۔ آریہ نسل دا بچہ رج کے سوہنا سی۔ افسر نے اوہنوں چُپ کرایا۔ پیار کیتا تے اک دوکان تُو چاکلیٹ تے ٹافیاں لے کے بچے نُوں دِتیاں۔ چاکلیٹ تے ٹافیاں پھڑ کے نیانیاں چپ ہو گیا تے افسر نُوں ویکھ کے مسکان لگا۔ افسر اوہنوں لے کے اپنی جیپ ول آیا تے اوہنوں بڑے پیار نال پُچھن لگا ’’پُتر کُجھ ہور چاھیدا اے‘‘ بچے نے ہاں وِچ گردن ہلائی۔

فوجی افسر نے پُچھیا، ’’ہور کیہ چاھیدا اے؟‘‘

بچے نے بھول پنے وِچ جواب دِتا۔۔۔

’’آجادی‘‘۔۔۔ تے فوجی افسر بچے نُوں ویکھ کے سوچیں پے گیا۔

ڈاکٹر اور یاسر کی بیگمات۔ عاصمہ اقبال بٹ اور ثناء فاروق بیگ

عزیزی مومن کاظمی اور منیندر سنگھ کپورایڈووکیٹ کے ساتھ

ٹیکسلا میں گندھارا تہذیب کے آثار دیکھتے ہوئے

گورودواہ کیرتن گڑھ، علی بیگ (ضلع میر پور) شوکت مجید ملک کے ہمراہ

مشہور پنجابی ناول نگار فخر زمان کے ساتھ

ڈاکٹر سدھیر سنگھ بلوریہ اور ڈاکٹر موہن پال سنگھ کے ہمراہ

جناب پرویز دیوان (آئی اے ایس) اور خالدہ کفایت کے ساتھ

پاکستانی ادیبوں مشتاق کنول مرحوم اور نین سکھ کے ساتھ

جناب پرکاش سنگھ بادل اور ڈاکٹر جسپال سنگھ کے ہاتھوں حوصلہ افزائی

ہڑپہ میں پانچ ہزار سال پرانے آثار دیکھتے ہوئے

جناب عبدالمجید ملک کے ہاتھوں عزت افزائی

سابقہ گورنر شری این این وہرا کو کتاب پیش کرتے ہوئے

انوارِ مدینہ

نعت رسول مقبولؐ

سرورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں
وفورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

حضوری کا سندیسہ مل گیا ہے
حضورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

میسّر ہیں اب انوارِ مدینہ
کہ نورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

ابھی فرصت کہاں کچھ اور دیکھوں
اُمورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

نئے موضوع ظاہر ہو رہے ہیں
شعورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

بہت کچھ مجھ پہ ظاہر ہو رہا ہے
ظہورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

معانی کا سمندر سامنے ہے
سطورِ نعت میں اُترا ہوا ہوں

نسیم سحر (راولپنڈی)

نعت

جب تصور میں مدینے کا سفر دیکھتا ہوں
اپنی کیفیتِ ایماں کا اثر دیکھتا ہوں

سوچتا ہوں تو پہنچ جاتا ہوں اُن کے در تک
اپنی پلکوں کو جُھکا کر وہ نگر دیکھتا ہوں

کیسے بچھتی تھی زمیں آپ کے نعلین تلے
کیسے جُھکتے تھے سرِ راہ، شجر دیکھتا ہوں

اُمِّ معبد کا وہ خیمہ ہوا روشن اُن سے
نُور افشانیِ ہجرت کا سفر دیکھتا ہوں

تیرہ و تار دلوں پر بھی ضیا پاش ہوئی
نکل آئی تھی جو فاراں پہ سحر دیکھتا ہوں

کون پُوچھے گا قیامت میں سِوائے اُن کے
حشر میں بھی کَرَمِ خیرِ بشر دیکھتا ہوں

کون کر سکتا ہے میرے غمِ دل کا درماں
میں تو بس اُن کی طرف شام و سحر دیکھتا ہوں

جب بھی اُن کے کَرَم و لُطف میں آتا ہوں نبیل
اُن کا گھر دیکھتا ہوں، جُنبشِ در دیکھتا ہوں

نبیل احمد نبیل (لاہور)

رقیب

جمیل عثمان
(نیویارک)

"تو میں اس کے ساتھ سوئی تھی کیا؟" سونیا نے تنک کر پوچھا۔

شارق یہ جملہ سن کر تلملا اٹھا۔ "تم نے یہ بات زبان سے نکالی بھی کیسے؟"

"تمہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا سب اس کے ساتھ تھا"

"میرا مطلب تھا، میری پیاری بیگم، کہ جب تم ملتان گئی تھیں تو تمھارا اس کا دن رات کا ساتھ تھا۔ سارا وقت ساتھ رہنا، ساتھ کھانا پینا، ساتھ گھومنا پھرنا ۔اور سونے جاگنے کا وقت بھی ایک ہی تھا تم دونوں کا۔ جب تم سونے جاتیں وہ بھی جاتا ہوگا اور جب تم جاگتی ہوں گی وہ بھی جاگ جاتا ہوگا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ تم دونوں ساتھ سوتے تھے"۔

"تم بلاوجہ مجھ پر شک کرتے ہو"۔ سونیا کے لہجے میں شکایت تھی۔

"میں شک نہیں کر رہا۔ بس مجھے یہ سوچ کر حسد اور جلن ہوتی ہے کہ تم چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتی ہوں گی"

"ہاں تو کیا کرتی؟ اس کا ماسٹرز ختم ہو چکا تھا، وہ کوئی جاب نہیں کر رہا تھا۔ گھر میں ڈرائیو کرنے والا بس ایک وہی تھا۔ اس لئے جہاں بھی جانا ہوتا بڑے ابو اسے ہی کہتے کہ ہمیں لے کے جائے" سونیا نے وضاحت کی، "اور پھر میں اکیلی اس کے ساتھ تھوڑی پھرتی تھی۔ صائمہ ہوتی تھی۔ کبھی امی اور بڑی امی بھی ساتھ جاتی تھیں"

"اچھا! صحیح بتاؤ تم ایک بار بھی اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی نہیں گئی تھیں؟"

"امم۔۔۔ہاں۔۔۔آں۔۔۔ایک آدھ بار گئی تھی"۔

"دیکھا! آخر سچ بات زبان سے نکل نا تمھارے!" شارق اچھلا، "بس اسی بات سے جان جلتی ہے میری۔"

"ارے تو میں کون سا اس کے ساتھ عشق لڑا رہی تھی؟" سونیا روہانسی ہوگئی، "ضرورت کے وقت ہی جاتی تھی جب سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے اور کوئی جا نہیں سکتا تھا"۔

"چاہے کچھ بھی ہو، میرے سینے پہ سانپ لوٹتے ہیں وہ سچویشن یاد کر کے کہ تم اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی جا رہی ہوگی"۔

"اچھا بابا معاف کر دو" سونیا نے ہاتھ جوڑے۔ غلطی ہوگئی۔ اب نہیں جاؤں گی"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شارق اور سونیا جس شخص کے بارے میں بات کر رہے تھے وہ سونیا کا چچازاد بھائی دانیال تھا، اس کے بڑے ابو کا اکلوتا بیٹا۔ ماسٹرز ختم کرنے کے بعد وہ کوئی نوکری ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی دوران سونیا اپنی والدہ کے ساتھ ملتان آئی تھی اور اپنے چچا کے ہاں مقیم تھی۔ شارق اپنے کاموں میں اس قدر مصروف تھا کہ اسے جانے کی چھٹی نہیں مل سکی۔ لہٰذا وہ لاہور میں ہی رہا اور سونیا اپنی امی کے ساتھ ملتان چلی گئی۔ شارق کو سونیا کا اپنے چچازاد سے میل ملاپ بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک وقت دانیال سونیا کا امیدوار رہ چکا تھا۔ لیکن سونیا شارق کو چاہتی تھی جو اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ سونیا کے گھر والوں نے لڑکے کے بارے میں بڑی چھان پھٹک کی تو معلوم ہوا کہ لڑکا اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، شکل صورت کا اچھا ہے، تعلیم یافتہ ہے اور کماؤ ہے۔ اگرچہ وہ چاہتے تھے کہ سونیا خاندان میں ہی بیاہی جائے مگر شارق بھی کسی سے کم نہیں تھا اور وہ ان کی بیٹی کی پسند تھا۔ اس لئے شادی ہوگئی۔

اگرچہ شارق میاں جانتے تھے کہ سونیا نے دانیال کے مقابلے میں انہیں اپنی زندگی کا ساتھی چنا ہے، اس کے باوجود انہیں دانیال سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ان کے دماغ سے یہ بات نکلتی ہی نہ تھی کہ دانیال کبھی سونیا سے شادی کا خواہش مند تھا۔ اس لئے ان دونوں کا ساتھ رہنا انہیں بالکل گوارا نہ تھا۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ ان کی چلتی نہ تھی۔ سونیا کے بڑے ابو اس کے ابو کے بڑے بھائی تھے اور بہت بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ پورا خاندان ان کی عزت کرتا تھا اور کوئی بھی ان کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ وہ تو سونیا انہیں بڑی عزیز تھی، اس لئے انہوں نے اپنے بیٹے کے مقابلے میں اسے شارق سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اکثر و بیشتر سونیا کے امی ابو ملتان جاتے اور کبھی کبھی وہ بھی ان کے ساتھ جاتی۔ وہ وقت شارق پر بہت بھاری گزرتا تھا۔ وہ سونیا کو ملتان جانے دینا بھی نہیں چاہتا تھا اور روکنا بھی اس کے لئے محال تھا۔ کوئی پوچھتا تو وہ کیا کہتا کہ دانیال کی وجہ سے؟ نہیں! وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لئے وہ دل پر جبر کر کے سونیا کو جانے کی اجازت دے دیتا۔ جب موقع ہوتا تو وہ بھی اس کے ساتھ ملتان چلا جاتا۔ تب اس کے دل کو سکون ہوتا۔ حالانکہ سونیا نے بارہا اسے یقین دلایا تھا کہ وہ صرف اس سے محبت کرتی ہے۔ دانیال کے بارے میں ایسا سوچنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ مگر شارق میاں کو کون سمجھائے۔ دل میں جو شک کا پودا تھا وہ جڑ پکڑ چکا تھا۔

سونیا کے ملتان سے آنے کے بعد تھوڑے دنوں تک کھٹ پٹ چلتی رہی ۔کبھی سونیا منہ پھلا لیتی تو کبھی شارق ناراض ہو جاتا ۔لیکن دونوں ایک دوسرے سے غصہ ہو کر رہ بھی تو نہیں سکتے تھے ۔کبھی سونیا اسے منا لیتی اور کبھی شارق سونیا کو۔ دن ہنسی خوشی گزرتے رہے کہ ایک سال کے بعد سونیا کے ملتان جانے کا سوال ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار اس کی کزن صائمہ کی شادی تھی۔ اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ صائمہ کی شادی ہو اور سونیا نہ جائے۔ شارق کو ایک مرتبہ پھر

مشکل فیصلہ کرنا تھا۔ یا تو وہ سونیا کو نہ جانے دے یا خود اس کے ساتھ ملتان جائے ۔اور دونوں صورتیں ممکن نہیں تھیں ۔ دفتر کی طرف سے اسے بزنس ٹرپ پر ہالینڈ جانا تھا۔ ادھر سونیا کے بڑے ابو کی خواہش تھی کہ سونیا شادی سے ایک مہینے پہلے سے آ کر ان کے ہاں رہے۔ شارق جانتا تھا کہ ان کا بیٹا دانیال اسی گھر میں رہتا ہے۔ اسے ملتان میں ہی ایک اچھی نوکری مل گئی تھی۔ اور یہ سوچ کر ہی کہ سونیا اور دانیال ایک ہی گھر میں رہیں گے اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ۔ وہ یہ بھی سوچتا کہ شادی کا گھر ہے، ہزار کام ہوں گے، شاپنگ پر جانا ہوگا، دولہے والوں کے گھر کے چکر لگیں گے۔ اور یہ ایک دو دن کا کام نہیں تھا۔ پورا مہینہ یہ سلسلہ چلنے والا تھا۔

"نہیں، نہیں! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا ۔" شارق نے سونیا سے کہا:

"شارق، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم بات سمجھنے کی کوشش کرو" ۔ سونیا گڑگڑائی۔

"میں جانتا ہوں۔ تم جاؤ گی، خوب محفلیں جمیں گی۔ خوب گھومنا پھرنا ہوگا۔ خوب شاپنگ ہوگی۔ ہر وقت کا ساتھ! کیا کہنے!"

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟" وہ لجاجت سے بولی، "تم جانتے ہو کہ میں تم سے اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں ۔ میرے دل میں کسی اور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو پھر تم بھی میرے ساتھ ہالینڈ چلو۔

"میں کیسے تمھارے ساتھ چلوں؟ وہاں بڑے ابو، بڑی امی اور سارے خاندان والے کیا سوچیں گے کہ گھر میں شادی ہے اور سونیا سیر سپاٹے کے لئے چلی گئی ہے۔"

"سیر سپاٹے کے لئے نہیں، تم اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہو"۔

" مگر ہالینڈ میں تمھارا کام ہے میرا تو نہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ تم میرے ساتھ رہو گی ۔ فارغ اوقات میں ہم وہاں گھومیں پھریں گے۔"

"شارق، پلیز!"

"یہ کہو نا کہ تمہیں میرے ساتھ گھومنا پھرنا اچھا نہیں لگتا بلکہ اس کے ساتھ اچھا لگتا ہے" شارق بپھر گیا، "میں جانتا ہوں کہ وہاں تمہیں خوب خوب مواقع ملیں گے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے۔"

"اوہ شارق! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں ۔ میں صرف تمہاری ہوں۔" سونیا کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ "وہاں جانا میری مجبوری ہے اور تم یقین کرو ایسا کچھ بھی نہیں جیسا تم سوچ رہے ہو"

بحث کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ سونیا کے والدین نے بھی شارق کی منت سماجت کی کہ وہ اسے جانے دے۔ طے یہ ہوا کہ شارق ہالینڈ سے واپس آتے ہی چھٹی لے کر ملتان آ جائے گا شادی میں شریک ہو جائے گا۔ شارق بادل ناخواستہ مان گئے۔

شارق ہالینڈ روانہ ہو گیا اور اس کے دوسرے دن سونیا اپنے والدین کے ساتھ ملتان پہنچ گئی۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں ۔ یہ لوگ بھی جا کر اس میں شامل ہو گئے ۔ کبھی درزی کے ہاں تو کبھی سنار کے ہاں، کبھی اس مال میں تو کبھی اس مال میں ۔ دانیال کا کام ہی یہی تھا کہ آفس سے آنے کے بعد خواتین کو لے کر وہاں جائے جہاں انہیں جانا ہو۔ سونیا دانیال کے ساتھ اکیلے کہیں جانے سے احتراز کرتی تھی۔ اسے شارق کا خیال آتا تھا۔ مگر کبھی کبھی مجبوری میں اسے جانا ہی پڑتا تھا۔

اور ایک روز ۔۔۔۔ جب وہ دانیال کے ساتھ اکیلی گاڑی میں جا رہی تھی تو ۔۔۔ ایک بڑا سا ٹریلر جوان کی گاڑی کے برابر چل رہا تھا، ایک موڑ کاٹتے وقت الٹ گیا اور ان کی گاڑی پر آ گرا۔ دونوں اس کے نیچے دب کر جان بحق ہو گئے۔

شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ شادی کو تو کینسل ہونا ہی تھا۔ مگر گھر میں اتنا بڑا سانحہ! ایک بھائی کا بیٹا اور ایک بھائی کی بیٹی عین عالم شباب میں انہیں داغ مفارقت دے گئے تھے۔

شارق ہالینڈ میں تھا اور اسے یکبارگی یہ خبر نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن چھپانا بھی مشکل تھا۔ اس لئے کہ وہ روزانہ سونیا سے بات کیا کرتا تھا۔ کسی طرح ایک دن گزار کے اسے خبر دی گئی۔ شارق کے لئے یہ خبر نا قابل برداشت تھی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں رہا۔ اس پر seizure کے دورے پڑنے لگے۔ اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

ادھر ملتان میں تدفین زیادہ دیر روکی نہیں جا سکتی تھی۔ شارق کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ وہ سفر کے قابل نہیں تھا۔ دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کو دفنا دیں۔ ان کی قبریں برابر برابر بنائی گئیں ۔ پندرہ دنوں کے بعد شارق سفر کے قابل ہو سکا۔ ایر پورٹ پر سونیا کے ابو اور بڑے ابو خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اسے لینے آئے تھے۔ وہ پتھر کے بت کی مانند سب سے ملتا رہا اور پھر خواہش ظاہر کی کہ اسے سیدھا قبرستان لے جایا جائے۔

جب وہ قبرستان پہنچا اور وہاں اس نے سونیا اور دانیال کی قبریں ساتھ ساتھ دیکھیں تو بے اختیار گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے سسکیوں کے درمیان یہ الفاظ نکلے:

"دانیال! تُو زندگی میں سونیا کو نہیں پا سکا تو مر کر تُو نے اسے مجھ سے چھین لیا!"۔ پھر وہ چیخا۔

"اور تم سونیا! کیوں کہی تھی تم نے مجھ سے اس کے ساتھ سونے والی بات؟" پھر وہ زمین پر دوہتڑ مارتا ہوا بولا "اب میں اس احساس کے ساتھ کیسے جیوں گا کہ تم قیامت تک اس کے برابر میں سوتی رہو گی"۔

مستونگ میں مشاقیت

خودنوشت افسانہ

آغا گل

(کوئٹہ)

بلوچستان یونی ورسٹی میں کا ایل شیپ ڈھانچا جانے کب سے کھڑا تھا۔سریاب ڈگری کالج سے گزرتےہوئے روز اسے دیکھا کرتے۔پنجاب کے کالج آف منرولوجی کے تمام اسٹاف نے کوئٹہ آنے سے انکار کیا تھاچناں چہ اس ویران عمارت میں بلوچستان یونی ورسٹی کھولی گئی جس کے اولین طلبا ہم سبھی تھے۔چوں کہ ہم بلوچستان کے اولین پوسٹ گریجویٹ تھے،قدم بھی سنبھل سنبھل کے رکھتے کہ کہیں ہماری علمیت سے زلزلہ نہ آجائے۔

بلوچستان کی اولین حکومت قائم ہوئی تو مولوی گھر گھر جاتے''جنت میں گھر چاہیے تو ملاں کو ووٹ دو''ان ہی گنہ گار آنکھوں سے وال چاکنگ بھی دیکھی کہ''فلاں کو ووٹ دو جنت میں گھر بناؤ''ہر مسلمان جنت میں گھر فلیٹ یا پلاٹ چاہتا ہے لہٰذا ملاں اسمبلی میں آگئے۔پشتون کی نمائندگی ملاں کررہے تھے جب کہ بلوچ اپنے سرداروں،نوابوں کو لے آئے۔حکومت کرنے کا معروف نعرہ کہ ایک خودساختہ دشمن کے خلاف لوگ اپنے گردجمع کرتے چلے جاؤ۔ create an enemy کے تحت آبادکاروں کے خلاف نعرہ لگا کہ بلوچستان کے سارے وسائل یہی چاٹ جاتے ہیں،انھیں فوراً دیس نکالا دیا جائے۔دیکھتے ہی دیکھتے ساڑھے تین ہزار استاد،لیکچرر چلے گئے۔ساتھ ہی ساتھ اڑھائی ہزار تجربہ کار پولیس والے بھی ٹرینوں میں روانہ کردیے۔گلیاں رانجھے یار کے لیے سُونی ہوگئیں اور وہ مزے سے مٹرگشت کرنے لگا۔اسکولوں،کالجوں کی طرف ٹنڈ منڈ عمارتیں ہی رہ گئیں تو دھڑا دھڑ محمود وایاز کو بھرتی کرنے لگے۔بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ بستہ بے کے بدمعاش بھی ریل ویز رسالدار بھرتی کرلیے۔

میری تعیناتی فورٹ سنڈیمن کردی گئی۔وزیر تعلیم میرگل خان نصیر نے میرا انٹرویو لیا تھا اور سردار عطاء اللہ مینگل نے بھرتی کیا۔پروفیسر خلیل صدیقی نے میرا تقرری نامہ جاری کیا تھا۔میں وہی بلیک وارنٹ لے کر استادِ محترم کے دفتر ڈھیر ہوا کہ اس پوسٹنگ سے بہتر ہے مجھے گولی ماردیں۔فورٹ سنڈیمن میں ملاں کا اتنا دبدبہ ہے کہ فٹ بال کے کھلاڑی بھی گھیرے دار شلوار اور پگڑی پہن کر میچ کھیلتے ہیں۔یوں تو میں خلیل صدیقی کی کلاس سے غائب رہا کرتا تھا،مگر یہ داستانِ غم سن کر ان کی آنکھیں ڈبڈا آئیں۔معلوم ہوا کہ مستونگ کالج سے بھی ایک لیکچرر لالہ موسیٰ جنکشن جلاوطن کیا جارہا ہے،اس کی جگہ مجھے لگا دیا گیا۔علم کے مینار ٹرینوں میں بھر بھر کے لالہ موسیٰ جنکشن بھجوائے جاتے۔جہاں مہاجر کیمپ سجا تھا،وہیں انھیں پنجاب کے مختلف اسکولوں،کالجوں کے آرڈر تھما دیئے جاتے اور خوشونت کی''ٹرین ٹو پاکستان'' کی طرح سدھارتے۔

مستونگ کوئٹہ سے دو روپے کے فاصلے پہ تھا۔مرحومین لیکچرز کے یہی پیریڈ ہوا کرتے تھے۔انگلش کے جمشید اور مجھے وہی کلاسیں دی گئیں۔ہم کوئٹہ سے منہ اندھیرے نکلتے،سڑکوں پہ صرف چوکیدار اور کچھ شب دیجور کے کتے پھر رہے ہوتے۔سرکاری ملازمین قندھاری بازار سے امداد سینما تک بے چینی سے پہلو بدلتے بار بار گھڑی دیکھتے بسوں کا انتظار کرتے۔ڈرائیور مہربان ہوتا تو فلات روڈ سے ناکے پر اتار دیتا ورنہ شہر کے اندر داخل ہوکر بس اڈے پہ اتار دیتا۔جس کے باعث ہم استاد کا وقار برقرار رکھتے ہوئے دوڑتے تو نہ مگر ہمارا چلنا فاسٹ واک سے بھی تیز رہتا۔جمشید کا قد چھوٹا تھا۔چھوٹے پہیے کی طرح تیز چلنے کے باوجود اس کی رفتار کم ہی رہتی۔کالج میں پرنسپل ایوب ہمیں آنکھیں دکھاتا کہ روزانہ کوئٹہ کیوں آتے جاتے ہو،قانون کے مطابق یہیں رہو۔اس کے ظالمانہ رویے کے سبب ہم نے بہ طور انتقام اس کے نام کے لہجے بدل کر ایوب خان کی بجائے عیوب خان کرڈالا۔جو مستونگ میں بہت ہی مقبول ہوا۔اس کی کج ادائی کے صرف ہم ہی شاکی نہ تھے۔

کچھ دن تو علم پھیلانے،قوم کے معمار ہونے کا زعم رہا۔وقت کے ساتھ لیکچررز میں بیداری کی لہر دوڑی کہ نہ تو ترقی ہے نہ زیبائش یا پرموشن پالیسی،لہٰذا ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے کیوں کہ لیکچرار اپنی یونین نہیں بنا سکتے۔سائنس کالج کوئٹہ میں لیکچرز کا اجلاس ہوا۔مجھے اپنی مقبولیت کا اندازہ نہ تھا۔نائب صدر کے لیے میرا نام دیا گیا تو کوئی بھی مقابل نہ آیا۔میں بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔بلوچوں کے تمام ووٹ میرے ساتھ تھے۔بلوچستان لیکچرز ایسوسی ایشن کا مخفف بی ایل اے تھا،جس کا میں نائب صدر تھا۔میں نے بھی پر پرزے نکالے۔عیوب خان سے کہہ سن کر ٹائم ٹیبل بدلوایا اور گیارہ بجے وقت رکھا۔صبح خیزی سے بھی جان چھوٹی۔

ہم تو جذباتی ہوکر علم پھیلانے آئے تھے مگر جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ صدیوں پہ پھیلی اس جہالت کا جمود توڑنا سہل نہیں رہا ہے۔کسی روز پورا نظام ہی منہدم ہوجائے گا جس میں دب کر نظریات بھی فوت ہوجائیں گے اور ہم مستونگ کی بسوں میں آتے جاتے ریٹائر ہوجائیں گے۔

ایک روز کالج میں عید اتر آئی۔جسے دیکھو ہنس مسکرا رہا ہے عیوب خان کی بتیسی بھی باہر تھی۔ہمارا عملہ جو عموماً ملنگوں کی طرح علی دی بوٹی کا شائق تھا اور اپنے میں مدہوش رہتا،اس کی بھی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ہم اسٹاف روم میں بیٹھنے کی بجائے پرنسپل کے کمرے میں ہی جا بیٹھتے۔اس سے روزانہ چائے پیتے۔چہرہ اقدس بھی دکھاتے کہ حاضر ہیں۔قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔پرنسپل روز ہی سنایا کرتا کہ تن خواہ پورے ماہ کی لے کر آتے چند روز ہیں۔پھر بھی ہم ہفتہ میں دو تین روز ہی آتے۔آج تو پورا کالج ہی کشتِ زعفران تھا۔بڑا تجسس ہوا۔دریافت کرنے پر عیوب خان نے مژدہ جاں فزا سنایا کہ پروفیسر مشتاق احمد کی خضدار سے مستونگ ٹرانسفر ہوگئی۔مجھے حیرت ہوئی کہ سارا کالج کیوں کھلبلا جارہا ہے۔

شام میں لیاقت بازار سے گزرتے ہو پروفیسر زیبائش علی سے

ملاقات ہوئی۔ان کے ہم راہ ایک بدحواس سا شخص تھا۔عمر کوئی پینتالیس برس رہی ہوگی۔طویل قامت۔اس کی شخصیت میں نمایاں چیز اس کے بڑے بڑے کان اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں تھیں۔وہ کچھ مضطرب سا تھا جیسے بکری گم ہوگئی ہو۔حال احوال کے بعد زیبائش علی نے دریافت کیا کہ بی ایل اے کیا کر رہی ہے؟ میرے جواب نے تسلی دی کہ بی ایل اے محکمہ کے گلے بلا بن کر پڑے گی۔

ابھی گفت گو جاری تھی کہ وہ شخص زیبائش کے بائیں کان سے لگ کر بولا،''چھوڑ اس کو، چلو۔'' زیبائش نے سنی اَن سنی کر دی تو وہ شخص دائیں کان سے آلگا اور بجائے سرگوشی کے غصے میں بولا،''اس سے جان چھڑاؤ، چھوڑو چلو۔''اس ناشائستہ رویہ پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔''ان کا تعارف؟'' میں نے غصے میں دریافت کیا۔زیبائش علی بدستور پرسکون تھا۔''ان حرکتوں کے بعد بھی کسی تعارف کی ضرورت ہے؟ یہ ہی پروفیسر مشتاق ہے۔'' مشتاق نے لفٹ نہ کرائی اور زیبائش کو کشاں کشاں لے چلا۔

اگلے روز قہقہوں اور ہنسی کے جلو میں مشتاق چلا آیا۔ پرنسپل کے کمرے میں داخل ہو کر علیک سلیک کی۔دو آرمی آفیسر بھی موجود تھے۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جیب سے شیشی نکال کر عیوب کو پیش کی۔''سوچا کہ جوائن کرنے خالی ہاتھ نہ جاؤں۔یہ آپ کے لیے سانڈے کا تیل لایا ہوں۔'' پرنسپل کے ہونٹوں سے سگریٹ گرنے لگا۔اس نے برا سا منہ بنایا۔''آپ یہ تحفہ اپنے پاس ہی رکھا کریں۔'' مشتاق نے تحفہ ایک عمر رسیدہ پروفیسر کی جیب میں ٹھونس دیا جسے اتنی اردو نہیں آتی تھی۔اس نے تبرک سمجھ کے قبول کر لیا۔

مشتاق کا المیہ تھا کہ اس نے تھرڈ ڈویژن میں ایم اے جغرافیہ کیا تھا۔ جب کہ سیکنڈ ڈویژن ہونا ضروری تھا۔لہٰذا اسے ایڈہاک لیکچرر لگا لیا گیا۔خضدار میں پوسٹنگ بھی ہوگئی تا کہ دنیا والوں کی نظر سے بچا رہے۔نظر لگے نہ کہیں اس کی تھرڈ ڈویژن کو،اس نے کافی محنت کی مگر امتحان میں فیل ہوگیا۔پھر دوبارہ فیل ہو کر اس نے تقدیر پر فیصلہ چھوڑ دیا۔اس نے کالج کی تقریب میں یہ شعر پڑھا،''ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار'' تو ہال داد و تحسین سے گونج اٹھا۔طلبا نے سوال کیا کہ''سر یہ آپ کا شعر ہے؟'' وہ چوں کہ اس داد سے جذباتی ہو گیا تھا۔جھٹ بولا کہ ہاں میرا ہی شعر ہے۔

کالج میں اس پر جشن منایا گیا کہ خضدار میں رابعہ خضداری کے بعد ایک بڑا شاعر پیدا ہوا ہے۔لیکچراروں اور بی ایس او نے فیصلہ کیا کہ مشتاق کی تاج پوشی کی جائے۔چوں کہ خضدار میں سونا نہیں نکلتا لہٰذا گتے کا تاج بنا کر سنہری پنی لگائی گئی۔ یوں رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔سہ پہر میں دوبارہ Coronation ہوئی۔اسے کالونی کے ایک ایک استاد کے گھر لیجایا جاتا،دستک دی جاتی۔وہ باہر نکلتا تو مشتاق ایک شعر سناتا اور یہ جلوس آگے بڑھ جاتا۔

مشتاق اپنے تعارف اور شہرت سے کہیں بڑھ کر تھا۔شعبہ جغرافیہ ایک ویران سا کمرا تھا۔مشتاق نے اس لیے بہت سامان طلب کیا اور ساتھ ہی ہیلی کاپٹر بھی کہ وہ طلبا کو آبشار،آتش فشاں پہاڑ پڑھانے کی بجائے موقع پر جا کر دکھائے گا۔ پرنسپل نے وعدہ کیا کہ حکام سے بات کرے گا۔یوں وہ بہل کر اپنی کٹیا میں چلا گیا۔

ایک روز اچانک ہی غائب ہوگیا۔چوں کہ لیکچرار اکثر اِدھر اُدھر ہو جایا کرتے، پرنسپل ان گیسٹ سپیکروں کا عادی ہو چکا تھا۔مگر زیادہ دن لگے تو قاصد دوڑ ایا۔جو اگلے روز ہی مشتاق کو بازیاب کرا لایا۔معلوم ہوا کہ مشتاق کو بخار ہوا تو اس نے گھر میں پڑی چاروں دوائیاں ایک ساتھ کھا لیں کہ کوئی تو فائدہ دے گی۔تاہم وہ دوائیوں کے ری ایکشن سے زندہ ہی بچ نکلا۔جس سے ہم بہت خوش ہوئے۔

بلوچستان میں شعوری بیداری کی تحریک 1920ء سے شروع ہوئی تھی۔یہاں اخبار چھاپنے پڑھنے پر بھی پابندی تھی۔پہلی سرکار کو ناکام کرنے میں Repatriation کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔وزیر اعلیٰ چاہتے تھے کہ درجہ و رفتہ رفتہ سرکاری ملازم واپس جائیں۔مگر پیپلز پارٹی نے تاریخ مقرر کر دی کہ اس کے بعد کسی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔پھر کیا تھا کہ گھمسان کا رن پڑا۔جسے دیکھو بھاگے جا رہا ہے۔اس پر کچھ غیر ذمہ دار لوگوں نے گویا آگ پر تیل کا ہی کام کیا۔آباد کاروں پہ حملے اور سر بازار رہزنی ہونے لگی۔پولی ٹیکنیک کے جذباتی طلبا نے کوئٹہ سے نکلنے والی ٹرین روک لی۔طلبا پٹری پر آ کھڑے ہوئے۔حالاں کہ لیویز ایک وفاقی محکمہ تھا۔ڈرائیور نے ٹرین روک لی۔طلبا الفتح کے چھاپہ ماروں کی طرح ڈرائیور اور اس کے ہیلپر کو اغوا کر کے ہاسٹل میں لے گئے کہ ان کے مطالبات تسلیم کرنے تک یرغمال رہیں گے۔یہ خبر ریل وے اسٹیشن پہنچی تو ریل وے یونین حرکت میں آ گئی۔ریل وے ڈرائیوروں نے ڈیوٹی دینے سے انکار کر دیا۔صوبائی حکومت پر سخت دباؤ پڑا۔جذباتی پن حکومت کی ساکھ کو نقصان پہنچا رہا تھا۔پھر آواران میں کسانوں نے قدیم لگان ششک دینے سے انکار کیا تو بجائے افہام و تفہیم کے ان پر سرکاری لشکر کشی ہوگئی۔

لیکچراروں کی حیثیت دریائی گھوڑوں جیسی ہوتی ہے۔ نہ تو وہ پورے گھوڑے ہوتے ہیں اور نہ مگرمچھ۔وہ سرکس کی طرح اپنے ہی خول میں سر دیے علم میں ڈوبے رہتے ہیں۔کالج سے گھر اور گھر سے کالج ہی ان کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ہماری زندگی میں مستونگ کی بسوں کے ڈرائیور بھی شامل ہو لیے تھے۔کیوں کہ وقت پہ پہنچانا ان کے ہاتھ میں تھا۔ہم اکثر فرنٹ سیٹوں پر بیٹھا کرتے۔مگر پھر''دو سیٹاں والی مائی'' بھی آ گئی۔یہ نام بھی مشتاق نے ہی بخشا تھا۔گرلز سکول کی ہیڈ مسٹرس ایک خاتون تھی۔ وہ اگلی سیٹ کے دو مسافروں کا کرایہ دے کر اکلوتی ہی بیٹھتی۔مشتاق ٹھرکی بھی تھا۔اب تک شادی بھی نہیں ہو پائی تھی۔امتحان کی طرح محبت میں بھی تھرڈ ڈویژن تھا۔

اس دوران بھٹو نے بلوچستان کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر فوج کشی کر دی۔بلوچستان 13 نومبر 1839ء سے کالونائیز کر دیا گیا تھا۔ پھر اسے سرداروں،نوابوں کے حوالے کیا گیا جیسے سنڈیمن پالیسی کہا جاتا ہے۔بلوچستان کا جیولوجیکل سروے بھی مکمل ہو چکا تھا۔ان کا ارادہ تھا کہ اسے خوار در بدر غریب علاقہ رکھا جائے۔سیاسی شعور اور بنیادی حقوق کے لیے 1920ء سے چلنے والی تحریکوں کو کچلا گیا۔رسوائے زمانہ بریگیڈیئر ایجی رونلڈ ڈائر بھی بلوچستان میں قتلِ عام کرتا پھرا۔تا کہ بلوچ جرمنی یا ترکی سے کوئی تعلق نہ قائم کر سکیں۔زار روس

اورخود نپولین کی رال ٹپک رہی تھی کہ برصغیر سے انگلینڈ خود کما کرامیر ہوگیا ہے۔وہ اگر ہندوستان پر قبضہ کرلیں تو وارے نیارے ہو جائیں۔ بلوچستان سے داخلہ آسان تھا۔ برطانیہ نے شمال کے چھ درے قابو کرنے کے لیے سبی بوستان ریل وے پھر بولان ریل وے قائم کی۔ کیوں کہ بیس ہزار اونٹ جس فوج کو مہینہ بھر میں پہنچاتے، ٹرین چند ہی گھنٹوں میں فوج کو پہنچا دیتی۔

بلوچوں کے اولین اخبار بھی پہاڑ ہی تھے۔وہ پہاڑوں پر مطالبات احتجاجی نعرے لکھ آتے پھر لیویز اہل کار رسوں کی مدد سے لٹک کر وہ نعرے مٹاتے۔وزیراعلیٰ سردار عطا اللہ خان مینگل کے ارادے بلند تھے۔وہ بلوچستان کو ایک خوش حال پُرامن علاقہ بنانا چاہتے تھے۔ان کا حکم تھا کہ افسر عوام کی خدمت کریں۔اپنی گپ شپ اور بیوروکریٹ شترغمزوں میں نہ لگے رہیں۔ چائے بارہ بجے سے پہلے نہ منگوائی جائے۔بارہ بجے ٹی بریک ہو۔افسر اپنے دفتر کو ڈرائنگ روم نہ بنائیں، نہ دوستوں کا جمگھٹا ہو۔پھر وہ خود اچانک ہی سیکریٹریٹ کا دورہ کرتے۔ چند بار ہمیں چھپ کر بھاگنا پڑا۔ایک بار تو چائے سامنے دھری تھی کہ چپڑاسی ہانپتا ہوا داخل ہوا، ''سردار صاب آرہا ہے۔'' وہ گھبراہٹ میں وزیراعلیٰ کہنا بھی بھول گیا۔

میں نے نواب مری اور سردار عطا اللہ مینگل کو کبھی ہنستے مسکراتے نہ دیکھا۔بالکل سنجیدہ رہتے۔میر غوث بخش بزنجو نے بہ طور گورنر اپنے گورنر ہاؤس کی دیواریں اونچی کردی۔ورنہ چھوٹی چھوٹی دیواروں سے گورنر ہاؤس کی تفصیلات بھی دکھائی دیا کرتی۔ گورنمنٹ کا ارادہ تھا کہ سرکاری افسروں کی وردی کھدر کا شلوار قمیص اور واسکٹ ہوتا کہ عوام سے ان کا ٹرن آؤٹ مختلف نہ ہو۔نہ مہنگے پینٹ کوٹ خریدنے کے لیے رشوت لیتے رہیں۔ بندہ اور آقا کی تمیز مٹ جائے۔ علاوہ ازیں کے نظریاتی نوجوانوں کو سرکاری افسر بنایا جائے جو معاشرے کی خوش حالی عوام کی بہتر کے لیے کام کریں۔مگر بلوچستان کو ایک غریب مفتوح علاقہ رکھنا بڑی طاقتوں کا ایجنڈا ہے۔کیوں کہ اس کی ایک strategic اہمیت ہے۔ پیٹرول، معدنی دولت، سمندری حیات سے مالا مال ہے۔

ابھی لیکچرار خریدار ہی تلاش کر رہے تھے کہ وہ کیڑا فوت ہوگیا اور کیشئر نے بھی رکھنے سے انکار کر دیا کہ لوگ فون کر کے دھمکیاں دیتے ہیں کہ مشتاق کا کیڑا ہمیں دے دو۔لاکھوں کی آفر دیتے ہیں۔کیڑے کے مرنے کا غم دور ہوگیا۔ جب باٹنی کے لیکچرار نے انکشاف کیا کہ مرنے سے کیڑے کی قیمت میں فرق نہیں پڑتا، مستونگ میں خریدا کہاں؟ مجبور ہو کر مشتاق ہم سبھی کے ہم راہ وہ شیشی گھر واپس لیتا گیا۔مگر چند روز بعد اس کی والدہ نے بے کار شئے سمجھ کر کچرے میں پھینک دی۔مشتاق مستونگ سے گھر لوٹا تو لکھ پتی سے کلھ پتی ہو چکا تھا۔شعبہ جغرافیہ میں سبھی فرداً فرداً جا کر اظہارِ ہم دردی کرتے رہے۔ مشتاق ''ادھار کا انجام'' والی تصویر بنا بیٹھا رہا البتہ پرسہ دینے والوں کو چائے پلائے جاتا۔

ملک کے معروف ماہر تعلیم علی خان بلوچستان کے دورے پر نکلے تو مستونگ کالج بھی چلے آئے۔پرنسپل سے تعلیمی مسائل پر گفت گو کی۔کالج کی لیبارٹریز دیکھنا چاہتے تھے۔فزکس کے لیکچرار چھٹی پر تھے۔دیکھا کہ لیبارٹری میں گھاس بھری ہے۔چپڑاسی کو جھاڑ پلائی تو اس نے اعتراف کیا کہ سرکاری کوارٹر میں جگہ نہ تھی، چند ہی روز میں اٹھالے گا۔ ہر جگہ بری حالت تھی۔ بڑے ہی بدمزہ ہو کر شعبہ جغرافیہ گئے تو مشتاق نے مطالبہ کیا کہ اسلام آباد سے ان کے لیے ہیلی کاپٹر بھجوایا جائے۔طلبا کو سمندر، آبشار، آتش فشاں دکھانے لے جایا کریں گے۔علی خان کا چہرہ غصے میں دمک اٹھا۔خود کو سنبھالا۔اس سے پہلے کہ کوئی جھاڑ پلاتے، غنو نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر گھمائی یعنی یہ پاگل ہے۔علی خان غصہ پی گئے اور کہا کہ پوری پروپوزل بنا کر ان کے دفتر بھجوادیا جائے۔ان کی شفقت سے مشتاق مزید جھلا ہوگیا۔

ان ہی دنوں سعودیہ نے پیٹرول کی قیمت بڑھائی تھی۔مشتاق نے علی خان سے کہا کہ اس کے پاس ایسی تجویز ہے کہ پاکستان کو پیٹرول منگوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔کوئٹہ سے لاہور ڈھلان سڑک بنوادی جائے۔کاریں، ٹرک کرینوں سے اس پر رکھ دیے جائیں، رول ہوتی چلی جائیں گی۔لاہور سے کوئٹہ بھی ایسی ہی ڈھلوان سڑک ہو۔علی خان نے سنا ہے کہ بعد میں پرنسپل سے پوچھا کہ آپ اس پاگل کو برداشت کیسے کرتے ہیں۔ پرنسپل نے آہِ سرد کھینچ کر بتایا کہ لنکا میں جو چھوٹا، سو باون گز کا۔ یہ سارے ہی نمبری ہیں۔ چھ سات روز مہینے میں آتے ہیں، تن خواہ پوری لیتے ہیں۔بولوں تو محاذ کھول لیتے ہیں۔ جائیں تو جائیں کہاں۔

میں اور بچن شاہ جیلانی لاہور جانے کا سوچ رہے تھے کہ کچھ روز موج میلہ کر کے لوٹ آئیں۔ان دنوں طلبا عموماً ہڑتال پر رہا کرتے۔جس سے لیکچرار خوش ہوتے۔ چھٹیاں ہی چھٹیاں۔بولان میڈیکل کالج ہڑتالوں کے باعث آٹھ برس میں ڈاکٹر بنا کر دیتا۔خضدار میں کچھ طلبا کو بلاسبب گرفتار کیا گیا تھا۔ہمارا خیال تھا کہ مستونگ میں بھی ہڑتال ہوگی۔مگر سخت صدمہ ہوا کہ طلبا نے فیصلہ کیا کہ وہ ہڑتال نہیں کریں گے۔ واپسی پر طلبا بھی ساتھ ساتھ ہی چل رہے تھے۔کالج اور قبرستان ہمیشہ شہر سے باہر بنائے جاتے ہیں۔مشتاق کو جو اشارہ کیا تو اس نے محاذ کھول لیا کہ ہمیشہ بہادر ہڑتال کرتے ہیں۔اس کی تقریر کا فائدہ یہ ہوا کہ اگلے روز ہی طلبا نے غیر معینہ مدت کے لیے ہڑتال کردی اور لیکچرار خوشی خوشی کوئٹہ سدھارے۔

کوچ کی اگلی سیٹ پر زبردستی دو سرکاری ملازم ٹھونسے جاتے۔ایک روز مشتاق نے ڈرائیور کو پکڑ لیا کہ اس کا بایاں بازو چھوٹا ہے۔اس نے ضد کی کہ دونوں ہی برابر ہیں مگر مشتاق بحث سے باز نہ آیا۔ڈرائیور اتنا جذباتی ہوا کہ لک پاس کی خطرناک اترائی پر اسٹیئرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھ سیدھے پھیلا دیے کہ دیکھو برابر ہے۔کوچ بھول بھی گئی۔مسافروں نے گھبرا کر شور مچایا۔کوچ پولیس والوں پہ چڑھنے لگا۔وہ جان بچانے کو اِدھر اُدھر بھاگے۔پھر رکنے کا اشارہ کیا۔ان کا خیال تھا کہ یہ قتل کی کوشش ہے۔

چند روز قبل لک پاس کی لیویز پوسٹ پر ہمارے کلاس فیلوز آئے

تھے۔رات کا وقت تھا،انھوں نے چاروں سپاہیوں کو قابو کر کے رسیوں سے باندھ دیا۔پھر پوچھا کہ ان میں سے اچھی سلیمانی چائے کون بناتا ہے۔ایک سپاہی نے بتایا کہ وہ اعلیٰ چائے بناتا ہے۔اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔اس کی چائے کی داد دی۔اسے بھی چائے پیش کی پھر باندھ کر لٹا دیا۔آدھی رات کو عازمِ سفر ہوئے تو چائے کی طلب ہوئی۔بڑی لجاجت سے کہا، ماما تکلیف تو ہوگی مگر ایک بار اور چائے بنا دو۔چائے پی کر دوبارہ باندھ دیا۔لیویز کی چینی پتی بھی اٹھالی۔چی گویرا کو تو بنا بنایا پلان ملتا تھا۔ساتھ Logistic Support ہوا کرتی۔جب کہ یہ طلبا تھے جو محض نظریات کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے۔جاتے ہوئے ماما سے بھی درخواست کی کہ ساتھ چلے، جنگ نہ کرے البتہ پہاڑوں میں چائے بناتا رہا۔ماما نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت چاہی کہ اس کی عمر ایسی نہیں ہے کہ پچیس تیس کلومیٹر پہاڑوں میں بھاگتا نکل جائے۔وہ جاتے ہوئے ان کی جنگِ عظیم اول کی تھری ناٹ تھری بندوقیں بھی لیتے گئے۔جس کے باعث مستونگ آنے جانے والوں کی تلاشی بڑھ گئی۔

یونی ورسٹی میں سیمینار ہوا تو ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ویمن کالج کی ایک اسسٹنٹ پروفیسر انیلہ نہایت ہی حسین وجمیل تھی۔ساڑھیاں اور سن گلاسز بھی کمال کے تھے۔ایک بار وہ سورج گنج بازار میں ڈاکٹر کی دکان میں تھی۔میں نے تعارف کی خاطر کسی بچی کے بالوں سے پن کھینچ کر اگلے ٹائر کی ہوا نکال دی۔پن دوبارہ لگا دی اور لاتعلق ہو کر کھڑا ہو گیا۔واپسی پر وہ فلیٹ ٹائر دیکھ کر پریشان ہوگئی۔میں نے اپنا تعارف کرایا اور ٹائر بدلنے کی پیش کش کی۔ٹائر بدل دیا۔میرا شکریہ ادا کر کے والدہ کو لے کر چلتی بنی۔مگر اگلے روز میرے پرنسپل عیوب خان کو فون کر کے بتایا کہ پہلے خود ٹائر فلیٹ کر دیا پھر ٹائر بھی بدلا، ذرا اپنے لیکچراروں کو سنبھالیں۔شکر ہے کہ ڈاکٹر خلیل صدیقی کو فون نہ کیا۔وہ بچی دراصل اس کے ملازم کی بیٹی تھی۔عیوب خان یوں تو آنکھیں دکھاتا کہ روزانہ کالج آیا کرو۔دیکھتا شیر کی آنکھ مگر کھلاتا سونے کا نوالہ۔کوئی اور ہمیں کچھ کہتا تو ہماری حمایت میں سینہ تانے سامنے اکڑا ہوتا۔

یونی ورسٹی میں سیمینار ہوا تو ظاہر ہے کہ بی ایل اے کا نائب صدر ضرور مدعو ہوتا۔وہیں انیلہ بھی تھی۔میں راڈو ڈائیا اسٹار گھڑی کے شیشے کو ایسے رکھتا کہ کھڑکی سے آنے والی روشنی گھڑی کے پیزل سے انیلہ کی آنکھوں پر پڑتی۔پہلے تو چونک اٹھی۔روشنی کا تعاقب کیا۔مگر گھڑی والے کو دیکھ کر لاتعلق ہوگئی۔چہرہ اِدھر اُدھر کر لیتی۔تین روز بعد جب سرٹیفکیٹ دینے کی تقریب میں وہ اسٹیج پر گئی تو پورے ہال میں دھیمی آواز گونج رہی تھی: ''آغا والی، آغا والی۔'' وہ جھینپی سی سیٹ پر آ بیٹھی۔چائے میں وائس چانسلر اور ڈائریکٹر بھی شامل تھے۔وہ بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر ان میں جا شامل ہوئی۔میں نے مشتاق کا دامن تھاما۔اسے بتایا کہ انیلہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اظہار کا موقع نہیں ملتا،تم حقِ دوستی ادا کرو، جاؤ کہو کہ دل کی بات تو سن لے۔

Foolish rush there where argels fear to tread

مشتاق مختلف گروہ کاٹتا، راستہ بناتا انیلہ تک جا پہنچا۔میں کھسک کر ستون کے پیچھے جا چھپا۔ایک آنکھ سے دیکھتا رہا۔مشتاق نے انیلہ سے کچھ کہا۔وہ اس کے ذرا قریب ہوئی،اس کی بات سنی۔چائے کا کپ کچھ تھرتھرا گیا۔وہ اچانک ہی Blush ہوگئی۔جیسے دوپہر کا سورج آماچ پہ آ ٹھہرا ہو۔معاملہ سنگین تھا۔میں علم کے مینا روں میں چھپ گیا۔اب مشتاق مجھے تلاش کر رہا تھا۔آخر مجھے آ لیا۔''مبارک ہو۔'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔''مبارک ہو تمہارا کام ہو گیا، میں نے کہا آغا آپ سے دل کی بات کرنا چاہتا ہے۔آیئے میرے ساتھ چلیں۔'' میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔''پھر کیا ہوا؟'' مشتاق بہ دستور خوش تھا۔''اس نے کہا، اچھا میں بات کرلوں گی، آپ جائیں۔''

وہ مشتاق کی شہرت سے واقف نہ تھی ورنہ تو اس کا چہرہ اقدس نوچ لیتی۔

خضدار، تربت، سبی کالجوں سے فون آ رہے تھے کہ تمھیں ووٹ دیا تھا ہمارے لیے کیا کر رہے ہو۔سرکار نے ہمارے لیڈر جیلوں میں ڈال رکھے تھے۔ان پر بغاوت وغیرہ کے مقدمے بنا رہے تھے۔قلات پبلشرز کے مالک زمر حسین، میرے والد کے دوست میرے گویا انکل تھے، وہ سینیٹر تھے۔انھیں بھی بلوچ وفا کے جرم میں حیدر آباد جیل میں بند کر رکھا تھا۔سرکار نگ کرنے کے لیے لیڈروں کو دور دراز کی جیلوں میں ڈالتی رہی۔جیسے میر محمد حسن عنقا مچھ کے رہنے والے تھے۔ماضی میں انھیں مچھ کی بجائے مانسہرہ جیل بھجوایا گیا تھا۔میر گل خان نصیر کوٹ لکھپت جیل لاہور بھجوائے جاتے تا کہ ملاقاتی نہ آ سکیں۔اس طرح شاید وہ کچھ کم زور پڑیں، آمریت قبول کر لیں مگر یہ سارے فولادی انسان تھے۔انگریز جاتے ہوئے اپنے تربیت یافتہ وطن فروش حکم ران اور بے ضمیر افسر خطابوں کی طرح ہمیں عطا کرتا گیا۔وہ محض وردی بدل کر راتوں رات پاکستان کے وفادار ہو گئے۔مگر یہ دستور سفاک اور مطلب پرست تھے۔جیسے لیاقت علی کے قتل کا پوری کیبنٹ کو علم تھا۔جس کی بنا پر کوئی بھی وزیر اپنے وزیر اعظم کی تقریب میں شامل نہ ہوا۔افغان بھگوڑے 450 روپے ماہانہ سرکاری تن خواہ پانے والے سید اکبر کو وزیر اعظم کے عین سامنے بٹھا دیا، پہلی صف میں۔عینی شاہد کا بیان تھا کہ سید اکبر کی گولی چوک گئی تھی تو عقب سے گولی چلائی گئی۔حیرت ہے کہ وہ اپنا کم سن بیٹا تقریب میں ساتھ لایا۔

نئے وزیر تعلیم سے میرے بچپن کا دوست قاسم بے تکلف تھا۔رنگیلا وزیر تعلیم اور سی اینڈ ڈبلیو کا وزیر تھا۔اس کی آمدنی سی این ڈبلیو سے ہی ہوتی۔میرا دوست وزیر کے سارے شوق پورے کرتا اور یوں تعمیراتی ٹھیکے حاصل کرتا۔اس کی تعمیر کردہ ایک عمارت دیکھ کر ایکس ای این بہت خفا ہوا۔منہ بنا کر بولا کہ اس عمارت کو تو گرا دینا چاہیے۔قاسم چوں کہ وزیر کا اہم مشرب، ہم پیالہ وہم نوالہ تھا، مچل کر بولا کہ یہ عمارت گرانے کا ٹھیکہ بھی مجھے ہی دے دیں۔وزیر موصوف فن کاروں کو پروموٹ کرنے کے لیے غلمان کے ناچ دیکھتے۔اچھا خاصا ذوقِ ایرانی تھا۔

محفل مدہوش تھی جب میں نے بازیابی پائی۔اس میر کے لونڈے نے توقف کے لیے پاؤں روکے تھے کہ میں اس کے بھائیوں کا دوست تھا۔ادب

سے مجھے سلام کیا۔ وزیر کے حضور میں کورنش بجالایا اور فریاد کی کہ بی ایل اے کا نائب صدر ہوں، کئی برس سے ہم ایڈہاک لیکچرار ہیں، تن خواہ میں بھی اضافہ نہیں ہو رہا، نوکری پکی نہیں ہو رہی۔ سالانہ انکری منٹ سے بھی محروم ہیں۔ بھٹو نے لیکچراروں کو اٹھی پانچ سالانہ ترقیاں دے کر ہماری اشک شوئی کی تھی۔ مگر ''غم زیادہ ہیں لفافے میں نہیں آئیں گے'' والا معاملہ تھا۔ بھٹو نے یہ بھی بخشش کی کہ اس برس بلوچستان سے سی ایس ایس کے مقابلے میں جو شہزادے شامل ہوئے مگر فیل ہو گئے، انھیں بھی بلا کر اچھے محکمے عطا فرما دیے۔ ہمارا دوست جاوید لیکچرر انگریزی، اپنے ہی مضمون میں فیل ہو گیا تھا۔ اسے پولیس کا محکمہ دے دیا گیا۔ وڈیرہ کی بخشش بھی شاہانہ ہی ہوا کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی چوکھی سفارش بھی رہی ہو۔

وزیر موصوف کا چہرہ فروغِ مئے سے گل رنگ تھا۔ فرمایا کہ بلڈوزر خرید لیتے ہیں۔ اب پیسہ کہاں۔ اگلے برس بات کرنا۔ مجھے لگا کہ میں مرزا غالب کی طرح بہادر شاہ ظفر سے فریاد کر رہا ہوں۔ مگر آدمی وضع دار تھے، خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ ازارہِ مرحمت سلطانہ عطوفت شاہانہ ٹھیکے داروں کی لائی گئی وہسکی سے جانی واکر ریڈ لیبل مجھے عطا ہوئی۔ جو میں نے چھپا لی ورنہ بی ایل اے کی بنیادی ممبر شپ سے بھی جاتا۔

اگلے ہی روز اس بتِ طناز کے گھر میں فساد بپا ہوا۔ اس کی والدہ نے دوستوں کو بلوا بھیجا۔ جو دوڑے چلے آئے۔ ہم نے دونوں بھائیوں کو چھڑایا کہ منشی پریم چند کے جھوری اور بھوری کی طرح محبت سے رہیں۔ اپنا پھر بھی اپنا ہے، بڑھ کر گلے لگا لے۔ بڑا بھائی جلالی تھا کہ کل منے کو محفل میں وزیر تعلیم کے سامنے نچایا تھا۔ میں نے سوچا کہ دانائی سے معاملہ سلجھاؤں۔ میں نے کہا کہ بھائی آئندہ خیال کرے گا کل تو ناچ ہی چکا۔ تم کیا چاہتے ہو۔ بڑا بھائی جلالی تھا، اس نے کہا کہ میں بھی اس کا بھائی ہوں، اس پر جو روپے نچھاور ہوئے، بیلیں دیں، ان میں میرا ادھا حصہ بنتا ہے۔ سارا اس بدطینت نے رکھ لیا تھا، تھوڑا سا منے کو تھما دیا۔ میں اس ظلم و نا انصافی کے خلاف سراتاروں گا۔ ان دونوں کو حصہ داری پر مجبور کیا۔ رقم لوادی۔

کچھ سرکاری کام کے لیے دفتروں میں پھرتے شمس پے سلپ کے لیے آڈیٹر جرنل کے دفتر گیا تو کسی کی معروفت سادہ پے سلپ حاصل کر کے مشتاق کی پے سلپ بنوائی، مہر بھی لگا دی۔ اہتمام سے بھری۔ اس میں مشتاق کی تن خواہ سیکریٹری سے بھی بڑھا دی۔ ساتھ ہی لکھ دیا کہ مشتاق کی سروسز کنفرم کی جاتی ہیں اور اسے بلوچستان کا سینئر موسٹ لیکچرار قرار دیا جاتا ہے۔ کوئٹہ جی پی او سے مشتاق کے نام رجسٹری بھی کر دی۔ پے سلپ، مہر، لفافہ سبھی کچھ اصلی تھا۔ شمس کے ذہن سے نکل گیا کہ مشتاق تو ایٹم بم ہے، اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ شمس اسی روز واپس مستونگ چلا آیا۔ وہیں سکونت پذیر تھا۔

چند روز میں رجسٹری مشتاق کے نام آئی تو کھلبلی مچ گئی۔ لفافہ چاک کرتے ہی اس پہ مشتاقیت طاری ہو گئی۔ خوشی سے ہنہنانے لگا۔ پورا کالج ہی سر پر اٹھا لیا۔ لیکچرر، پروفیسر دوڑے چلے آئے۔ مشتاق کی عجیب و غریب پے سلپ کو دیکھ کر سبھی قہقہے لگائیں اور تعجب سے جیسے Dromedary دیکھ رہے ہوں۔ فیصلہ ہوا کہ اس خوشی کے موقع کو شایانِ شان طریقے سے منایا جائے۔ دس کلو گوشت کے لیے مشتاق کو ذبح کیا گیا۔ باقی رقم اس نے عیوب سے ادھار لی۔ پرنسپل لاج میں اگلے ہی روز زبردست لنچ ہوا۔ جس میں مشتاق کی شان میں تقریریں ہوئیں اور حکومت سے اصرار کیا گیا کہ اسے ہیڈ پرنسپل لگایا جائے یعنی بلوچستان کے تمام کالجوں کا پرنسپل۔ چوں کہ وہ Pre-Historic قدیم ترین Ad hoc لیکچرر تھا جسے پیار سے ''بابائے اڈھاکیان'' کہا جاتا تھا۔ یہ خطاب بھی فی الفور ختم کرتے ہوئے بابائے اڈھاکیان کہنے پر ہر عاقل و بالغ پر پابندی لگا دی گئی۔

شکر ہے کہ وہ پے سلپ لہراتا ڈائریکٹوریٹ نہیں گیا۔

سہرا

باؤنڈری مار کے بندھواتے تھے سر پر سہرا
اب چلے گا یہ پتہ بندھتا ہے کیونکر سہرا
رن بنانے کے لیے دوڑ نہ جائے یہ کہیں
باندھیے آج اس شخص کے کس کر سہرا
سینچری بیٹ تو بیشک ہے ہمارا دولہا
اب نئے کھیل کے دیکھے گا یہ جوہر سہرا
چھکّے چھوٹے نہ کہیں چھکّے لگائے تو بہت
سونپ دے تم کو نہ اولاد کا لشکر سہرا
یہ کرکٹ کی نہیں شادی کی پچ ہے حضرت
اب ذرا باندھیے اس پر بھی تو جم کر سہرا
اب بندھے بیٹھے ہیں سسرال میں سہرے سے حنیف
اور اسکور میں ہے آپ کے گز بھر سہرا
اپنی ہر ایک سہیلی ہے یہ کہتی ہے عُروس
کھینچ کر لاؤ کہ باندھیں میرے شوہر سہرا
سیکڑوں رن ہیں وہی مہر میں لکھوا دینگے
اور خود اپنا بنالیں گے مقدّر سہرا
داد دی میں نے بھی دولہا کو جو دیکھا شوکت
ویلڈن باندھ لیا تو نے بھی سر پر سہرا

شوکت تھانوی

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

پہاڑ ندی عورت

خورشید حیات
(نوئیڈا)

سامنے والی برتھ پر بیٹھی وہ، اپنی انگلیوں میں پھنسے برش سے، کینوس پر اتر آئے الگ الگ رنگوں میں بہت پیچھے کی طرف چھوٹتی ہوئی زندگی کے ان گلیاروں کو ڈھونڈ رہی تھی جہاں اکن چکن دہی چٹا کن کا کھیل تو تھا مگر لکیریں نہیں تھیں۔ بے چینی کے عالم میں اس نے HA-1 کوچ کی کھڑکی سے سرمئی بادلوں کے ان سلسلوں کو دیکھنا چاہا جو کبھی ساون کے موسم میں دوار یکا سے تغلق آباد اور حضرت نظام الدین سے ہری دوار تک کے سفر میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مگر ایک آج کا ساون ہے بادلوں کے سلسلے تو ہیں مگر اپنی صفات سے باہر ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے، الگ الگ قبیلوں میں بٹتے ہوئے۔ اب قبیلہ کہاں، معاشرہ کدھر؟؟

آج ہمارا معاشرہ ٹو۔ بی۔ ایچ کے (2BHK) فلیٹ میں اکڑوں بیٹھا ہے، اور سنہری تہذیب کا آنگن گمشدہ پنچھی کی طرح۔

ایک طرف پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے کھیت تھے، کھلیان تھے۔ دوسری طرف ماہی گیروں کی بستیوں میں مچھلیوں کو ندیوں کے خلاف ورغلایا جا رہا تھا۔ مذہبی، نسلی اور لسانی گروہوں کی کشیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔

ٹائر کی چپل پہلے ایک بوڑھا، آنکھوں پر، پاور کے چشمہ کو، موٹی ستلی سے کانوں میں پھنسائے، ماڈل اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر دو پر کھڑا، بھاگتی ہوئی ٹرین کی رفتار کو دیکھ رہا تھا۔

وہ کھڑکی سے کچھ اس قدر چپکی ہوئی تھی کہ اس کے رخسار کا سرخ رنگ کانچ کی کھڑکی پر ابھر آیا تھا، پیشانی پر لکیریں تھیں اور آنکھوں میں بادلوں سے جھانکتا ہوا سورج۔

بہت ممکن تھا ہو جاتا کسی بھی غیر کا یہ دل، تری سانسوں کی گر دھڑکن میری
عادی نہیں ہوتی

بھاگتی ہوئی ٹرین کا اپنا ایک رنگ تھا۔ WAP7 LOCO کی Level Xing Gate پر چیختی ہوئی آوازوں سے بے خبر، رنگ برنگی روشنی میں لپٹے ہوئے، بے کیف چہرے، انجام سے بے خبر ٹریک پر چل رہے تھے۔

ہر زندگی رنگ کی اپنی دھڑکن ہوتی ہے اور ہر دھڑکن میں زندگی کی سانسیں۔ ان سانسوں پر ہمارا اختیار کہاں، اف یہ زندگی بھی نا خود کو کیا کیا سمجھ بیٹھتی ہے۔ سوئے ہوئے شہر کو جگانے والے چہرے یہاں پری کہانی کردار بن جاتے ہیں۔

میرے اندر یہ کون بول رہا ہے۔

شاید یہ وہی شہزادی ہے جو جسم کی سرحدوں کو توڑ کر روح کی قبا کے ساتھ بہت دور نکل جاتی ہے۔ لوٹ آتی ہے، اور پھر چلی جاتی ہے۔ چھوڑ جاتی ہے، رنگوں کی خوشبوئیں اور خوابوں کی آہٹیں۔ پھر شروع ہوتا ہے خود سے خود کے مکالمے کا کبھی ختم نہ ہونے والا ایک نیا سلسلہ۔

کہیں یہ وہی شہزادی تو نہیں جو سادگی کی لباس میں لپٹی ہوئی سامنے والی برتھ پر بیٹھی اجالوں میں رنگوں سے کھیل رہی ہے۔ نئے سروں کے ساتھ اے سی کوچ کی ٹھنڈی ہواؤں میں گھل مل رہی ہے۔

دونوں ایک ہی دشا کے مسافر تھے۔ وہ رنگوں میں زندگی تلاش کر رہی تھی اور 'وہ' ان رنگوں میں اپنی شہزادی کو دیکھ رہا تھا۔ ''میں'' میں اتر کر ''میں'' کی تلاش اب کہاں کوئی کرتا ہے اب تو صرف وہ اور وہ سب کی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ دو ہاتھ کس کے ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں اور چند لمحوں میں معصوم پرندوں کے پر کتر کر چلے جاتے ہیں اور پھر شروع ہوتا مہاجرت کا ایک نیا قصہ۔ خوف و دہشت کی چادر میں لپٹے ہوئے چہرے اپنے اپنے گھونسلوں کے بکھرے ہوئے تنکوں سے جھانکتے ہیں اور صحافی کا کیمرہ ان کا پیچھا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ شہر جس کی تہذیب کی پہچان وہاں کی شام ہوا کرتی تھی وہاں آدمی کا جنگل تو ہے مگر درختوں کی بازوئیں کٹی ہوئیں، ترقی کرتے ہوئے شہر کے آدمی کی نگاہیں جب جب برہنہ ہوئیں تو درخت ننگے، اور جڑیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔

سنتے ہیں وہ شہزادی جب سے داستان رنگ حویلی کو چھوڑ کر چلی گئی وہاں اب کسی آسیب کا سایہ ہے اور اس حویلی کے سامنے پہاڑ کی مضبوط بانہوں سے آزاد ہوتی ہوئی ندی کے اطراف میں جھاڑ پھونک والوں کی دکانیں آباد ہو چکی ہیں۔ آدھا ادھورا آدمی سب کی مرادیں پوری کرنے والا بن گیا ہے۔

او میری شہزادی تم حویلی چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟

زندگی میں پل کتنے تھے شہزادی نے کبھی نہیں گنا، ہتھیلی کی نرم انگلیاں تو تھیں مگر ان انگلیوں پر گنتی گننے کا سلیقہ اسے کبھی نہ آیا۔ ہر لمحہ میں خوشیاں کتنی تھیں۔؟

موسم کے خوبصورت مزاج کے ساتھ جب کبھی شہزادی حویلی سے بہت دور نکل جانے والی گپھاؤں سے گزرتی ایک سفید روشنی اس کے قدموں کی آہٹ سے آگے چلتی دکھائی دیتی۔

اس کے جسم سے لپٹے ہوئے چوڑی دار اور کرتے کی ہر سلائی میں روح کے دھاگے تھے۔ وہ ہر جگہ موجود تھی اور نہیں بھی تھی۔ پتا نہیں وہ کس دیار میں کس کے اختیار میں تھی۔

سامنے کی برتھ پر بیٹھی وہ پینٹنگ مکمل کر چکی تھی۔ اور دوسری طرف وہ اب بھی اس کے چہرے میں اپنی شہزادی کا چہرہ پڑھ رہا تھا کہ شہزادی بھی تتلیوں کے رنگوں کو زندگی کے کینوس پر اتارا کرتی تھی۔

ہر ماں کا چہرہ وہ اتنے قریب سے کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟

کیوں زندگی کتاب چہرے کے ہر ورق کو قمقموں سے سجانا چاہتا ہے۔؟

''چہارسُو''

شاید وہ زندگی کے ہر ورق سے ابھرنے والی عورت، سمندر اور سڑک یا پھر ندی، سڑک پہاڑ کی موسیقی کو زندگی کے سر اور تال کے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔

آج تک خود کو وہ پہچان نہیں سکا۔

اس کا چہرہ سمندر، پہاڑ جیسا ہے یا پھر ندی جیسا۔

شاید اس کی آنکھوں سے ایک ندی بہتی ہے جو سمندر کو ایک نئی پہچان دے جاتی ہے۔ ندی پچھلے موسم کی، شہزادی۔ سمندر آج کا مرد اور پہاڑ۔؟

روشنی میں نہائی ہوئی سڑک۔؟؟

اس نے کئی مرتبہ خود کو آوازوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے محسوس کیا ہے۔

پاپا آج ہاسٹل میس سے کھانا نہیں آئے گا؟

کیوں؟

''آج گنیش پوجا ہے''

''کیا کھاؤ گی؟''

ویج بریانی۔ گوبھی مٹر آلو، گاجر، سویابن، فرش بن سب ڈال دینا۔

الگ الگ کھیتوں میں اُگی ہوئی یہ سبزیاں جب ایک ساتھ ملتی ہیں۔ چاول کے دانوں کے ساتھ، گرم مسالوں کے ساتھ، بھاپ سے پکتی ہیں تو ایک نئی خوشبو کچن سے نکل کر پڑوس کے کچن تک سرحدوں کو توڑتے ہوئے پہنچ جاتی ہیں۔ خوشبوئیں لکیروں کو نہیں مانتیں۔ یہ ہوائیں کتنی معصوم ہوتی ہیں۔ یہاں تہذیب کی نہ تو کوئی جنگ ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی دیواریں۔

تم نے کہا/ اندھیرا ہے/ اس نے کہا اجالا/ پھر تم نے کہا اجالا ہے/ اس نے کہا اندھیرا/ تم نے کہا گنبدوں سے صدائیں آ رہی ہیں/ اس نے کہا اونچے پہاڑوں سے ایک نئی جاگرتی لیے مندا کنی ململ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی اتر رہی ہے/ تم نے پھر کہہ دیا نہیں/ اس ہاں اور نہیں میں/ کتنے دور ہو گئے تم/ اندھے اور بہرے بھی/ کہہ دو نا/ نہیں، نہیں، نہیں۔ کوئی نہیں/ صرف ''وہ'' / دیکھو نا/ سنو نا پورے برہمانڈ سے ہر لحہ ایک ہی آواز آتی ہے/ چلو پیچھا کرتے ہیں فطرت کی گود سے ابھرنے والی آوازوں کا/ پرندوں کی طرح، لہروں کی طرح۔ تھوڑی دیر مون رہ کر ہم خود میں خود کی تلاش کیوں نہیں کرتے؟

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' رنگوں سے کھیل رہی اس عورت نے خاموشی کو اپنی آواز دی۔ شاید اس کی پینٹنگ مکمل ہو چکی تھی۔

''جی، میں''— جہاں تک یہ ٹرین جا رہی ہے۔

''مطلب ہری دوار۔''

''جی ہاں''

''میں بھی۔''

تنہا سفر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے نا، خاص کر تب جب سفر لمبا ہو اور باتیں کرنے والا کوئی نہیں۔

'کیوں ایسا کیوں؟' اپنے کینوس، برش اور رنگوں کے سمیٹتے ہوئے۔ اس نے اپنے بیگ سے کیمرہ نکالا اور قریب آ کر کیمرے میں قید اپنی پینٹنگ دکھانے لگی۔ اس کی پینٹنگ کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں بھی بول رہی تھیں کہ آج نئی صدی میں انگلیاں بولتی ہیں اور زبان خاموش رہتی ہے۔ کبھی انگلیاں کی بورڈ پر تھرکتے ہوئے باتیں کرتی ہیں تو کبھی انگلیوں میں پھنسے برش رنگوں کو ایک نئی زبان عطا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

حنائی رنگ زلفوں کو بکھیرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نام''

'ندی'

'اچھا اچھا تم خود کو ندی سمجھ بیٹھے ہو۔ لگتے تو ہو پہاڑ جیسے مضبوط ارادے والے۔

کسی حد تک ٹھیک ہی سمجھا تم نے، ایک ایسا پہاڑ جس کی مضبوط بانہوں سے ندی آزاد ہوتی ہے۔ آج تو بارودوں سے اس کی پسلیاں توڑی جا رہی ہیں۔

''اُف یہ بارود سے ٹوٹتی ہوئی پسلیوں کا درد!''

رنگوں سے کھیلنے والی اے عورت شاید تم بھی پہاڑ ندی ہو۔

ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ندی بدن پر پہاڑ نے اپنی مضبوط انگلیوں سے ایک نئی عبارت لکھنے کی کوشش کی ہو، مگر ندی کے باندھ نے اسے روک دیا ہو۔

پینٹری کار کے منیجر نے کافی بھجوا دی تھی، اور ساتھ میں کٹ لیٹ بھی۔ زبان خاموش ہوئی ایک نئے ذائقے کے لیے۔ مگر وہ خاموش کہاں رہنے والی تھی۔

جانتے ہیں سر جی! دوارکا کے پانچ کوؤں کو قریب سے دیکھ کر آئی تو یہاں روحا کنواں مل گیا۔ شاید سات منزلیں بھی۔ سات طواف کی طرح۔ ایسا ہے سر جی! میرا مطلب ندی پہاڑ۔ وہ ہنسنے لگی۔

میں بہت زیادہ بولتی ہوں اور زیادہ بولنے والوں کے ساتھ آوازوں کا ایک ہجوم چلتا ہے۔ اور آپ بہت کم بولتے ہیں، ہری دوار آنے والا ہے۔ اور اب آپ کو میرے ساتھ 250 کیلو میٹر کار سے سفر کرنا ہے۔ آپ تیار تو ہیں۔

''ہاں تیار ہوں''۔

ہری دوار آ چکا تھا اور وہ دونوں کار میں بیٹھ چکے تھے۔ سامنے روشنی میں نہائی ہوئی سڑک تھی، گاؤں کی پگڈنڈی سڑک کی سہیلی بن گئی تھی اور وہ دونوں زندگی کی سڑک پر چلنے والے مسافر۔

وہ سوچنے لگا ہر دن جب وہ آفس سے گھر لوٹتا تو انتظار کرتی ہوئی نگاہیں، زندگی کے گھومتے ہوئے پہیوں کی رفتار بن جانا چاہتی تھیں اور وہ ان نگاہوں کے احترام میں اپنے تھکے ہوئے جسم کی لباس کو کھونٹی پر ٹانگ دیتا اور دھیرے دھیرے وہ، وہ نہیں رہتا جس چہرہ کے ساتھ وہ دفتر میں کچھ دیر پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی پرندوں کی طرح، کھلی فضا میں اڑنے لگتا، یہ پاکھی من بھی ایک جگہ کہاں رہ پاتا ہے۔

جگمگاتے ہوئے شہر کی چوڑی چھاتی والی سڑک پر کار کی اپنی رفتار تھی اور کار

میں سواران دونوں کی سوچ وفکر کی ایک الگ رفتار۔سفر میں ایک طرح کے خیالات کہاں آتے ہیں،جگمگاتے ہوئے شہر میں جاگتی ہوئی زندگی کا قصہ گھومتے ہوئے پہیوں کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کبھی اس کے ساتھ ایک معصوم سی ننھی سی لڑکی چلا کرتی تھی،ندی کی طرح بہا کرتی تھی،انگلیوں کے پور کو چھوتے ہوئے،جب بھی وہ پہاڑ پر بنے عالیشان محل سے نکلتا وہ ساتھ ہو لیتی اور مٹی بدن کہانی کی طرح زندگی کا آنچل تھام لیتی۔

آج شاید وہ دونوں محل سے دور شہد کی بہتی ہوئی نہروں سے کھیلنے گئی اس شہزادی کو ڈھونڈنے نکلے تھے،جو بیتی راتوں کے ہر اجالے میں موجود ہے۔

وہ کون تھی،کہاں سے آئی تھی اور کدھر گم ہوگئی؟

کیا وہ سرسوتی تھی،یا پھر کوئی پہاڑن عورت۔شہزادی؟

کہیں وہ مندا کنی تو نہیں تھی؟؟

کچھ چہرے گم ہونے سے پہلے منزل کا پتہ دے جاتے ہیں۔شاید وہ شہزادی بھی جو مچلتی ہوئی ندی کی طرح تھی،نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے اپنی سہیلی سڑک کو ساری داستان سنا گئی تھی،شاید تبھی سے سڑک اپنے عہد کی تاریخ کی خاموش گواہ بنتی جارہی ہے۔

قدرت نے اس شہزادی کی فطرت میں ندی کی طرح بہنا لکھا تھا مگر نئی تہذیب کی پھیلتی ہوئی جڑوں نے اسے سسکنے پر مجبور کر دیا،درخت لگانے کی روایت ختم ہوگئی اور جڑوں کو کریدنے کی نئی روایت کی شروعات ہوگئی۔پیاسوں کے لیے کنواں کھودنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

وہ دونوں کار میں سوار شہر سے دور پہاڑی علاقے میں آگئے تھے،قدرت کے بے شمار خوبصورت نظارے نگاہوں کے سامنے تھے۔مگر ان پہاڑوں پر بھی انسان کی نظر پڑ گئی تھی اور اس کے مضبوط سینے کو چھلنی کیا جارہا تھا۔بارود کی مہک دور سے آرہی تھی۔آدمی کی روح پانی سے خالی ہو چکی تھی اور زمین کی سطح پیاسی۔

دور کسی ڈھابے سے سل بٹا پر مسالہ پیسنے کی آواز نے انھیں چونکایا اور بھوک کا احساس بھی دلایا،ڈھابا میں وہ کون ہے جو اتنی رات گئے مشین کو چھوڑ کر پہاڑ کی موسیقی سے جڑ رہا ہے۔کار کے گھومتے ہوئے پہیے تھم گئے اور وہ دونوں سل بٹا سے آنے والی آوازوں کے قریب پہنچے۔

مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔

ڈھابا تھا۔مگر آدمی کے چہرے ایک بھی موجود نہیں تھے،چولھے تھے مگر اس میں آگ نہیں،پانی رکھنے کے لیے بڑے بڑے ڈرام تھے،مگر اس میں پانی نہیں،ٹین کی چھتیں تھیں،مگر ایسا لگتا تھا جیسے پچھم کی طرف سے کوئی تیز آندھی آئی اور سب کچھ اڑا کر لے گئی۔

وہ دونوں گھبرانے لگے،اور تھوڑا سہم سے بھی گئے،یہ کیسا سفر تھا،جس میں وہ ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھے،دوڑ کر وہ دونوں اپنی کار میں واپس آتے ہیں۔کار اسٹارٹ ہوتی ہے۔مگر یہ کیا؟ آگے کی سڑک ندی میں سما گئی تھی،اور پہاڑ روئی کے گالے کی طرح ندی کی طرف لڑھک رہا تھا۔

وہ سڑک جس نے شمال اور جنوب کے فرق کو مٹا دیا تھا آخر کیوں وہ ندی، درخت اور پہاڑ کے ساتھ ہوگئی۔

دونوں نے دیکھا کہ گاؤں کی ساری عورتیں،زندہ تھیں اور سارے مرد چیختی ہوئی ندی میں خاموش ہوگئے تھے،آوازیں ہمیشہ کے لیے سوگئی تھیں۔

ایک بیٹی اپنے بابا کی ننگی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی،جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا اور انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔شاید کوئی مرد انگلیوں کو سونے کی انگوٹھیوں کے ساتھ کاٹ کر لے بھاگا تھا۔

یہ لاشیں،یہ کٹی ہوئی انگلیاں کہیں آج کے آدمی کی تو نہیں؟

کار اب تیز رفتار سے اسی طرف جارہی تھی جہاں سے دونوں نے اس سفر کی شروعات کی تھی۔بغل والی سیٹ پر ندی جیسی ایک عورت تھی اور "وہ" شاید ایک پہاڑ۔ایک ایسا پہاڑ جس نے ندی بدن کا استحصال کبھی نہیں کیا تھا۔ندی کو روندنے والے اکثر مرد ہی ہوا کرتے ہیں،تو کیا وہ،مرد نہیں۔صرف ایک پہاڑ جیسا ہے۔

الگ الگ دشاؤں کے دل دہلا دینے والے مناظر کو دیکھ کر لوٹ آیا تھا جسم پھر سے روح کے قریب۔

جسم پر اب روح کی چادر تھی اور نگاہوں میں پہاڑ ندی عورت۔

ڈاکٹر شاکر شجاع آبادی

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی جانب سے جناب شاکر شجاع آبادی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے دی گئی ہے۔اب وہ ڈاکٹر محمد شفیع شاکر شجاع آبادی کہلائیں گے۔

شاکر شجاع آبادی سے اینکر نے سوال کیا کہ زندگی میں اتنے دکھ دیکھے،معذور بھی ہیں،بول بھی ٹھیک سے نہیں سکتے، غربت بھی کاٹی،کیا اِس کا غم ہے آپ کو؟

تو شاکر شجاع آبادی بولے:

ایتھاں جو بھوگ بھوگے ہن
اُتھاں کوئی جزا مِلسی
تھکیڑے سارے لہہ ویسن
نبی ﷺ مِلسی خدا مِلسی

○

اُستاد لال سنگھ

دیپک کنول
(ممبئی)

لال سنگھ نے جونہی خونی نالہ پار کیا تو ایک جوان عورت ایک بچے کے ساتھ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہوگئی۔عورت کو دیکھ کر لال سنگھ کے ہوش اُڑ گئے۔اُسے لگا کہ یہ کوئی بھٹکتی ہوئی روح ہے جو اُسے بھٹکانے کے لئے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہوگئی ہے کیونکہ اس خونی نالے نے سینکڑوں مسافروں کو نگل لیا تھا اس لیے اس کا نام خونی نالہ پڑ گیا تھا۔جونہی اُسنے لال سنگھ کو ہاتھ دکھا کر رکنے کا اشارہ کیا تو لال سنگھ نے اتنی زور سے بریک ماری کہ اُسکا کلینر علی بخارا سیٹ سے اُچھل کر ونڈ سکرین سے جا کے ٹکرایا۔غنیمت یہ رہی کہ نہ ونڈ سکرین ٹوٹا اور نہ ہی علی بخارا کا سر پھٹا۔علی بخارا درد کی شدت سے چلایا۔اس چوٹ سے وہ اندر تک بلبلا کے رہ گیا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا وہ عورت کھڑکی کے پاس آ کر لال سنگھ سے بڑے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''اُستاد جی ایک گھنٹے سے اس بچے کے ساتھ یہاں کھڑی ہوں۔ کوئی سواری نہیں مل رہی ہے۔کیا آپ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھالیں گے؟''

لال سنگھ جو ابھی تک دم بخود ہو کے بیٹھا تھا،ایک جھرجھری مار کر اُس عورت کی طرف بڑے غور سے دیکھنے لگا۔اُسنے جی کڑا کر کے کھڑکی کھولی اور سب سے پہلے جھانک کر اُس عورت کے پاؤں دیکھے کہ کہیں پاوں اُلٹے تو نہیں ہیں۔ پاؤں تو سیدھے تھے اس لئے کسی حد تک اُسے یہ تسلی ہوگئی کہ یہ کوئی ڈائن یا بھٹکتی روح نہیں ہے۔دوسری بات جس سے اُس کی طبعیت ٹھکنے لگی تھی وہ یہ تھی کہ اُسکے ساتھ ایک بچہ تھا۔اگر وہ کوئی ڈائن یا بھٹکتی ہوئی آتما ہوتی تو اُسکے ساتھ بچہ نہیں ہوتا۔اُسنے طمانیت کا سانس لے کے اُس سے پوچھا۔

''کہاں جانا ہے تمہیں؟''

''مجھے رام سوجانا ہے۔''وہ روہانسی ہو کر بولی۔''یہ بچہ صبح سے بھوکا ہے۔اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں خدا کو کیا جواب دوں گی؟''

''رومت رومت۔کوئی نہیں۔واہگورو سب ٹھیک کر دے گا''

اُسنے علی بخارا کی طرف دیکھ کے کہا۔

''تو پیچھے بیٹھ جا۔اس غریب عورت کو یہاں بیٹھنے دے''

''میری طبعیت ٹھیک نہیں ہے اُستاد جی۔میں پیچھے نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے پیچھے بیٹھنے کے لئے کہو نا''

لال سنگھ نے لال پیلی آنکھوں سے علی بخارا کی طرف دیکھا اور پھر کسی قدر برہم ہو کے بولا۔

''جب دیکھو مردے کی طرح سیٹ پر پڑا رہتا ہے۔یہ مت بھولو کہ تم میرے کلینڈر ہو۔اپنی اوقات میں رہنے کی کوشش کرو۔''

علی بخارا نے غصے سے لال سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر بڑبڑاتے ہوئے لاری سے نیچے اُتر گیا۔نیچے جا کر اُسنے للچائی نظروں سے اُس عورت کو دیکھا جس کا بدن گدرایا ہوا تھا اور چھاتیاں اونٹ کے کوہان کی طرح اُبھر آئی تھیں۔اُسنے برا سا منہ بنایا اور پھر دل ہی دل میں لال سنگھ کو صلواتیں سناتے ہوئے لاری کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔اُسکے نیچے اُترتے ہی لال سنگھ نے اُس عورت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اُسنے پہلے بچے کو سیٹ پر بٹھا دیا اور پھر وہ بچے کے بغل میں جا کر بیٹھ گئی۔بچہ مچلنے لگا کہ وہ کھڑکی کے پاس جا کر بیٹھ جائے گا۔اُس عورت نے بچے کو بیچ میں سے ہٹا کر کھڑکی کے پاس بٹھا دیا اور خود وہ لال سنگھ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔لال سنگھ نے کھڑکی بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کی۔اُسکی لاری کافی پرانی تھی۔ اسکے سارے انجر پنجر ڈھیلے تھے پھر بھی لال سنگھ اسے چلا رہا تھا۔لاری نے اسٹارٹ ہوتے ہی دھواں پھینکنا شروع کر دیا۔دھویں کے غبار میں پیچھے کا سارا منظر چھپ گیا اور گاڑی آہستہ خرامی کے ساتھ جموں کی اور بڑھنے لگی۔لال سنگھ ابھی بھی کسی انجانے خوف میں مبتلا تھا۔اُسے لگ رہا تھا کہ یہ عورت کوئی معمولی عورت نہیں بلکہ کوئی پراسرار شخصیت ہے جو نہ جانے کہاں پر اپنے اصلی روپ میں آئے گی۔دراصل اس خونی نالے کے ساتھ کافی ساری پراسرار کہانیاں جڑی ہوئی تھیں۔یہاں پر جتنے بھی حادثے پیش آئے تھے،ان کے پیچھے یہی کہانی ہوتی تھی کہ کوئی عورت سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہو جاتی ہے اور ڈرائیور اپنا توازن کھو کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر کر سیدھے موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔لال سنگھ موت سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔اس بار بھی وہ بہت دیر تک دہشت کے عالم میں رہا۔اپنا خوف کم کرنے کے لئے وہ ایک پنجابی گانے کا مکھڑا بڑے بے سرے انداز میں گنگنانے لگا۔تھوڑے توقف کے بعد وہ اُس عورت کی طرف دیکھ کے بولا۔

''ایک گل میرے پلے نہیں پڑ رہی ہے۔تم رہتی ہو رام سو میں اور کھڑی ہو خونی نالہ کے پاس۔وہ بھی اس بچے کو لے کر۔یہاں نہ کوئی بستی ہے اور نہ کوئی فوج کا پکٹ پھر تم یہاں کیا کرنے آئی تھی؟''

''بات یہ ہے سردار جی کہ وہ جو سامنے والی پہاڑی پر گھر دکھائی دے رہا ہے نا وہ میرے خالو کا گھر ہے۔میں اُس سے ملنے گئی تھی۔وہ گھر پہاڑی کے ٹبے پر کھڑا ہے جہاں تک کوئی سڑک نہیں بلکہ ایک پگڈنڈی جاتی ہے۔ہمیں اسی پگڈنڈی سے ہو کے جانا پڑتا ہے۔وہاں سے کوئی سواری ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔سو ہم اُسی پگڈنڈی سے گئے بھی اور آئے بھی ''

''تم اتنے کلومیٹر پیدل چل کر آئی ہو۔بڑی ہمت والی ہو تم۔نہ جانے مجھے اب بھی ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم کوئی گوشت پوست کی عورت نہیں بلکہ بھٹکتی ہوئی روح ہو''

''چہارسُو''

اس بار عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔لال سنگھ اُسکی اس بلوریں ہنسی کے ریلے میں جیسے بہہ کے رہ گیا۔اس کھلکھلاہٹ میں اُس کے دانتوں کی لڑی ایسے چمکی جیسے شفق بھرے بادلوں میں سے بجلی لپکی ہو۔اس کھلکھلاہٹ میں لال سنگھ کو جیسے سنگیت کی چھنکار سنائی دی۔غور سے دیکھا جائے تو اس عورت کی عمر زیادہ نہ تھی مگر پہاڑی ہونے کے سبب وہ وقت سے پہلے ہی ایک مکمل عورت بن چکی تھی ۔اُسکا گدرایا جسم ،اُسکا سڈول بدن ، اُسکی ابھری ہوئی چھاتیاں اس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ وہ شباب کی مینار پر کھڑی ہے ۔اُسکی مستی بھری جوانی ،دعوت شہوت دے رہی تھی ۔اُسکے اندام کے یہ مدو جزر دیکھ کے لال سنگھ کے جذبات کا تنور دہکنے لگا۔وہ ترنگ میں آکر کبھی اسٹیرنگ دائیں بائیں گھمانے لگتا تو کبھی ایکسلیٹر دبا کر گاڑی کی رفتار بڑھانے کی کوشش کرتا۔گاڑی کا انجن بہت پرانا تھا اسلئے رفتار بڑھتے ہی وہ گھر رگھر رکا ایک بے ہنگم سا شور مچاتے ہوئے آگے بڑھنے لگتی تھی۔لال سنگھ کی ان حرکتوں سے وہ عورت خوفزدہ ہونے لگی۔ایک موڑ پر جب لال سنگھ نے گاڑی تیزی سے گھمائی تو وہ عورت اُس سے جا ٹکرائی۔لال سنگھ کے پورے بدن میں جیسے آگ لگی۔اُس عورت نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑی معصومیت سے لال سنگھ سے بولی۔

''اُستاد جی گاڑی آہستہ چلائے نا''

''کیوں ڈر لگ رہا ہے؟''۔

عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کوئی نہیں میں اب کے گاڑی آہستہ چلالوں گا۔''

ڈھلان سے اُترنے کے بعد اب چڑھائی شروع ہوئی تھی ۔لال سنگھ کو بار بار گیر بدلنا پڑ رہا تھا۔گیر بدلتے ہوئے ایک بار لال سنگھ کا ہاتھ عورت کے پٹھے پر جو گرا تو لال سنگھ فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا کر بغلیں جھانکنے لگا۔اُسے لگا کہ اُسکی اس حرکت سے یہ عورت اُس پر چڑھ بیٹھے گی مگر ہوا اسکے اُلٹ۔وہ تو کن انکھیوں سے ایک شوخ تبسم کے ساتھ لال سنگھ کی طرف دیکھنے لگی۔اس تبسم سے لال سنگھ کے رگ و پے میں جیسے بجلیاں دوڑنے لگیں۔اس تبسم نے لال سنگھ کے حوصلے کو مہمیز کر دیا۔اب کے اُس نے گیر بدلنے کے بہانے اُسکے نرم و نازک جسم کو چھو لیا۔ اُس کے بدن کے لمس سے اُسکے اندر خفتہ پڑے جذبات کے سبھی ساز ایک ساتھ جھنجھنا اُٹھے جیسے کسی مضطرب مضراب نے اُسکے احساس کے تار تار کو جھنجھوڑ دیا ہو ۔وہ اُس عورت کی طرف ایسی للچائی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ عورت نہ ہو کوئی شکر کی مورت ہو جسے وہ چاٹ چاٹ کے کھانا چاہتا ہو۔

لال سنگھ بڑا من موجی آدمی تھا۔وہ بارہ مولا کے سنگھ پورہ کا باسی تھا۔ بڑی مشکل سے اُس نے آٹھ جماعتیں پاس کیں تھیں ۔گھر میں دو بہنیں اور بوڑھے ماں باپ تھے۔تھوڑی بہت کھیتی تھی جیسے تیسے کر کے گزارہ چلتا تھا۔گھر میں چونکہ وہ اکلوتا بیٹا تھا اسلئے اُسنے بچپن سے ہی دماغ میں یہ بات بٹھالی تھی کہ اُسے جلدی سے ماں باپ کا ہاتھ بٹانا ہے اسلئے نو جماعتیں پاس کرتے ہی اُسنے نوکری کی تلاش شروع کی ۔قسمت سے اُسے جموں کشمیر کے محکمہ ٹرانسپورٹ میں کلینر کی نوکری مل گئی۔ایک دو سالوں میں اُسنے دونوں بہنوں کی شادیاں کر ڈالیں۔چار سال کے بعد اُسکی ترقی ہوگئی اور وہ کلینر سے ڈرائیور بن گیا۔ڈرائیور بنتے ہی آمدنی میں دوگنا اضافہ ہو گیا۔وہ ہفتے میں دلی کا ایک پھیرہ لگا کے آتا تھا اور گھر والوں کے لئے ڈھیر ساری چیزیں لے کے آتا تھا۔گھر کے حالات کافی سدھر چکے تھے۔اُنہوں نے اپنے پرانے گھر کو نئے سرے سے تعمیر کرایا اور لال سنگھ نے دلی سے گھر کو سجانے سنوارنے کے لئے کیا کیا چیزیں نہ لائیں۔پڑوسی دیکھتے تو اُنکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ماں اپنے پوت پر ہزار جان سے واری واری جاتی تھی۔اتنا لائق اور فرمانبردار بیٹا نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔بہنیں پیچھے پڑ گئی تھیں کہ وہ بیاہ کرلے مگر لال سنگھ اسکے لئے تیار نہ تھا۔ماں بار بار پوچھتی کہ کوئی لڑکی پسند ہو تو بتا دو وہ بات کرنے جائے گی مگر وہ صاف جواب نہیں دیتا تھا۔

نانا کرتے کرتے دو برس بیت گئے ۔ایک دن جب وہ جموں کے پھیرے پر تھا تو پتا چلا کہ باپ نے پران چھوڑ دئے۔وہ جب یہ خبر سن کے گھر پہنچا تو گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ابھی وہ باپ کی جدائی کے صدمے سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اُس کی زندگی میں ایک اور قیامت ٹوٹی۔اُسکی ماں بھی اپنے شوہر کے پیچھے ایک مہینے کے بعد چلی گئی۔اس دوہری مار نے لال سنگھ کو توڑ کے رکھ دیا۔وہ کئی ہفتوں تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔اُس نے چپ سادھ لی۔نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔جب دیکھو خلا میں گھورتا رہے اور پھر گھٹنوں میں منہ ڈال کر روتا رہے۔اُسے اس حالت سے باہر نکالنے کے لئے اُسکی دونوں بہنوں کو کافی مشقت کرنا پڑی۔کافی سمجھانے بجھانے کے بعد اُنہوں نے اُسے ڈیوٹی پر جانے کے لئے راضی کر لیا۔

جب تک ماں باپ تھے وہ بڑا صاف ستھرا اور شاداں رہتا تھا۔ جوان تھا،قبول صورت تھا۔تب اُسے رنگ برنگی پگڑیاں پہننے کا بڑا شوق تھا۔ہر روز وہ ایک نئے رنگ کی پگڑی پہن کر آتا تھا۔ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی جب وہ گھر جانے کی تیاری کرتا تھا تو اپنی وردی اُتار کر عمدہ کپڑے پہن کے گھر جاتا تھا۔ اب جب کہ گھر میں کوئی نہیں تھا اُسکے سبھی شوق جیسے مر گئے تھے۔اپنا غم غلط کرنے کے لئے وہ خوب شراب پینے لگا تھا۔کبھی دلی جانا ہوا تو کسی کوٹھے پر بھی جاتا تھا اور وہاں پر شب بسری کرتا تھا۔جتنی بری چیزیں تھیں وہ اُنکی طرف مائل ہونے لگا تھا۔گھر جاتا تھا تو میلے کچیلے کپڑوں میں ہی جاتا تھا اور ان ہی کپڑوں میں سو جاتا تھا۔کبھی کبھی وہ ہفتوں نہاتا نہیں تھا۔پگڑی میں گریس اور موبل آئل لگا ہوتا تھا جسکی وجہ سے پگڑی کالی پڑ گئی تھی ۔وہ اس پگڑی کو دھلواتا نہیں تھا۔بس اسے ہی سر پر باندھ کے نکل جاتا تھا۔

بہنوں سے بھائی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔اُنہوں نے فیصلہ لیا کہ کچھ بھی ہو اُنہیں اپنے بھائی کو اس طرح ٹوٹنے نہیں دینا ہے۔اُنہوں نے ایک لڑکی پسند کی جس کا نام تھا پرکاش کور۔وہ بڑی بہن کے سسرال والوں کی رشتہ

دار تھی ۔ وہ جوان تھی ، خوبصورت تھی اور بڑی وضع دار لڑکی تھی ۔اُنہوں نے کافی منت سماجت کر کے بھائی کو اس رشتے کے لئے منا لیا اور ایک دن ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ لیا ۔ پرکاش کور کے آنے سے پہلے لال سنگھ کی جوزندگی بڑی ہی بکھری بکھری سی تھی اور وہ ایک مجرد اور تنہا زندگی گزارنے کا عادی ہونے لگا تھا، پرکاش کور کے آنے کے ساتھ اُسکی زندگی میں ایک ٹھہراو اور یکسوئی آ گئی ۔ پرکاش کور نے اُسے نہ صرف جینے کا ڈھنگ سکھایا بلکہ اُسے زندگی سے پیار کرنا بھی سکھایا ۔ پہلے وہ اکل کھرا تھا، کسی سے میل جول نہیں رکھتا تھا بس اپنے آپ میں ہی گم رہتا تھا ۔ پرکاش کور کی صحبت میں رہ کے وہ ایکدم بدل گیا ۔اب وہ لوگوں سے کھل کے ملتا تھا ۔چہل بازی کرتا تھا ۔اُسکی نحوست دور ہوگئی تھی ۔اب وہ ہر دم چہکتا ہوا نظر آتا تھا اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پرکاش کور کے جلو میں گزارنا چاہتا تھا ۔ یہ پرکاش کور کی جادوئی شخصیت کا اثر تھا یا اُسکی دیوانگی کی انتہا کہ شادی کے بعد اُسنے ایک بار بھی کسی کوٹھے پر قدم نہیں رکھا ۔ پینے کے معاملے میں بھی وہ بڑا محتاط رہتا تھا ۔اُسکے سنگی ساتھی اُسے طعنہ مارتے تھے ۔

''لگتا ہے پراجی پر پرجائی نے کوئی جادوٹونا کر دیا ہے ''

''سن پراوا ۔ پرکاش کور میری لگائی ہے ۔ میں نے بیاہ کے وقت پرکاش کور نو وچن دیا تھا کہ میں کدی کوئی غلط کام نہیں کروں گا جس سے اُسکے دل نو ٹھیس پہنچے''

اُسکے بعد وہ اپنی بیوی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتا تھا ۔

اب اُنکی شادی کو سات سال ہو چکے تھے ۔ان سات سالوں میں اُنکے دو بچے ہوئے تھے ۔ وہ دو بچوں کو جنم دینے کے بعد ویسی ہی دم دار اور سڈول لگ رہی تھی جیسے وہ پہلی رات کو لگ رہی تھی ۔اُس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی ۔ان سات سالوں میں اُسنے پرکاش کور سے کبھی نظریں ہٹا کے ادھر اُدھر نہیں دیکھا ۔اُس سے کئی خوبصورت عورتیں ٹکرائیں مگر کبھی اُسکا دل کسی پرائی عورت کو دیکھ کے نہیں ڈولا ۔اُسے سبھی عورتیں اپنی پرکاش کور کے سامنے ہیچ لگتی تھیں ۔

آج پتا نہیں اُسے کیا ہوا کہ اس عورت کو دیکھ کے اُس کا من ڈولنے لگا ۔ وہ نہ چاہ کر بھی اُسے کنکھیوں سے بیچ بیچ میں گھور رہا تھا اور اُسکے اُبھرے ہوئے سینے کو کسی نہ کسی بہانے چھو لیتا تھا ۔اُس لڑکی نے نہ جانے اُس پر کیا جادو کر دیا کہ وہ اپنی پرکاش کور کو بھول گیا، اپنی وفا اور ایماندار بیوی کو بھول گیا ۔سارے عہد و پیمان اور قول و قرار بھول گیا ۔اُسنے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔

''تمہارا بچہ ہے؟''

''نہیں میرے بھائی کا بیٹا ہے ۔ میں تو ابھی تک کنواری ہوں ۔''

اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''ابھی تک کوئی من پسند لڑکا نہیں ملا ۔''

''ارے اتنے سارے پہاڑی جوان ہیں ۔ کڑیل ، بانکے ۔ تمہیں ایک لڑکا نہیں ملا'' کہہ کر لال سنگھ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا ۔

وہ تین بجے کے قریب رام سو پہنچے ۔ راستے میں لال سنگھ نے اُس عورت کی خوب خاطر داری کی ۔علی بنجارا یہ سب دیکھ کے اندر ہی اندر کڑھ کے رہ گیا ۔ لال سنگھ جو اپنے کلینر کو ایک روٹی زیادہ کھانے پر ٹوکتا تھا وہ اس انجان عورت پر ایسے مہربان تھا جیسے وہ اُسکی لگائی ہو ۔اُس عورت کا گھر ایک ٹیلے پر تھا ۔ اچھا خاصا گھر تھا اُسکا لال سنگھ نے گھر دیکھ کے خوشی اور حیرت کا اظہار کیا ۔ لال سنگھ نے جاتے جاتے اُس سے کہا ۔

''کبھی کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو کہنا ۔''

''اُستاد جی میرا بھائی کبھی کبھی دلی جاتا ہے ۔ وہ وہاں سے کریانے کا مال لاتا ہے ۔ جب آپ کبھی دلی جاؤ گے تو اُسے اپنے ساتھ لے جانا ۔''

''ارے کیوں نہیں ۔ میں اگلے ہفتے دلی کا پھیرہ لے کے جا رہا ہوں ۔ اُسے تیار رکھنا ۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے کے جاؤں گا''

اُسنے لال سنگھ پر ایک پیار بھری نظر ڈالی ۔ لال سنگھ اس ایک نظر سے گھائل ہو گیا ۔اُسکا دل نہیں کرتا تھا اس عورت کی نظروں سے اوجھل ہونے کو مگر جانا تو لازمی تھا ۔ وہ اُس سے رخصت لے کے نکل گیا ۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تو علی بھی آ کے اُس کے بغل میں بیٹھ گیا ۔ وہ ابھی تک جلا بھنا بیٹھا تھا ۔ لال سنگھ کے دل میں چور تھا اسلئے وہ علی کے سامنے گیان کی باتیں کرنے لگا ۔

''کوئی اگر تکلیف میں ہو تو ہمیں اُسکی مدد کرنی چاہیے ۔ اگر میں اس لڑکی کو گاڑی میں نہیں بٹھاتا تو اس کے ساتھ کچھ انہونی بھی ہو سکتی تھی ۔ دیکھ علیا زمانہ بہت خراب ہے ۔آج دن دہاڑے لڑکیوں کی عزت لوٹی جاتی ہے ۔''

علی کو لال سنگھ کی ان ساری باتوں میں مکاری کی بو آ رہی تھی ۔اُسنے اُسکی باتوں پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا ۔ وہ تو جلد سے جلد جموں پہنچ جانا چاہتا تھا اور کھا پی کے سو جانا چاہتا تھا ۔ لال سنگھ علی کے تیور دیکھ کر چپ ہو گیا ۔اُسے یہ ڈر کھانے لگا کہ کہیں یہ کمبخت اس بات کی ڈانڈی نہ پیٹے کہ لال سنگھ کسی عورت کے پیچھے لٹو ہو گیا ۔اُسنے اس موضوع کو نہ چھیڑنے میں ہی بہتری سمجھی ۔

ایک ہفتے کے بعد جب وہ دلی کا پھیرہ لے کے رام سو سے گزرا تو اچانک اُسے اُس عورت کی یاد آ گئی ۔اُسنے اُس کے گھر کے باہر گاڑی کھڑی کی اور خود اُسے دیکھنے اندر چلا گیا ۔ وہ عورت اُسے دیکھ کے کھل اُٹھی ۔اُسنے صحن میں اُسکے لئے کھاٹ بچھائی ۔ لال سنگھ کھاٹ پر ایسے بے تکلفی سے بیٹھ گیا جیسے وہ اپنے سسرال میں آیا ہو ۔اتنے میں اُسکا بھائی آ گیا جو کہ شکل وصورت سے کوئی چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا ۔اُس نے لال سنگھ سے ہاتھ ملایا اور اُس کا اس بات کے لئے احسان جتایا کہ اُسنے اُسکی بہن اور بیٹے کو بحفاظت گھر تک پہنچایا ۔ لال سنگھ نے اُسے جلدی سے تیار ہونے کے لئے کہا کیونکہ اُسے اگلی صبح تک دلی پہنچنا تھا ۔اُس عورت کا بھائی جس کا نام بختاور تھا کپڑے پہننے چلا گیا ۔اس بیچ اُس عورت نے لال سنگھ اور علی کی خوب خاطر داری کی ۔آدھے گھنٹے کے بعد وہ گاڑی

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ کیجیے

" آفتاب کا زخم "

اسرار احمد المعروف ابنِ صفی
(۲۶۔جولائی ۱۹۲۸ء تا ۲۶۔جولائی ۱۹۸۰ء)

بڑے غضب کا ہے یارو بڑے عذاب کا زخم
اگر شباب ہی ٹھہرا مرے شباب کا زخم

ذرا سی بات تھی کچھ آسماں نہ پھٹ پڑتا
مگر ہرا ہے ابھی تک ترے جواب کا زخم

زمیں کی کوکھ ہی زخمی نہیں اندھیروں سے
ہے آسماں کے بھی سینے پہ آفتاب کا زخم

میں سنگسار جو ہوتا تو پھر بھی خوش رہتا
کھٹک رہا ہے مگر دل میں اک گلاب کا زخم

اسی کی چارہ گری میں گزر گئی اسرارؔ
تمام عمر کو کافی تھا اک شباب کا زخم
○

ولی عالم شاہین
(کناڈا)

وہ نقدِ شعر وہ حسنِ بیاں نہیں چلتا
دیارِ غیر کا سکّہ یہاں نہیں چلتا

نہ تازگی ہے نہ خوشبو بکھرتے پتّوں میں
نکل کے رنگ سے دَورِ خزاں نہیں چلتا

کبھی کے ہو چکے متروک سلسلے سارے
طلسم اب بکفِ قدسیاں نہیں چلتا

خدا کا شکر ہوا اب یہ معرکہ بھی طے
سدا کہا ترا عمرِ رواں نہیں چلتا

جواب نامے چمن زار حیرتوں کے تھے
یہ سلسلہ بھی مگر جاوداں نہیں چلتا

یہیں کہیں تو مرے نقشِ پا کا مامن ہے
یہ راہ جس پہ کبھی کارواں نہیں چلتا

طویل رُت ہے زمستاں کی دن ہیں چھوٹے سے
یہاں تو سایہ تلک سایہ ساں نہیں چلتا

ہے آس پاس ہی پتوں کی ڈھیریوں میں ہوا
اتار کر کوئی بارِ گراں نہیں چلتا

غرض اب اصل سے ممکن نہ عشق سود سے ہے
یہ کاروبار بغیرِ زیاں نہیں چلتا

اُسے بس اپنی ہی آواز تھی بہت، ورنہ
پرائے روپ میں قصہ کہاں نہیں چلتا

بس اک سرور ہی کافی ہے ہم نشینی کا
سبق کے بعد یہاں امتحاں نہیں چلتا
○

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

منظور ہی نہیں ہے کوئی بات، سب غلط !
یہ کالے دِن غلط، یہ سیہ رات، سب غلط !
ضِد ہے تو یہ کہ جو وُہ کہیں، بس وہی ہے ٹھیک
جو بھی ہے میری بات، تری بات، سب غلط !
بادِ سموم پھیلی ہوئی دُور دُور تک
یہ شہر بھی غلط ہے، مضافات سب غلط !
چھپ کر مخالفین کی خدمت میں حاضری
دہلیز پر عدُو کی مُدارت، سب غلط !
اُٹھنے لگے ہیں جتنے سوالات، سب درست !
لیکن جو مل رہے ہیں جوابات، سب غلط !
پہلے تو لگ رہا تھا یہاں ٹھیک کچھ نہ کچھ
اب شہرِ اقتدار کے دِن رات سب غلط !
زنجیرِ عدل نصب تو ہر چوک میں ہوئی
حاکم مُصِر، ہماری شکایات سب غلط !
اب دیکھا، اقتدار کے مرکز کچھ اَور ہیں
ہم نے چنے ہوئے تھے مقامات سب غلط
تعمیلِ حُکم کرنے سے مُنکِر ہیں ماتحت !
ملنے لگیں جو اُن کو ہدایات سب غلط
قابض امیرِ شہر ہی کشکول پر ہوا
ہم مانگتے رہے ہیں جو خیرات، سب غلط !
شورش زدہ علاقے میں بے وقت راگنی
امن وسکون وچین کے نغمات سب غلط !
مَیں بد دُعا کسی کو بھی دیتا نہیں ، مگر
اِن مُوذیوں کے حق میں مناجات سب غلط !
مجھ سا وطن پرست بھی کوئی نہیں، مگر
آنے لگے ہیں دِل میں خیالات سب غلط !
اب دِل کو اعتبار کسی پر نہیں رہا
قول وعمل کے سارے تضادات، سب غلط
دونوں طرف ہیں ایک سے سب اہلِ اقتدار
اس معرکے میں جیت ہو یا مات، سب غلط
کچھ بھی یہاں پہ ٹھیک نہیں لگ رہا نسیم
یعنی یہاں کی صورتِ حالات سب غلط !

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

نہ آب ودانے کا میں ہدف ہوں، نہ ہے ہدف میرا آب ودانہ
مجھے ٹھکانے لگائیں گے کیا، نہیں ہے جن کا کوئی ٹھکانا

عدو بھی یہ جانتا ہے میرا کبھی نہیں چوکتا نشانہ
مرے نشانے پہ آنے والے کو کیا ملے گا کوئی ٹھکانا

مرا قبیلہ موحدوں کا، ترا گھرانا ہے مشرکانہ
معاف کرنا کبھی نہیں ہو گا دوکناروں میں دوستانہ

بنانے والے نے اپنی صورت پہ ڈھال کر مجھ میں روح پھونکی
بقا ہے میرے خمیر ہی میں فنا نہ کرپائے گا زمانہ

دھوئیں نے لکھا یہ آسماں پر، زمیں پہ دارو مدار مت کر
یہ پیاسا کنبہ، یہ جلتا خیمہ، ہے سادہ لوحی کا شاخسانہ

لکیر ہم کو جو کھینچنی تھی وہ ہم نے پتھر پہ کھینچ دی ہے
پڑے گا بے دست و پا کو مشکل اسے مٹانا اسے گھٹانا

یہ لوگ وہ ہیں جو جانتے ہی نہیں صحیفے میں کیا لکھا ہے
کھُلے گا کیا خاک خیرؔ اُن پر ہمارا ''حرفِ ہزار معنیٰ''

○

ارشدانصاری

(کراچی)

صورت دید تو پیدا ہو جانے کس وقت
اس حسرت میں کہیں جان نہ جائے جاں سے

سحر کی آس میں بیتی، شبِ امیدِ وفا
کبھی بھی سحر نہ ہوئی اس سحرِ پریشاں سے

آ ذرا چھیڑ دے وہ نغمۂ جاناں اک بار
بربط کی یہ حسرت ہے اس شہرِ خموشاں سے

رونقیں ختم ہوئیں جشنِ طرب کی اُس دم
جس دم وہ چلا غارت گرِ دل محفلِ جاناں سے

رقص میں کون ہے یہ ارشدؔ، اسے جانے کون
بے خبر عشق میں ہے وہ مے خانۂ تاباں سے

اشرف جاوید

(لاہور)

دستِ دُعا پڑا ہے، گدائی پڑی ہوئی
پھر بھی ہے مصلحت میں خدائی پڑی ہوئی

پیغام دے رہے ہیں کفن سے نکالے ہاتھ!
کچھ بھی نہ کام آئی کمائی پڑی ہوئی

جس پر بھی ہاتھ رکھ دے، وہی پاک صاف ہے
قاضی کی شہر بھر میں دُہائی پڑی ہوئی

بے جوہر آئنوں میں کوئی عکس کیا بنے!
مدّت سے جھیل جھیل پہ کائی پڑی ہوئی

تصویر کے نقوش تو واضح نہ ہو سکے
گرچہ تمام گرد ہٹائی پڑی ہوئی

کیسے دلوں میں پھوٹ پڑے نفرتوں کے بیج
کیسی قبیلوں میں ہے لڑائی پڑی ہوئی

لگتا ہے اب تلک تھا فقط میرا اِنتظار
ہر شے اُسی طرح نظر آئی پڑی ہوئی

گم ہو گیا ہے قافلہ اپنے غبار میں
مُنہ دیکھتی ہے راہ نمائی پڑی ہُوئی

جاگ اُٹھا دفعتاً مرے اندر کا شخص بھی!
اک دو قدم پہ جب تھی رہائی پڑی ہوئی

فیصل عظیم
(کینیڈا)

خامُشی بولی ہے نیندوں کی زبانی کیا کیا
لکھ دی آنکھوں کے غلافوں پہ کہانی کیا کیا

ہاں مگر تم نے کبھی کھُل کے کہا تو ہوتا
ورنہ مت پوچھو! مرے دل نے تو ٹھانی کیا کیا

کاہشِ رزق و بدن، جنگ و جدل، لطفِ چمن
خواب نے لمس کو پہنائے معانی کیا کیا

کچھ ستارے نظر آتے ہیں ذرا دیر کے بعد
ورنہ آفاق دکھاتی ہے، جوانی کیا کیا

یہ کرن ویسے تو آئینے میں دھڑکی تھی بہت
میرے پہلو میں جو آئی تو نہ مانی کیا کیا

دن کی مشتاق ہتھیلی پہ سلگتی ہے پیاس
رات بھیگے تو برس جاتا ہے پانی کیا کیا

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

تمہاری یاد کو دل سے کبھی بُھلا نہ سکے
جو پیار بن کے تم آئے تو دل سے جا نہ سکے

وہ روز شب جو سنہرے دنوں کی یادیں ہیں
سدا بہار وہ لمحے کبھی بھلا نہ سکے

یہ جانا میں نے کہ رشتوں کا اعتبار نہیں
جو جسم و جان بنے تھے وفا نبھا نہ سکے

ہزار بار میری روح اُنہیں بلاتی رہی
وہ سوئے ایسے کہ اُن کو کبھی جگا نہ سکے

ہنسے تو ہم بھی تیرے بعد بارہا لیکن
جو تجھ سے مل کے ہنسے تھے وہ کیف پا نہ سکے

حیات آب سے نکلی تھی خاک سے مل کر
عطا ہمیں بھی ہوئی تھی، مگر نبھا نہ سکے

پیا تھا ہم نے تو آبِ حیات بھی لیکن
قضا جو سامنے آئی کہیں بھی جا نہ سکے

عجب سفر پہ چلا جا رہا ہوں میں بھی ریاضؔ
سفر تمام جو کر لے وہ لوٹ آ نہ سکے

○

عرفان حمید
(کاشی پور، اُتر کھنڈ)

تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں میں
بدل رہے ہو تم ، بدل رہا ہوں میں

کل اس زمیں پہ پھر مجھے بسائے گا
وہ جس کے حکم سے نکل رہا ہوں میں

یہ طاقچہ تو میرا طاقچہ نہیں
یہ کس کے طاقچے میں جَل رہا ہوں میں

طلوع ہونا چاہتے ہیں کچھ دیے
غروب ہو رہا ہوں، ڈھل رہا ہوں میں

چھُڑا کے ہاتھ دور جا چکا کوئی
لحد پہ خالی ہاتھ مل رہا ہوں میں

جفا کے بعد کر رہا ہے مِنّتیں
بدرجہ موم سا پگھل رہا ہوں میں

میں جب کبھی بنائے مسئلہ رہا
تو خود ہی مسئلے ک حل رہا ہوں میں

وہ سب سے روبرو ہوا میرے سوا
مجھے لگا کہ اُس کو کھَل رہا ہوں میں

وفا کی پیشکش پہ اُس کا شکریہ
دلیل تھا کہ اس کو چھَل رہا ہوں میں

مدد کے ہاتھ کتنے اور کب تلک
گِرا ہوں بارہا سنبھل رہا ہوں میں

تو چاہتا ہے آگ جلنی چاہیے
سو آگ دھیمی کر اُبل رہا ہوں میں

کروں گا کیا جو گُل کو غم ملا مجھے
خوشی میں کس قدر اُچھل رہا ہوں میں

محمود کیفی
(سیالکوٹ)

آج ٹریفک جام نہیں ہے، اچھا ہے
مجھ کو بھی کوئی کام نہیں ہے، اچھا ہے

میں نے کہا آرام کرو تو غُصّہ کِیا
اب اُس کو آرام نہیں ہے، اچھا ہے

میرے فارغ رہنے پر جو ہنستا تھا
اُس کے پاس بھی کام نہیں ہے، اچھا ہے

مجھ کو طعنے دیتا ہے گُمنامی کے
جس کا اپنا نام نہیں ہے، اچھا ہے

خاص طرح کے لوگ پسند ہیں اُس کو بھی
میرا ذوق بھی عام نہیں ہے، اچھا ہے

ورنہ یہ بھی بِک جاتی بازاروں میں
چاہت کا کوئی دام نہیں ہے، اچھا ہے

کیفی تیرا دِین محبت ہے، اِس میں
مُلّا کا کوئی کام نہیں ہے، اچھا ہے

○

دستک

رعنا کوثر
(نیویارک)

صبح کے دس بجے تھے اور گرمی کے دنوں میں جون تو نیویارک میں بہت گرم ہوتی ہے، آج آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس موسم میں اچھے لگ رہے تھے۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ اپنے چھوٹے سے لان میں بیٹھی میں قرآن پڑھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ فون اٹھایا تو زبیدہ تھی باجی کل مسجد میں نمازِ جنازہ ہے اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حالانکہ اس خبر کو کئی دن گزر چکے تھے۔ اپنے جذبات پر قابو بھی پا لیا تھا مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا جس سے ہم کو گزرنا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل کو بہلا نہ سکے اور میں اندر آ کر مختلف دوستوں کو فون کر کے دوسرے دن کے لیے تیار کرتی رہی۔

صبح اٹھ کر نہا دھو کر کپڑے بدل کے اپنی ایک دو دوستوں سمیت مسجد کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہال میں جانے سے پہلے پانی کی بوتل سے پانی پیا اور اندر داخل ہوئی۔ اداس فضا میں ایک تابوت رکھا تھا۔ اس پر کالے ململ کا کپڑا بچھا تھا۔ جس پر کلمہ لکھا تھا۔ اس کے اندر وسیم کا مردہ جسم تھا۔ تابوت کے ارد گرد وسیم کی امی زینت، اس کی بہنیں سیما اور شیما اور بھائی شمیم کھڑے تھے۔ زینت باجی کی آنکھیں ان کی سفید رنگت سے میل کھا رہی تھیں۔ اداس آنکھوں میں بے نور سفیدی تھی۔ وہ مستقل منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں گلے لگایا، وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ کچھ اور لوگ بھی اس خاموش اور اداس فضا میں بیٹھے دعا پڑھ رہے تھے۔

میں نے ایک آخری نظر وسیم پر ڈالی۔ میں نے اسے پندرہ سال بعد دیکھا تھا۔ چہرہ بہت بدلا ہوا تھا۔ ویسے بھی دبئی سے امریکہ تک ایک سفر تھا جو اس کے مردہ جسم نے کیا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ایک دبلا پتلا لڑکا تھا اب ایک فربہ جسم مرد۔ ہم نماز جنازہ پڑھ کر وہاں سے باہر نکل آئے۔ وسیم تو اپنی آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ ایک سفر تھا جو کہ طے ہو چکا تھا۔ ہجرت کا سفر۔ جس کے اندر کتنے درد پنہاں تھے۔ کچھ دھوکے، کچھ جھوٹ جو ایک کی سرزمین میں بسنے کے لیے لوگ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔

زینت کی فیملی چار بچوں پر مشتمل تھی۔ دو خوبصورت بیٹے اور دو پیاری سی بیٹیاں۔ وہ خود بہت خوش شکل تھی۔ ایم۔ اے پاس تھیں۔ ان کی شادی ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے ہوئی اور وہ لوگ ایک اچھی جاب ملنے پر تنزانیہ چلے گئے۔ ان کے بچوں کا بچپن اس سرسبز علاقے میں گزرا۔ کافی عرصہ وہاں گزار کر وہ لوگ پاکستان میں ایک بہت اچھی کمپنی کی ملازمت ملنے پر اپنے ملک منتقل ہو گئے۔ مگر ان کے شوہر سلیم صاحب اتنی اچھی جگہ کام کرنے کے باوجود مطمئن نہیں تھے۔ ان کا دل پاکستان میں نہ لگتا۔ بڑی بیٹی اور بیٹے کا امریکہ میں ایک کالج میں داخلہ کرانے کے بعد وہ سب کو لے کر امریکہ آ گئے۔ کسی پرائیویٹ جگہ پر اکاؤنٹنٹ کے فرائض انجام دینے لگے۔ چھوٹی بیٹی کو سکول میں داخلہ دلوا دیا۔

سب سے بڑا بیٹا وسیم ذہنی طور پر کچھ کمزور تھا۔ اس لیے اس کا تعلیم حاصل کرنا مشکل تھا۔ اس نے بھی کہیں کام ڈھونڈ لیا۔ یوں ان سب کی زندگی بدل گئی۔ پیسے کی کمی نہیں تھی مگر جس ملک میں رہنا تھا وہاں کی شہریت بھی ضروری تھی۔ ورنہ زندگی چھوٹے موٹے کام کرتے ہی گزرتی۔ یہ وہ پاپڑ ہیں جن کو بیلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس کو بیلنا پڑتا ہے وہی دھوپ کی حدت کو محسوس کرتا ہے۔

شیما اور شمیم نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ انہیں کچھ قربانی دینی ہی پڑے گی۔ دونوں خوبصورت ذہین اور تعلیم یافتہ تھیں۔ ترقی کرنے کے لیے راہیں کھلنی ضروری تھیں۔ شیما نے اپنے ساتھی مائیک سے شادی کر لی اور شمیم نے اپنی ایک ساتھی لارا سے شادی کر دی۔ زینت کو برا لگا مائیک تو مسلمان بھی نہیں ہوا تھا مگر سلیم صاحب اور شمیم بہت وسیع خیالات کے مالک تھے۔ اس لیے زینت کو سمجھا دیا، اب دونوں بچے تو یہاں ترقی کر سکتے تھے۔ سیما تو ابھی سکول میں تھی مگر وسیم کا کچھ ہو جائے تو سکون آئے۔ اس کی ذہنی کیفیت دیکھتے ہوئے وہ سوچتی ہیں ایک دفعہ شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ عورتیں گزارا کر ہی لیتی ہیں۔ ہم اس کو ایک فلیٹ دلا دیں گے اور کچھ پیسے باندھ دیں گے۔ ویسے بھی وہ بے حد اچھا لڑکا ہے۔ یہ تلاش جاری رہی کسی نے بتایا کہ فلوریڈا میں ایک لڑکی ہے۔ ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ گرین کارڈ کی فکر نہ کریں وہ ہے اس کے پاس بس رشتہ دے دیں۔

زینت خوش ہو گئیں فوراً وسیم کو لے کر پہنچ گئیں۔ یہ تو اچھی خاصی شکل کی لڑکی ہے۔ میں تو سمجھی تھی کچھ خاص نہ ہو گی اس لیے تیار ہو گئے نہ تعلیم پوچھی نہ کچھ اور وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ روحی کی امی نے خوب خاطر مدارت کی۔ روحی سے وسیم کو ملوا دیا۔ آپ لوگ کب سے یہاں مقیم ہیں۔ روحی کی امی نے پوچھا۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ زینت نے جواب دیا۔ گرین کارڈ تو ہو گا آپ لوگوں کے پاس۔ اس کی امی نے باتوں میں پوچھا۔ ہاں ہے۔ زینت نے تھوڑا رک کر نہ جانے کیوں جھوٹ بولا۔ اس کی امی رشتے پر آمادہ تھیں۔ روحی کچھ خاموش تھی۔ اسے وسیم تھوڑا کمزور اور بیمار لگا تھا اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ جب وہ چائے کی پیالی اٹھا رہا تھا۔ مگر ماں کے کہنے پر وہ تیار ہو گئی۔ زینت نے بتایا تھا کہ وہ ایک فلیٹ بھی اس کے نام کر دیں گی۔

شادی تھوڑے سے لوگوں کی موجودگی میں ہو گئی۔ روحی کی امی نے کہا تھا بیٹا گرین کارڈ بھی ملے گا اور فلیٹ بھی۔ وسیم خوبصورت ہے۔ اعلیٰ خاندان کا ہے۔ تھوڑا سا کمزور ہے تو شادی کے بعد اچھا ہو جائے گا۔

وسیم بہت خوش تھا۔ اسے روحی بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اسے ہر وہ جگہ دکھانا چاہتا تھا جو اس نے بچپن میں دیکھی۔ افریقہ کے خوبصورت علاقے۔ اس کی امی

نے کہا تھا بس چند دنوں کی بات ہے تم کو شہریت مل جائے گی پھر تم روحی کو ہر جگہ لے کر جا سکتے ہو۔ وسیم کو کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس میں تو امی کی باتیں سادگی میں مان لی تھیں۔ اب روحی کو دیکھ کر وہ بہت خوش تھا مگر روحی کو اس سے گھبراہٹ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی امی اسے دوا دیتیں تو اس کے اعصاب قابو میں آتے نہ جانے کیا بیماری تھی۔ وہ اس کے اردگرد گھومتا رہتا اور وہ اس سے دور رہنے کے بہانے ڈھونڈتی۔ آخر کچھ دنوں بعد اس نے وسیم سے کہا۔ آپ میرے گرین کارڈ کے لیے تو اپلائی کریں۔ وسیم گھبرا گیا۔ وہ تو نہیں ہے میرے پاس۔ امی نے کہا ہے کہ وہ آپ دلوائیں گی مجھے۔ کیا۔۔۔ روحی کا ذہن چکرا گیا۔ وہ بھاگ کر زینت کے پاس گئی۔ آنٹی یہ وسیم کیا کہہ رہا ہے کہ میں اس کے لیے گرین کارڈ اپلائی کروں گی۔ وہ رو دینے کو تھی۔ زینت نے اسے دیکھا اور کچھ پریشان ہو گئیں۔ آنٹی وسیم کے پاس گرین کارڈ ہے؟ اور وہ پھر بولی، ہو جائے گا۔ زینت بولیں۔ مگر تم کیوں پریشان ہو تمہارے پاس تو ہے نا۔ نہیں میرے پاس تو نہیں ہے وہ باقاعدہ رو دی۔ آپ نے ہم سے دھوکہ کیا۔ ہم سمجھتے تھے تمہارے پاس کاغذات ہیں تم وسیم کو بھی گرین کارڈ دلوا دو گی۔ زینت بھی گھبرا گئیں تھیں۔ آنٹی میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ یہ دھوکہ ہے۔ وہ بولی وسیم نے گھبرا کر اسے پکڑ لیا۔ تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ روحی۔ میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں مگر روحی اس کا ہاتھ جھٹک کر باہر چلی گئی۔ وہ سڑکوں پر پھرتی رہی، روتی رہی۔ وسیم اسے ڈھونڈتا رہا۔ وہ رات گئے گھر آ گئی۔ زینت نے سمجھایا اب تم مت جاؤ وسیم تمہارے بغیر نہیں رہنا چاہتا۔ ہم کچھ کر لیں گے اس کے بہن بھائی اس کی مدد کریں گے۔ مگر وہ چیختی رہی وہ ایک پاگل بیمار کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ سلیم صاحب نے کہا کہ ہم ہر ماہ تمہیں جیب خرچ دیں گے۔ دبئی چلی جاؤ وہاں ہمارا بہت اچھا فلیٹ ہے پام بیچ پر۔ آپ وہ میرے نام کر دیں روحی نے اچانک کہا۔ سلیم اور زینت گھبرا گئے لاکھوں کا فلیٹ کیسے تمہارے نام کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا آپ مجھے فلیٹ دلائیں گے۔ روحی نے کہا۔ زینت گھبرا گئیں۔ ہم نے تو یہاں دلانے کو کہا تھا۔ تم رہو تو وسیم کے ساتھ مگر وہ نہ مانی۔ اس نے وسیم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ واپس فلوریڈا چلی گئی۔ وسیم کی دنیا ویران ہو گئی۔ زینت نے بہت کہا روحی کو بھول جاؤ۔ اس کو طلاق دے دو مگر وسیم نہیں مان رہا تھا۔ روحی نے دھمکی دینی شروع کر دی تھی اگر وسیم نے طلاق نہ دی تو وہ پولیس میں رپورٹ کر دے گی۔ اسے بے دخل کروا دے گی۔ زینت اور سلیم صاحب وسیم کو سمجھا رہے تھے مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔ وہ روحی کو فون کرتا تھا وہ فون نہ اٹھاتی۔ وہ بے قرار پھرتا رہتا۔ زینت کو افسوس ہو رہا تھا انہوں نے اس کی شادی کر کے اس کا سکون ہی چھین لیا تھا۔ آخر روحی نے اپنی دھمکی پر عمل کر دکھایا۔ اس نے وسیم کی رپورٹ کر دی۔ پولیس میں کہ وہ یہاں غیر قانونی طور پر رہ رہا ہے اس سے جھوٹ بول کر شادی کی اور اب طلاق نہیں دے رہا ہے۔ زینت نے گھبرا کر اسے فوراً ہی دبئی بھجوا دیا اور پھر وسیم کا کیس ایسا بگڑا کہ ہزار کوشش کے باوجود امریکہ آنا مشکل ہو گیا۔

وقت گزرتا رہا سیما نے لاء کی ڈگری لے لی۔ شیما اور شمیم کے بچے بڑے ہونے لگے مگر وسیم وہاں اکیلا بیٹھا رہا۔ اس کو روحی کو طلاق دینی پڑی۔ وہ بہت بے بسی کا شکار تھا۔ اکثر بیمار ہو جاتا۔ زینت کا بس نہ چلتا دبئی جا کر اس کے ساتھ ہی رہنے لگیں مگر ابھی ان کی بیٹی سیما ان کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ادھر جاتی تو وہ تنہائی کا شکار ہو کر انہیں بلانے لگتی۔ سیما نے بھی بے حد کوشش کی کہ وسیم کسی طرح آ جائے مگر چونکہ اس کا کیس اتنا آسان نہ تھا۔ سب بے بس تھے۔ بہن بھائی تو اس سے مل بھی آئے تھے مگر شمیم کی بیگم لارا نے اور شیما کے شوہر مائیک نے اپنے بچے کبھی نہیں بھیجے۔ وہ ڈرتے تھے وسیم کے لیے ایک روم میٹ کا بھی انتظام کر دیا تھا جو اس کی خبریں دیتا رہتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال بھی کر لیتا۔ سیما کی کوششوں سے اب وسیم کا کیس کچھ سلجھ رہا تھا۔ اب اسے جلد ہی امریکہ آ جانا تھا۔ زینت بہت خوش تھیں وسیم نے زینت سے کہا امی امریکہ آنے سے پہلے میں ایک دفعہ وہاں چلا جاؤں جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی تنزانیہ۔ زینت نے منع بھی کیا مگر وہ چلا ہی گیا۔ امی میں بہت مزے کر رہا ہوں۔ سفاری کی سیر بھی کی۔ وہ خوش تھا۔ امی آپ کو بھائی کو اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ شمیم نے کہا۔ میں نے منع کیا تھا مگر وہ گھبرا جاتا ہے۔ اب دیکھو نا تمہارا بڑا بھائی ہے مگر پندرہ سال سے وہاں اکیلا بیٹھا ہے۔ تم لوگوں کے بچے بھی اسے نہ دیکھ سکے۔ اور چھوٹا بھائی خاموشی سے اپنے بارہ سالہ بیٹے کو دیکھنے لگا۔ سچ کہتی ہیں امی آپ صرف ہوائی جہاز سے بارہ گھنٹے کا راستہ مگر کتنی دوری ہو گئی ہے۔ یہ سرحدیں یہ پاسپورٹ کتنے فاصلے کر دیتے ہیں۔ زینت کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ سلیم صاحب اس دنیا سے جا چکے تھے۔ وہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ویسے بھی وہ ان کا پہلا بیٹا تھا وہ کبھی اس بات کو قبول نہ کر سکیں کہ وہ نارمل نہیں ہے۔

گھوم پھر کر آنے کے بعد وسیم بیمار ہو گیا اور پھر ایک دن اس کے روم میٹ کا فون آیا۔ وسیم بھائی کو رات کو دل کا دورہ پڑا۔ ہم سب انہیں ہسپتال لے گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ یہ یک دل دہلا دینے والی خبر تھی۔ زینت رونے لگیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب آ ہی رہی تھا۔ انتظار ختم ہونے والا تھا۔ بہنیں تڑپ گئیں کتنی کوشش کی تھی بھیا کو بلانے کی۔ پھر سیما سے اپنی ماں کی تڑپ نہیں دیکھی گئی۔ اس نے ہر طرح سے کوشش کی اور ان کی اپیل مان لی گئی۔ زندہ نہ سہی مردہ جسم ہی یہاں آ جائے۔ امی اس کی قبر کے سرہانے دعا تو پڑھ لیا کریں گی۔ سیما نے اپنی تمام تر کوششوں کا استعمال کر کے وسیم کو بلانے کی وجہ بتائی۔ حکومت نے اس کی بات مان لی وہ آ گیا اس کا مردہ جسم نیویارک کے ایک قبرستان میں دفن ہو گیا۔ ماں نے اس کو چھوا۔ بہنوں نے پیار سے رخصت کیا سب آہستہ آہستہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ زینت ایک دن البم کھولے وسیم کی تصویر دیکھ رہی تھ۔ جب چھوٹا تھا تو کتنا پیارا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کے اعصاب کمزور ہو گئے۔ کتنا علاج کرایا۔ اچانک ذہنی دباؤ سے اس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ وہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ اسے بے حد پیار کرتیں۔ اس کے لیے آسمان سے تارے بھی

باقی صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ فرمایئے

سنگِ میل

قیوم خالد
(شکاگو)

''تو آپ قیصرابراہیم کے بڑے بھائی ہیں'' اس کے بیٹھتے ہی اُنہوں نے سوال کرڈالا۔

''جی ہاں'' وہ کُچھ بوکھلا سا گیا۔ اِنٹرویو اس طرح شُروع ہوگا اُس نے سوچا بھی نہ تھا۔

''آپ کی کوالیفیکیشن''۔ اُنہوں نے فائل اُلٹتے ہوئے پوچھا

''انٹرمیڈیٹ''

''بس! کوئی معقول وجہ؟''

''نامساعد حالات کی بنا پر مُجھے تعلیم کا سِلسِلہ مُنقطع کرنا پڑا''۔ اس نے عذر پیش کیا۔

''کہاں کہاں نوکری کی آپ نے''۔ وہ اِس سے کچھ زیادہ متاثر نظر نہیں آرہے تھے۔

''پایونیر پرنٹرس۔ اوراس کے بعد ایک کیمیکل کمپنی میں کام کیا تھا۔''

''وہاں کیا کام آپ کے ذمہ تھا؟''۔

''جی ٹائپسٹ تھا''۔

''آپ نے ٹائپسٹ کا اگزام پاس کیا ہے؟''۔

''جی ہاں۔ ہائر گریڈ اگزام پاس ہوں۔''

''اسپیڈ کیا ہے آپ کی''؟۔

''70 لفظ فی منٹ۔ اور تھوڑا بہت شارٹ ہینڈ بھی جانتا ہوں۔''

''تھوڑا بہت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ شارٹ ہینڈ پُوری طرح آنا چاہیے۔ ورنہ اس کا آنا نہ آنا دونوں برابر ہیں آپ کُچھ ڈکٹیشن شارٹ ہینڈ میں اور کُچھ لانگ ہینڈ میں لینے سے تو رہے۔''

وہ خاموش رہا۔ اس سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔

''آپ کل سے آفس جائن کرلیجئے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے اپائنٹمنٹ لیٹر لے لیجئے۔ وقت کی پابندی کیجئے۔ اگر آپ آج ساڑھے دس بجے آجاتے تو آج ہی سے ڈیوٹی جائن کرسکتے تھے۔'' وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ تو انٹرویو کے انتظار میں صبح سے ہی باہر بیٹھا ہوا تھا۔ اُنہیں ہی دو بجے کے بعد انٹرویو لینے کا وقت مِلا تھا۔

''یہ فائل سکریٹری صاحب کو دے دیجئے۔ غالباً آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں۔ بدبُو آرہی ہے۔''

اُس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ وہ جانے کیلئے اٹھا تو وہ کہنے لگے ''ہمیں اُمید ہے کہ آپ اپنے بھائی قیصرابراہیم کی طرح دل لگا کر محنت سے کام کرینگے اور ہمیں شکایت کا موقع نہیں دینگے۔

اُس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سوچا کیا وہ کبھی اپنے چھوٹے بھائی قیصرابراہیم سے آگے نکل سکے گا۔ یا صرف اُسکی پرچھائی کی طرح ہی زندگی بسر ہوگی۔ بچپن سے لیکر آج تک قیصر اُس سے دوقدم آگے ہی رہا اور وہ لاکھ جتن کرنے کے باوجود اُسکے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکا۔ بچپن سے دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اِسکول کی زندگی کے پورے دس سال اُس سے پیچھے نہ ہوجانے کی کوشش میں کٹ گئے۔ جہاں قیصر کا شمار جماعت کے پانچ چھ ذہین بچوں میں ہوتا وہیں اسکا کوئی شمار نہ تھا۔ وہ مُشکِل تمام پاس ہوکر اگلی جماعت میں پہنچ پاتا تھا۔ اِس وجہ سے آخر آخر میں اُسے پڑھائی سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کھیل کے میدانوں میں نمایاں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن یہاں بھی قیصر آگے ہی تھا۔ اسکول کی کرکٹ کا وائس کیپٹن اور بہترین فاسٹ باؤلر تھا۔ میٹرک کا اِمتحان دونوں نے ساتھ ہی دیا۔ قیصر نے میٹرک کا اِمتحان فرسٹ ڈیوژن میں پاس کیا تو وہ بمُشکِل تمام تھرڈ ڈیوژن لاسکا۔ پپّا نے نتیجہ دیکھ کر کہا تھا۔ مجھے قیصر سے زیادہ تمہاری فِکر تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں تُم میٹرک میں ہی نہ رہ جاؤ۔ دونوں ساتھ پڑھنے کی وجہ سے تُم اِتنے نمبر لاسکے۔ اکیلے ہوتے تو اِتنے نمبر بھی نہ آتے۔ اُسکی ساری خوشی کافور ہوگئی۔

جب مزید تعلیم کی بات نکلی تو پپّا نے دُکھ کے ساتھ قیصر سے کہا تھا کہ میری دِلی خواہش تھی کہ تمہیں اِنجینئرنگ کی تعلیم دلواؤں لیکن مجبور ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تُم جلد سے جلد پیروں پر کھڑے ہوجاؤ اور ذِمہ داری کا بوجھ اُٹھاؤ۔ مُجھے زِندگی بھر افسوس رہیگا کہ میں تمہیں اِنجینئرنگ کی تعلیم نہیں دِلا سکا۔ جہاں تک اُسکا تعلق تھا اُسے پپّا نے آرٹس سے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ کروادیا تھا کہ کامرس بھی اُس سے چلنا مُشکِل تھا۔ اُسکا دل بھی پڑھائی سے اُچاٹ ہوگیا تھا کہ اُس سے کوئی توقعات وابستہ نہیں تھیں۔ اِنٹرمیڈیٹ اُس نے دو سال ناکام ہونے کے بعد پاس کیا۔ بس ایک چیز میں وہ قیصر سے آگے رہا۔ Type کے دونوں اِمتحان اُسنے قیصر سے پہلے پاس کئے تھے۔ اِنٹر کے بعد اُسنے دو ہزار روپیہ ماہوار کی نوکری کرلی تھی۔ اُسے ایک طمانیت کا۔ احساس ہوا کہ وہ بھائی سے پہلے کمانے لگا ہے۔ لیکن جلد ہی طمانیت کا یہ احساس بھی مِٹ گیا۔ قیصر نے نہ صرف بی کام جائن کرلیا بلکہ پارٹ ٹائم جاب سے اُتنے ہی پیسے کمانے لگا جتنے وہ دِن بھر عرق ریزی کرکے کماتا تھا۔ بی کام مُکمّل کرنے کے بعد وہ اِس پرائیویٹ کالج میں کام کرنے لگا تھا۔ پرچھائیوں کے اِس کھیل میں کِتنے ہی حادثہ ہوئے۔ پپّا اپنے آپ کو زِندگی کی اس دوڑ سے لاتعلُق کرچکے تھے زِندگی کی کڑوی حقیقتوں سے اُنھوں نے آنکھیں مُوند لیں اک رات سوئے تو پھر جاگے ہی نہیں۔ انکی زندگی کی سب صبحیں اور شامیں ختم ہوچکی تھیں۔ گھر کا سارا اِنتظام قیصر نے سنبھال لیا۔ وہ خُود بھی غیر یقینی حالات کا شکار رہا۔ نوکریاں مِلتی رہیں چھُوٹتی رہیں۔ اُسے اِس نوکری کی سخت ضرورت

''چہارسُو''

تھی کہ وہ پچھلے دو ماہ سے بیکار تھا۔ اِس نوکری کے دِلانے میں بھی اُسکے ایک دوست اور بھائی کا ہاتھ تھا۔ اُنکی کوششوں کے بغیر یہ عارضی نوکری کا مِلنا بھی مُحال تھا۔

شام کو اُسکا دوست آدھمکا۔ وہ خُود اُس سے جا کر مِلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ دوست بھی بڑا عجیب تھا۔ دوستوں سے مِلنے کے بارے میں اِسکا ایک فلسفہ تھا۔ جس دِن اُسے یہ دنیا ٹھہری ٹھہری سی لگتی اور زِندگی بے معنی سی لگتی اُس دن وہ دوستوں کو ڈُھونڈنے نکلتا۔ زِندگی میں اِتنی بھاگ دوڑ ہونیکے باوجود کبھی کبھی اُسے یہ دنیا ساکت سی لگتی۔ یہ آج کے دور کا کولمبس تھا۔ دُنیا کا اک اک کونہ دریافت ہوچُکا ہے لیکن اِسکے نزدیک ابھی اِنسانوں کی کھوج باقی تھی۔

''آج تُم پہلی اور آخری مرتبہ پرنسپل کے روم میں بیٹھ کر آرہے ہو'' اِقبال نے تفصیل سُن کر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ پرنسپل صاحب جب نان ٹیچنگ اسٹاف کو اپنے اجلاس میں بُلاتے ہیں تو اُنہیں بیٹھنے کیلئے کُرسی پیش نہیں کرتے اور یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ آپ خُود بھی بیٹھنے کی جرأت نہیں کرینگے' نان ٹیچنگ اسٹاف پر زیادہ برہم بھی ہوتے رہتے ہیں۔''

''شائد پرنسپل ریمارکس بھی کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں''۔ اُس نے سگریٹ کا واقعہ سنا کر کہا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ پاجی ہیں بے وقوف ہیں۔ آپ نالائق گدھے ہیں غصّہ میں یہ سب کچھ روا ہے''

''نالائق گدھے؟ گویا دنیا میں لائق گدھے بھی ہوتے ہیں'' اُسنے کہا:

''ہاں ہوتے ہیں۔ پرنسپل صاحب بھی تو اِسی دُنیا کے رہنے والے ہیں'' اِقبال نے کہا۔ دونوں ہنس پڑے

پھر اُسنے ہاتھوں سے کان پکڑ کر بولا ''میں تو مذاق کر رہا تھا پرنسپل صاحب جتنا پرخلوص اور کھرا آدمی ملنا مشکل ہے۔ وہ بہت ہی باہمت اور پرعزم آدمی ہیں۔ اُنکی زندگی کا واحد مقصد اور نصب العین اس کالج کی آبیاری ہے۔ اُن کا ڈسپلن اور سخت مزاجی بلاوجہ نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کالج کو رکشہ میں آتے ہیں میرا مطلب ہے ہاتھ کے رکشہ میں۔''

''اچھا'' اُسنے حیرت سے کہا۔

''اچھا چائے پلاؤ گے یا نہیں؟''

ابھی تھوڑی دیر میں آجائیگی۔ تمہارے آنے کی اِطّلاع ہوتے ہی ممّی بغیر کُچھ کہے سُنے چائے چڑھا دیتی ہیں۔ چائے پیکر اُس نے سگریٹ سلگائی اور دو تین کش لیکر راکھ پیالی میں جھاڑ دی یہ اُسکی پرانی عادت تھی۔ وہ کئی بار منع کر چکا تھا۔ نفاست پسند ممّی کو اس حرکت سے سخت نفرت تھی۔

''اپنے کالج میں سیاست کُچھ زیادہ ہی چلتی ہے۔ بہتر ہے کہ تُم کچھ پہلے ہی سے جان لو'' پھر اِقبال فرداً فرداً کئی لوگوں کا غائبانہ تعارف کرانے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہت نیک اور سیدھے ہیں۔ اِتنے سخت نہیں ہے جتنے نظر آتے ہیں۔ اُنکی شخصیت ناریل سی ہے۔ اوپر سے سخت اندر سے نرم۔ ہاں وقت کی پابندی کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے اگر اُنکی ٹوپی میز پر رکھی ہوئی ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر سہلاتے ہوئے بیٹھے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پرنسپل صاحب کی ڈانٹ سُنکر آرہے ہیں۔ ایسے میں اُن سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

عظمت بھائی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ جب تم پہلی بار انہیں عظمت بھائی کہوگے تو وہ چونکیں گے اور تمہیں یُوں گھور کر دیکھیں گے کہ گویا تم نے اُنکی عُمر میں دس بارہ سال کا اِضافہ کر دیا ہو۔ کم عُمر لوگوں میں خُود کو ہم عُمر سمجھنا اُنکی عادت ہے۔ آپ کے ساتھ ہنسیں گے۔ لطیفے سُنائیں گے۔ سگریٹ پیش کرینگے۔ حیدرآبادی انداز سے سلام کر کے آپ اُن کے سگریٹ کیس سے دو ایک سگریٹ بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ چاندی کے سگریٹ کیس کی تعریف کیجئے تو خوش ہوجائیں گے پھر محروم سی ہنسی کے ساتھ خُود ہی بتائیں گے کہ یہ کسی کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ اب یہ پُوچھنے نہ بیٹھ جانا کہ یہ تحفہ کس نے دِیا تھا۔

سلیم میں ابھی بچپن ہے۔ مذاق میں دھول دھپہ پر اُتر آتا ہے۔ اُس سے ذرا فاصلہ رکھ کر مِلنا چاہیے۔

یُوسف سے بچ کر رہنا یہ بہت بڑا چالباز ہے۔ تُمہارے سامنے دُوسروں کی بُرائی کریگا۔ لیکن اُسکے سامنے کبھی کسی کی بُرائی کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ایک کے لفظوں کے دھتورے دُوسرے کے دِل کی زمین میں بونا اُسکی فطرت ہے۔ تُمہارے سامنے وہ پرنسپل صاحب کو گالیاں دیگا۔ لیکن اگر تُم پرنسپل صاحب کے بارے میں کچھ کہوگے تو وہ بات پرنسپل صاحب تک پہنچ جائیگی۔ اِسے دو چار لیکچررز کا بھی اعتماد حاصل ہے۔ تمہیں تو بہت بچ کر رہنا چاہیے وہ تمہاری جگہ اس وکینسی پر اپنے سالے کا اپائنٹمنٹ کرانا چاہتا تھا۔

اِن تعارفات کی وجہ سے جو خاکہ اِسکے ذہن میں کالج کا بنا تھا وہ صاف نہیں تھا۔ سارے رنگ گڈمڈ ہوگئے تھے۔ اِتنے سارے لوگوں سے غائبانہ تعارف اُسے وحشت سی ہونے لگی اور یہ تاثر دوسرے دن تک بھی اسکے ذہن پر مُسلّط رہا۔ جب دفتر میں اُسکا تعارف لوگوں سے کرایا گیا تو اُسے بالکُل یاد نہیں رہا کہ اِقبال نے کس کے بارے میں کیا کہا تھا۔ البتہ ایک چہرہ اُسکے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ تھا یُوسف کا چہرہ جو اسکے بجائے کسی اور کو اس پوسٹ پر رکھانا چاہتا تھا۔ یُوسف بہت خلوص سے مِلا۔ گرمجوشی سے مُصافحہ کرنے کے بعد وہ بولا۔

''آج تو مٹھائی ہونی چاہیے۔''

''آج تو پہلی بار کالج آیا ہوں۔ تنخواہ ملنے پر مٹھائی کھلاؤنگا'' اُسنے وعدہ کیا۔

''نہیں یار۔ ہم تو تُمہارے اَپائنٹمنٹ کی خُوشی میں مِٹھائی کھانا چاہتے ہیں۔ اگر تنخواہ کی مِٹھائی کِھلانا چاہتے ہوتو ہر ماہ کِھلانا پڑیگا'' یُوسف نے اِصرار کیا۔

اِقبال نے اسے دیکھ کر آنکھ ماری۔ لنچ میں اُسے سب کو اپنی طرف سے چائے پلانی پڑی تب کہیں جا کر اسے چُھٹکارہ ملا۔

پانچ چھ دن میں ماحول کی اجنبیت کُچھ کم ہوئی۔ وہ اپنے کام کو سمجھنے لگا۔ جو صاحب چھٹّی پر گئے تھے وہ سینئیر کلرک تھے۔ اِنکی جگہ پر اِقبال کو ترقی دی گئی تھی۔ اور اِقبال کی جگہ پر اُسے رکھا گیا تھا۔ اِس شرط پر کہ جب وہ چھٹّی سے واپس آجائنگے تو اِقبال کی ترقی واپس لے لی جائیگی اور اُسے برخواست کر دیا جائیگا۔

جو صاحب چھٹّی پر گئے تھے اُنکا نام محمود تھا۔ ان کے بارے میں پوری جانکاری نہ ہوسکی تھی۔ انکے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ گاہے گاہے سرسری ذکر آجاتا تھا۔ ہاں جب بھی کوئی کام اقبال ٹالنے کی کوشش کرتا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کہتے۔'' تُمہاری جگہ محمود ہوتا تو یہ کام فوری کر دیتا۔'' اُسکے پوچھنے پر اقبال نے بتایا ہاں محمود بھائی ہر کام منٹوں میں کر دیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا۔ آج نہیں تو کل یہ کام ہمیں ہی کرنا ہے۔ پھر ٹالنے سے کیا فائدہ۔ اِسے کام کرتے ہُوئے پندرہ بیس دن گزر گئے تھے۔ ایک دِن سپرانٹنڈنٹ صاحب نے کہا کہ محمود کے پاس سے چھٹّی کی درخواست نہیں آئی ہے۔ پہلی تاریخ پر چھٹّی ختم ہوجائیگی۔ شائد وہ پھر سے نوکری جائن کرلے۔ اِسکے دِل کو ایک دھکّا سا لگا۔ دس بارہ دِن میں یہ نوکری ختم ہوجائیگی پھر وہی نوکری کی تلاش ہوگی اور ہم ہونگیں۔ کیا میری ساری زندگی خانگی کمپنیوں کی نوکریاں کرتے چھوڑتے گُزر جائیگی۔

دو دِن اُسے ایک اِضطراب سا رہا۔ کالج کا ماحول جِس سے وہ کُچھ کُچھ مانوس سا ہوگیا تھا۔ یکا یک اجنبی سا لگنے لگا۔ جب اِسکے ساتھی گفتگو کرتے' ہنستے' لطیفوں پر قہقہہ لگاتے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ آوازیں بہت دُور سے آرہی ہیں اور اِنکا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کُچھ دن بعد جب سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اِطّلاع دی کہ چھٹّی کی درخواست آگئی ہے تو اُسے اپنی نوکری کی طرف سے اِطمینان ہُوا۔

پہلی تاریخ کو اِقبال نے آکر اُس سے کہا۔''چلو محمود بھائی کے پاس چلتے ہیں۔'' ہر مہینہ اُنکی تنخواہ میں ہی اُنکے گھر پہنچاتا ہوں۔ دفتر سے وہیں چلیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے گھر تنخواہ پہنچنے سے پہلے اُن کے گھر پہنچ جائے''۔ یکا یک اُسے احساس ہُوا کہ اُن سے ملنے کی خواہش اُس کے دِل میں کئی دِن سے پل رہی ہے۔

دروازہ اُنکے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ ایک ضعیف و ناتواں جِسم پلنگ پر پڑا ہُوا تھا جسکی آنکھوں میں زِندگی کی چمک ابھی باقی تھی۔ اُنہوں نے لیٹے لیٹے گرمجوشی سے ہاتھ مِلایا۔ اُس سے ہاتھ مِلاتے وقت ایک مدھم سی مُسکراہٹ اُنکے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اِقبال نے تعارف کرایا۔ آپ ہیں جوّاد اِبراہیم۔ آپ کی جگہ پر یہ کام کررہے ہیں۔

''آپ سے مِل کر مسّرت ہوئی''۔ اُنہوں نے بمُشکِل کہا۔ شائد اُنھیں گُفتگُو کرنے میں تکلیف ہورہی تھی۔ اِقبال نے چُپکے سے اُنکے ہاتھ پر تنخواہ کا لِفافہ رکھ دیا۔ اُنہوں نے اِشارے سے اپنے بھائی کو بُلا کر کہا۔''اپنی بھابی کو دیدینا۔ کہدینا ابھی سے اپنے آپ کو عادی کرلے۔ اگلے ماہ سے صِرف آدھی تنخواہ آئے گی''۔ ہُنوز اُنکے ہونٹوں پر دھیمی سی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سُنکر اُسکے چہرے پر ایک پرچھائی سی گُزر گئی۔ اگلے مہینہ اِقبال کِس ہمّت سے آدھی تنخواہ لاکر دیگا۔ دو بچّے پردہ کے پیچھے سے نمودار ہوئے۔ اِقبال سے دونوں کُچھ مانوس تھے۔ بچّی اِقبال کے اِشارے پر اُسکے پاس چلی آئی اور اُسکے جیب میں لگے ہوئے قلم سے کھیلنے لگی۔ لڑکا ایک خالی کرسی کی پُشت پکڑ کر جُھولنے لگا۔ اِس سے پہلے کہ کوئی منع کرتا وہ چاروں خانہ چِت گِرا ہوا تھا۔ دُوسرے ہی لمحہ وہ''کچھ نہیں ہُوا' کچھ نہیں ہُوا امجد بہادر بچّہ ہے'' کہتا ہُوا اور خِفّت مِٹانے کیلیئے مُسکراتا ہُوا اندر بھاگ گیا۔ وہ سوچنے لگا یہ جُملہ ماں یا باپ نے کہا ہوگا اُسے تسّلی دینے کیلیئے جب وہ پہلی بار گِرا تھا۔ اب بچّے نے خُود یہ جُملہ اپنا لیا ہے۔ اپنی ہمّت بڑھانے کیلیئے۔

شائد اُسکا دِل وہیں اٹکا ہُوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر واپس آگیا اور محمود بھائی سے پوچھنے لگا''پیّا پھر گِروں؟''۔

''حوصلہ ہے تو ضرُور گِرو بھائی'' اُنہوں نے جواب دیا۔

''آپ کا بچّہ کافی ہمّت والا ہے'' اِس نے پہلی بار گُفتگُو میں حِصّہ لِیا

''اب تو اِسے زِندگی میں یُونہی گِرنا اور گِر کر سنبھلنا ہے'' انہوں نے کہا'' ماحول بوجھل سا ہوتا جا رہا تھا۔''اچّھا اب ہم چلتے ہیں محمود بھائی'' اِقبال نے اُٹھتے ہوئے کہا۔''نہیں انکل چائے پی کر جانا''۔ بچے نے اِقبال کے جیب میں قلم رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں چائے پی کر ہی اُٹھے۔

''تمام لوگوں سے مِلنے کیلیئے جی بُہت چاہتا ہے لیکن نقاہت بُہت بڑھ گئی ہے''۔ محمود بھائی نے کہا۔''ویسے کوئی بھی اب مِلنے نہیں آتا ایک سپرنٹنڈنٹ صاحب کبھی کبھی آجاتے ہیں اور دوسرے تُم ہو''

چھوٹا بھائی باہر تک چھوڑنے کیلیئے آیا۔ ڈاکٹر بھی اب مایوس ہوگئے ہیں۔ کینسر سینہ سے گلے کی طرف پھیل رہا ہے۔ بہت جلد بات کرنے کی صلاحیت سے بھی بھائی محرُوم ہوجائینگے''۔ چھوٹے بھائی کا گلہ رُندھ گیا۔ رُخصت ہوتے وقت تینوں نے خاموشی سے ہاتھ مِلایا جیسے تینوں گُونگے ہوں۔

''جب مُصیبت آتی ہے تو ہر طرف سے آتی ہے۔ بیماری کیساتھ ساتھ محمود بھائی کی معاشی پریشانیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں اب آدھی تنخواہ والی چھُٹّھی چل رہی ہے پھر بغیر تنخواہ والی چھُٹّھی کا دور آئے گا۔ پھر ایک دِن نوکری ختم ہوجائیگی۔'' اِقبال چند فرلانگ چلنے کے بعد بولا اُسکا دل بار بار بھر آرہا تھا۔

''دوستوں نے محمود بھائی کو بہت جلد بُھلا دیا۔''

اُسکا بھی یہی خیال تھا کہ دوست اُن کا ذکر کرنے میں بُخل سے کام لیتے ہیں۔ یہاں اپنے اپنے رونے سے ہی کِسے فُرصت ہے کہ دُوسروں کی بات کیجائے۔

ایک دِن گیارہ بجے کے قریب دفتر میں اطلاع آئی کہ محمود بھائی کا انتقال ہوگیا ہے۔ پرنسپل صاحب نے ایک تعزیتی میٹنگ مُنعقد کی اور کالج برخواست کردیا۔ تدفین ظہر میں تھی۔

''آج چُھٹی موقع سے مِلی ہے۔ ایک بہت ضروری کام تھا وہ نِبٹا لُونگا ایک نے کالج سے نکلتے ہُوئے کہا۔ مُجھے بھی نیند بہت آرہی ہے۔ کام کرنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا اب جا کر خُوب سوجاؤنگا''

دُوسرے نے کہا۔

''اُٹھنا مت بُھولنا۔ ورنہ کل بھی ایک تعزیتی میٹنگ رکھنی پڑے گی''

''لیکن ابھی چُھٹّی مِلی کہاں ہے۔ تدفین میں بھی تو شِرکت کرنا ہے آدھا دِن تو بِیت ہی جائے گا''۔ کِسی نے یاد دلایا

''آدھے دن کی چُھٹّی کے عوض اِس کڑی دھوپ میں قبرستان جانے سے تو بہتر ہے کہ دفتر میں پنکھے کھول کر بیٹھے رہیں'' ایک نے کہا۔

''آدھا دِن کہاں۔ تدفین ختم ہونے تک تین تو بج ہی جائنگے'' ایک اکاؤنٹنٹ نے حِساب جوڑا۔

قبر ڈھانکنے سے پہلے محمود بھائی کی صورت دکھائی گئی اُنکے ہونٹوں پر وہ مدھم سی مسکرہٹ اب مُنجمِد ہوچُکی تھی۔ آج وہ گُونگے ہوچُکے تھے۔ لیکن اللہ کا ان پر یہ کرم رہا کہ جِیتے جی انھیں گُونگے پن کا عذاب نہیں سہنا پڑا۔ زبان سوجائے اور احساس جاگتا رہے تو زِندگی عذاب ہوجاتی ہے۔ یہ عذاب اُنکے مِلنے والوں کو بھی اُٹھانا پڑتا۔ اُنکے سامنے بات کرتے ہوئے بھی جُرم کا احساس ہوتا۔

باقی دِن بے کیف سا گُزرا۔ شام کو جب بیٹھے بیٹھے طبیعت بے زار ہونے لگی تو جوّاد اِقبال کے پاس چلا گیا۔ دونوں جا کر کوثر کیفے میں بیٹھ گئے۔

''اب تو تُمہاری ترّقی مُستقل ہوگئی ہے'' اُسنے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اِقبال سے کہا۔ اِقبال کچھ بھی نہ سُن سکا کیوں کہ اُسی لمحہ جیوک باکس سے ایک اذّیت ناک قہقہہ گُونجا۔ بے ہنگم شور سے اپنی آواز بچاتے ہوئے اُسنے اپنی بات دہرائی۔ اِقبال معنی خیز انداز میں مُسکرایا''۔

اور تُمہاری نوکری بھی سمجھو پکّی ہوگئی۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اپنی نوکری کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے وہ خالی پیالی سے کھیلنے لگا۔ وہ اِقبال کو اُسکی ترّقی کی مُبارکباد دینا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کے ذہن میں ایک گِرہ سی پڑگئی تھی جو کُھل نہیں رہی تھی۔ اِقبال دُھوئیں کے مرغولے بنانے میں مصروف تھا۔ میز پر پڑی ہوئی ڈبیہ سے سگریٹ نکالتے ہوئے اُسنے سوچا۔ چلو آج ڈھنگ کی نوکری تو مِل گئی۔ زِندگی کا ایک سنگِ مِیل تو طے ہُوا۔ ایک مرحلہ تو طے ہُوا۔

یکا یک اُسے مُجرِمانہ احساس ہوا کہ جِسے وہ سنگِ مِیل سمجھ رہا ہے وہ سنگِ مِیل نہیں بلکہ ایک قبر ہے۔ ایک کچّی تازہ قبر۔

☆

- بقیہ -

دستک

توڑلانے کو تیار رہتیں۔ وہ البم میں کھوئی ہوئی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے فون اٹھایا روحی کی آواز ان کو دور سے آتی محسوس ہوئی۔ آنٹی کیسی ہیں آپ۔ اس نے پوچھا۔ میں ٹھیک ہوں وہ خشک لہجے میں بولیں۔ آنٹی مجھے وسیم کا پتہ چلا تھا۔ میں عمرے پر جا رہی ہوں اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی مگر وہ چلا گیا۔ اگر میں نے آپ کا دل دکھایا ہے تو آپ مجھے معاف کردیں وہ بولی۔ زینت نے سردمہری سے کہا۔ ہاں معاف کیا اور فون رکھ دیا مگر اچانک ان کے دل پر دستک ہوئی۔ کیا انہوں نے بھی ان بچوں سے معافی مانگی وہ ہمیشہ روحی کو موردالزام ٹھہراتی رہیں۔ وسیم کو مظلوم سمجھتی رہیں مگر کہیں نہ کہیں تو وہ بھی خطا کار ہیں۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ دستک کی صدا سنتی رہیں اور آنسوان کی آنکھوں سے بہتے رہے۔

حنوط

ارم رحمٰن
(لاہور)

بارش کے بعد مٹی سے نکلتی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے بہت پسند تھی، سردیوں کے موسم میں دھند نتھنوں میں گھس کر سکون دیتی تھی اسی طرح میں مختلف اگربتیوں، لوبان، عنبر عود وغیرہ، دیگر مختلف عطر کی خوشبویات کی مداح تھی۔

دراصل میں قوت شامہ سے بہت کام لیتی تھی، راستے بھی خوشبو یا کسی خاص بو کے حوالے سے مجھے یاد رہتے تھے اکثر دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد میں اپنے گھر سے کچھ فاصلے پہ سوہے بازار جسے صرافہ بازار کہا جاتا تھا یعنی جہاں سونے کا کاروبار ہوتا ہو وہاں لمبے راستے سے جانا پسند کرتی تھی، دلچسپ بات وہاں اب سونے کے علاوہ اور سارے کاروبار ہونے لگے تھے اس راستے پہ آپ کو آپ کی ضرورت کی ساری اشیاء مل جائیں گی سونے کے علاوہ آپ کی بائیک خراب ہوگئی تو اتریئے ورکشاپ میں دیجیے ساتھ ہی گوشت کی دکان ہے اس کے دوسری طرف پھلوں کی ریڑھی آگے چل کر سبزی کی دکان، چند قدم ہی چلیں گے تو قلفے اور فالودے والا آپ کو اور آپ فالودے کو للچائی نظروں سے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر سکتے ہیں جب تک آپ کی بائیک ٹھیک ہوگی تو آپ سڑک کے نکڑ پہ بیٹھا پان کھا کر نقلی کوکا کولا جس کو پینے کے بعد نکلنے والی ڈکار یہ ثابت کردے گی کہ آپ لکڑ ہضم پتھر ہضم انسان ہیں، اگر چاہیں تو ضرورت کے مطابق پھل سبزی گوشت بھی خرید سکتے ہیں اور اگر آپ کی بائیک خراب نہ بھی ہوئی ہو تو سیلون اور بیوٹی پارلر کی دکانوں پہ لگی تصویریں آپ کی نیت ضرور خراب کرسکتی ہیں، ابھی سڑک ختم نہیں ہوگی کہ مچھلی والا ایک خاص انداز میں مچھلی رکھے بیٹھا دکھائی دے گا، ایک بڑے سے کڑاہے میں تازہ تازہ تلتی گرما گرم مچھلی اس جگہ کی خوشبو یا مہک خاص ہی ہوگی، اگر تلنے کا وقت نہ ہوا ہو تو کچی مچھلی کی بو سے بچتے بچاتے آپ پہنچیں گے سیدھا حاذق طبیب کے شفاخانے پر، جہاں ہر طرح کی رنگ برنگی بوتلیں جن میں کوئی رنگین مائع یا جڑی بوٹیوں کا سفوف رکھا ہوگا ایک بار دکان کے پاس کھڑے ہوجائیں تو آپ کو کھانسی کے شربت اور جوشاندے کی ملی جلی خوشبو محسوس ہوگی مزید چلیے تو دانتوں کا کلینک ملے گا جس کے ایک پورشن کے باہر گائنا کالوجسٹ کا بڑا سا بورڈ بھی واضح نظر آئے گا کچھ دور چلیں گے تو آپ کو جوتا گھانٹنے والا فٹ پاتھ پر مختصر سا ساز وسامان رکھے کپڑا بچھائے نظر آئے گا۔ آگے چکی ملے گی آٹے کی اور اس کے پاس گزرتے گرم گرم آٹے کی بھینی بھینی خوشبو ضرور بھلی لگے گی جیسے بسکٹ فیکٹری سے بھی خوشبو آتی ہے، ساتھ سٹیشنری کی دکان بلکل ساتھ کپڑے پیکو اور لیسوں کی دکان آپ کی منتظر ہوگی، اب آئے گی مسحور کن خوشبو کہ کچھ لمحے آپ کا دل چاہے گا وہاں رک کر خوشبو کو محسوس کیا جائے ایک گھنے برگد کے درخت کے نیچے مستطیل چبوترے پہ سبز چادر ڈال کر جس پر چاروں قل لکھے ہوتے ہیں بچھی نظر آئے گی یہ چبوترہ محض سیمنٹ بجری کا ڈھیر نہیں بلکہ کسی اللہ والے کی قبر ہے، کیونکہ ایک مجاور مسلسل وہاں بیٹھا رہتا ہے اور کمزور عقائد کے اکا دکا لوگ وہاں سلام کرتے دکھائی دیں گے۔

بے چارے کچھ سادہ لوح تو ہاتھ اٹھائے دعا مانگتے بھی نظر آئیں گے، چاروں طرف دیئے جن کا تیل بہہ کر اس چادر کو داغدار کر چکا ہوگا، مگر اگر بتیوں کی خوشبو سب پہ حاوی ہوگی، ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد جو شاید کسی نے اپنا پلاٹ دے کر اللہ کے نام پر تعمیر کروائی ہو کیونکہ دنیا میں شاید مسجد بنوانا پانچ وقت نماز پڑھنے سے آسان ہوتا ہے اور نظر بھی آتا ہے مسجد شاید بہت کم بندوں کے لیے تھی کیونکہ اکثر وہاں سے گزرنے پر مشکل پڑتی ہے، جنازہ مسجد میں رکھا جاتا ہے اور لواحقین باہر کھڑے زندہ لوگوں کو گھور رہے ہوتے ہیں شاذ و نادر ہی کوئی روتا ہوگا اب یہ اس جگہ کا کمال ہے یا چھوٹی مسجد کی برکت کہ کسی کو رونا آتا ہی نہیں تھا کچھ لوگ تو دوسروں کو روک رہے ہوتے ہیں بس کھانا تیار ہے جنازے کے بعد کھا کر چلیں گے تایا ابا کے بیٹے کا نکاح ہے، نجانے دیر ہوجائے، کھانا وقت پہ ملے یا نہیں غرضیکہ مجھے یہ سب منظر دیکھتے دیکھتے چلتے رہنا اچھا لگتا ہے عجیب سی رونق، گہما گہمی میت سامنے مگر ہم دنیادار لوگ موت سے بے خبر اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں، میں سیدھا چلتے چلتے کبھی کبھی کسی گلی میں مڑ جاتی تھی، کبھی کسی، کیونکہ جتنی بھی گلیاں ہیں وہ سب آگے جا کر "مین جی ٹی روڈ" پر ہی نکلتی ہیں اس لیے راستہ بھولنے کا احتمال نہیں رہتا میں ہمیشہ مختلف گلیوں سے گزرنا پسند کرتی تھی کیونکہ نئے لوگ نئے جگہیں۔

ان راستوں سے آتیں انواع و اقسام کی خوشبویات مجھے اچھی لگا کرتی تھیں، اگر وہاں جانے کا ناغہ ذرا طویل ہوجائے، تو کسی نئی دکان کا اضافہ نظر آئے گا یا کسی دکان کی غیر موجودگی، تبدیلیاں بہت جلدی جلدی وقوع پذیر ہوتی ہیں، ویسے بھی اکثر کبھی کوئی گلی بن رہی ہوتی ہے کبھی پانی یا گیس کے پائپ کے لیے ساری پکی گلی کچی مٹی کا ڈھیر بنادی جاتی، کبھی کوئی گھر بنتا تو سڑک یا گلی میں کافی دور تک اینٹوں اور ریت کا ڈھیر نظر آتا، لوگ حسب ضرورت کچھ خود اٹھا لیتے بس کچھ نہ کچھ ادھیڑ بن لگی رہتی اور متبادل راستہ اختیار کرنا پڑتا، بالفرض اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تب بھی گلی کا راستہ بند کرنے کے لیے تمبو لگا دیئے جاتے، اب سمجھ نہیں آتا، کہ لال رنگ کے ریشمی پوشش والی کرسیوں پر مہندی، نکاح کے مہمان بیٹھے ہیں یا میت کے سوگوار۔

تمبو تو ہوتے ہی رنگ برنگے ہیں اسی طرح مختلف راستوں سے گزرتے گزرتے سب گلیاں یاد ہوگئی تھیں، پھر اتفاق ایسا ہوا کہ الیکشن کے دنوں سے کچھ پہلے یونین کونسلر نے اپنی کارکردگی دکھانے کے چکر میں اس علاقے کی ساری گلیوں میں سیوریج سسٹم کی درستگی کی خاطر اکھاڑ پچھاڑ شروع کروادی کہیں سے مٹی کھدی ملتی کبھی کہیں سے سڑک ٹوٹی، سارے رستے کا بیڑہ غرق ہوگیا۔

''چہارسُو''

دو تین ماہ بس جانا نہیں ہوا پھر جب یکا یک ہوک اٹھی تو میں والدین کے قیلولہ کرنے کے اوقات میں دوپہر کو نکل پڑی گرم دوپہروں میں دھوپ میں پھرنا گرچہ والدین کو ناپسند تھا مگر مجھے آرام سے سب کاموں سے فراغت پا کر نکلنا اچھا لگتا تھا ایک ڈیڑھ گھنٹے کی سلجھی سمٹی سیر یا آوارہ گردی کا عجیب ہی لطف ہوتا تھا اب جو اتنے عرصے بعد سب سے لمبے راستے سے نکل کر آخری گلی میں مڑی تو وہاں دور سے ہی گلی کے نکڑ پر ایک بڑی سی دکان نظر آئی باہر شیشہ ہی شیشہ تھا آگے بڑھتی گئی تو پھر اس دکان کے پاس پہنچ کر عجیب سی پراسراریت محسوس ہونے لگی شیشے میں اپنا آپ دکھائی دیتا تھا اندر کیا ہے بلکل اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن چونکہ باہر بورڈ لگا تھا جس پر موٹا موٹا جیسے خشک لکڑی کا رنگ ہوتا ہے سنہرا مٹیالہ سا اس رنگ میں لکھا تھا:

''قدیم نوادرات'' میں حیران رہ گئی کہ یہ دکان یہاں کیسے؟، اتنے بدذوق اور نسبتا" غریب علاقے میں اتنی قیمتی اشیاء کی دکان، کیسے چلے گی؟

ابھی میں باہر سے ہی تجزیئے اور مشاہدے میں لگی تھی اور اس گلی کو پہچاننے کی کوشش کرنے میں لگی تھی کہ کسی اور گلی میں تو نہیں آ پہنچی تو خیال آیا کہ گلی تو پرانی لگ رہی ہے دیکھی بھالی مگر یہ دکان پہلے نہیں تھی کب بنی لگتی پرانی ہے لیکن نظر اب پڑی، حیرت ہے اتنی بڑی دکان کیسے نظروں سے محو ہوئی پھر غور کیا تو محسوس ہوا کہ دکان نئی نہیں تھی بلکہ میرا وہاں سے گزرنا پہلی بار ہوا تھا خیر میں نے کچھ دیر باہر سے دیکھ پرکھ کی پھر یکا یک خیال آیا کہ اندر جا کر دیکھوں تو ''کونسے نوادرات ہیں جو اس گلی کے ٹٹ پونجیے خرید سکتے ہیں'' لیکن تھوڑا گھبرا رہی تھی کیونکہ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اندر کوئی ہے بھی یا نہیں اگر بہت سارے لوگ ہیں تو خاموشی کیوں ہے، کوئی پکڑ ہی نہ لے ، پھر خیال آیا کہ دکان کھلی ہے بس دھکا دے کر داخل ہی ہونا ہے ڈرنا کیسا پھر دل چونکا کہ کوئی اندر سے بند کر دے فضول ترین وہم اور خدشات سر پہ سوار تھے اور ایسے موقع پر فوراً ''کر ڈالو'' کا لائحہ عمل میری خصلت میں تھا، جس چیز سے ڈر لگے وسوسے آئیں میں کر ڈالتی تھی پھر اللہ کا نام لے کر بھاری شیشے کا دروازہ اندر کی طرف دھکیلا صرف دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ ہوئی، یکدم بلکل خاموشی، دروازہ چھوڑتے ہی لپک کے بند ہو گیا، اندر ساری فضا ہی عجیب بوجھل سی تھی چاروں طرف کیا تھا بعد میں دیکھتی پہلے میں نے لمبا سانس لیکر اس دکان میں پھیلی خوشبو سونگھی وہ آج خاص قسم کا سفوف جس سے جانوروں کے جسم حنوط کیے جاتے ہیں، اس کی تھی اور اس بو کی شدت کو کم کرنے کے لیے لیونڈر کا فریشن ائیر چھڑکا ہوا تھا دوسری بار ناک میں شاید کسی کونے میں سلگتے لوبان کی مہک بھی محسوس ہوئی دو تین لمبے سانسوں کے بعد مجھے فضا مانوس لگنے لگی۔

میں نے چاروں طرف دیکھا اور سوچا کیا دکان میں صرف میں ہی ہوں اور کوئی بھی نہیں، کوئی مالک ملازم کوئی تو ہوگا، کمرے میں روشنی مدھم تھی جو اس دکان کو پراسرار یا پرسکون بنانے میں کافی مددگار ثابت ہو رہی تھی میں نے دائیں بائیں دیکھا کوئی بندہ نظر نہیں آیا چاروں طرف کارنس بنی ہوئی تھی چوڑی سی، جیسے پرانے گھروں میں ہوتی تھیں جب ڈریسنگ ٹیبل یا دیواروں میں فلسڈ الماری کا دور نہیں تھا، میں نے ایک کونے سے ہر نادر نمونے کو دیکھنا شروع کیا، ہر نادر نمونہ چھوٹا تھا، زیادہ بڑا نہیں، کارنس پہ ان کے آگے ان کی قیمت بھی لکھی ہوئی تھی, چھوٹے چھوٹے ہاتھی دانت کے زیور، لڑیاں۔ مالائیں، کانوں کے چھوٹے ٹاپس، مختلف نگوں کے زیورات، پتھروں کے بنے مختلف ڈیکوریشن پیس، لکڑی یا پیتل، برونس کی صندوقچیاں ایک ہتھیلی پہ رکھی جائے۔

ان میں جگہ بس اتنی تھی کہ کوئی زیور رکھا جا سکتا تھا یا کوئی یاداشت کا کاغذ، عجیب رنگ کی شکل سے پرانی لگ رہی تھیں، مختلف رنگوں کے نگ یا پتھر بڑے پیارے تھے ان پہ قیمت کے ساتھ ان کا نام بھی لکھا تھا، زمرد، عقیق، فیروزہ، یاقوت، مرجان وغیرہ سب کی قیمتیں ایسی تھیں کہ ایک شوقین بندہ کچھ روپیہ خرچ کر کے حاصل کر سکتا تھا اس دائیں طرف کارنس پہ سب ایسا ہی سامان تھا اب میری نظر سامنے دیوار کی طرف گئی تو حنوط شدہ ہرن کی کھوپڑی، طوطا، کوا، اور کوئی باز یا شکرا سب ایسے مجھے دیکھ رہے تھے کہ ابھی زندہ ہو جائیں گے وہاں چڑیا، فاختہ بلبل بھی کھال میں بھس بھری موجود تھیں جیسے زندہ ہی کھڑی ہوں، چیتا شیر وغیرہ کہاں سے آتا، ایک عدد بلی جس کی آنکھیں بلکل سبز تھیں۔

اس طرح چمک رہی تھیں کہ وہ زندہ ہے اسے مذاق میں بچوں کی کھیل کی طرح "سٹیچو" کہہ کر ساکت کر دیا ہو، یا پھر ان آنکھوں کی چمک خیرہ کر دینے والے زمرد کی طرح تھی، وہ بلی بڑی خونخوار نظر آ رہی تھی، اگر زیادہ دیر نگاہیں جمارکھیں تو کہیں حملہ نہ کر دے، کچھ لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر پرندوں پر نظر پڑی ان کو بھی غور سے دیکھا لیکن بلی کی آنکھیں بہت پرکشش تھیں بار بار میری توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہی تھیں، ان سب جانداروں کو بہت صفائی اور سلیقے سے مسالہ لگا کر حنوط کیا گیا تھا اس لیے دکان کی فضا میں اسی مسالے کی خوشبو رچی بسی تھی، ان کی قیمت اس علاقے کے بندوں کو وارا نہیں کھاتی تھی، اسلیے شاید یہ ماضی کے جاندار اور حالیہ شاندار حنوط شدگان ویسے کے ویسے ہی تھے۔

ان پر ہلکی ہلکی سی گرد بھی محسوس ہوئی پھر آخری کارنس جو ہر طرح کے خنجر چاقو چھریوں کو نمایاں کر رہی تھی چمچے کانٹے کچھ پرانے برتن جو نہ جانے کس زمانے کے ہوں گے ترتیب سے لگے ہوئے تھے برتن چھوٹے تھے اور دام مناسب، پھر بھی غریبوں کے لیے نہیں، آخر میں خوبصورت گھڑیاں، دیوار پہ لگی ہوئی بھی تھیں چھوٹی چھوٹی سٹینڈ پہ کھڑی ہونے والی، وال کلاک کافی بڑا دیوار پہ آویزاں تھا جس کا وہ لمبا سا پینڈولم بہت دلفریب لگ رہا تھا ان تمام اشیاء میں بوسیدگی اور انجان سی اداسی تھی عجیب رنگ اترے پھیکے یا شاید جھوٹے، میں نے ایک چھوٹا سا گھڑیال اٹھایا بہت دلکش تھا سنہرے اور کالے رنگ کا، دل آ گیا تھا اس پہ، اس کی قیمت دیکھی تو وہ قابل قبول تھی اس وقت تو نہیں لیکن بعد ازاں کچھ

رقم پس انداز کر کے وہ خریدی جا سکتی تھی، منقش اور چھوٹا چمکتا ہوا پیارا سا گھڑیال نے واقعی میرا دل موہ لیا تھا۔

میں دیکھنے میں مگن تھی کہ ایک دم میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اس کارنس کے بلکل آخری کونے میں دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں کمال یہ تھا کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہو سکا تھا، نجانے کب سے میرا تعاقب کر رہی ہوں گی۔

ایک صاحب سٹول پہ براجمان تھے بیٹھنے سے پتہ لگ رہا تھا کہ وہ پستہ قد اور کمزور جسم کے مالک ہیں ان کے سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح مکمل سفید تھے اور آنکھوں کی چمک ان کے زندہ ہونے کی واحد نشانی تھی اگر وہ آنکھیں بند کر لیتے تو پلکوں کی سفید جھالر ان صاحب کو بھی ایک حنوط شدہ مجسمہ یا بت ہی ثابت کر دیتیں، ان کے چہرے پہ چند ثانیے نظر ٹکا کر غور کیا تو ان کی شخصیت بے ضرر محسوس ہوئی میں نے گردن کو ہلکی سے جنبش دی جیسے سلام کرتے ہیں انھوں نے نظریں جھکا لیں چونکہ میں اس دکان کا جائزہ لے چکی تھی لہذا اسلام کے بعد وہاں ٹھہری نہیں جب باہر نکلی تو کھلی ہوا میں کھل کر سانس لیا لیکن باہر نکلتے ہی لُو کے تھپیڑوں نے یہ بھی احساس دلایا کہ دکان ائیر کنڈیشنڈ تھی، شاید گرمی سے ان جانوروں کا بھوسا پگھل سکتا تھا یا سڑ اند آنے کا ڈر ہو گا، جو بھی تھا باہر نکل کر واضح فرق محسوس ہوا قید سے آزادی کا، اس دکان کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اندر جا کر لگا تھا کہ وقت تھم گیا ہے اس کی رفتار عام وقت گزرنے کی رفتار سے کم تھی، رکے رکے منظر، تھما تھما وقت، انہی سوچوں میں غلطیاں دبیچاں گھر کی طرف چلتی گئی، طبعیت سیراب ہو گئی تھی جیسے کہیں روح کے اندر تک وہ تمام نوادرات تہہ در تہہ سلیقے سے جم گئے ہوں پھر کافی دنوں تک باہر نکلنا نہیں ہوا کیونکہ اس بار بارشیں بہت شدت سے ہوئیں، گلیوں میں پانی کھڑا ہونا معمول تھا بارش رک بھی جاتی تو کئی دن تک بارش کا پانی گلیوں اور راستوں میں کھڑا رہتا جولائی اگست میں نجانے کتنے سالوں کے ریکارڈ ٹوٹے بادل جم کر برسا، جیسے اب کسی کو شکایت کا موقع نہیں دینا۔

عاشق کی آگ بجھانی تھی اور پیاسے کی پیاس، غرضیکہ جل تھل ایک ہو گیا ستمبر کے مہینے کا آغاز ہوئے ہفتہ دس دن ہو گئے تھے، اور بارش ہوئے بھی، پھر ہوک اٹھی کہ جون میں گئی تھی کہ موسم بہت خوشگوار ہو گیا ہے اب اس دکان میں جا کر اور لطف آئے گا، اس چھوٹے سے گھڑیال کو خریدنے کے پیسے بھی جمع ہو گئے تھے بس نکل پڑی ایک دوپہر کو، کیچڑ سے بچتے ہوئے کبھی کچے کبھی پکے راستے پہ چلتی جہاں گلیاں نیچی تھیں وہاں کچھ حساس یا سمجھدار لوگوں نے اینٹیں رکھ دی تھیں کہ ان اینٹوں پہ چل کر وہ راستہ طے کر لیا جائے، 20 منٹ کا راستہ 35 منٹ میں طے ہوا، وہی گلی وہی کونے کی دکان میں نے ذہن میں دہرایا، گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ دور بہت سا ملبہ پڑا ہے۔

کئی مزدور کام میں لگے ہیں، پہلے میں سمجھی کہ غلط گلی میں گھس گئی ہوں پھر دائیں بائیں بورڈ پڑھے تو پہچان گئی گلی وہی ہے کیونکہ میں خوشبو اور بورڈ یاد رکھتی تھی ورنہ راستے یاد رکھنے کی صلاحیت مجھ میں نہیں تھی، آگے اور آگے پھر وہی ٹکڑ ''یہ کیا ہوا'' پھیلی ہوئی ڈھیروں اینٹیں دیکھ کر میرے منہ سے اچانک نکلا، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا مزدور ملبہ ہٹاتے رہے پھر میں نے اونچی آواز میں ان سے دریافت کیا کہ ''یہاں ایک دکان تھی نا، پرانی چیزوں کی!'' جواب ملا ''جی باجی! یہ اسی دکان کا ملبہ ہے''

یہ سن کر میرا منہ کھلا رہ گیا ''کیسے''، ''کب''

سات دن پہلے جو آخری زوردار بارش ہوئی تھی وہ زمین بوس ہو گئی، ''کیا'' اب میرے دماغ نے کام کرنا شروع کیا، ''کیسے گری وہ تو پکی تھی''، باجی دکان کے نیچے تہہ خانہ تھا، اس نے بنیادیں کمزور کر دی تھیں جب زور کی بارش ہوئی دکان بیٹھ گئی، یہ سن کر میرا دل بھی بیٹھ گیا، کیا سب ختم ہو گیا زمین میں دب گیا وہ گھڑیال بھی، میں عجیب سے انداز میں بڑبڑائی۔

''سنو'' اس دکان کے مالک کہاں ہیں، ''باجی وہ بھی تہہ میں دب کے مر گئے، تین دن لگے ملبے تلے مالک کو نکالنے میں لیکن ایک بات ہے جب لاش نکالی گئی تو بلکل صحیح سلامت تھی جیسے بزرگوار آنکھیں بند کیے لیٹے ہوں''

ان کی لاش بھی حنوط ہو گئی تھی شاید۔

اجازت

نرگس دت نے سردار خشونت سنگھ سے کہا:

''سنا ور میں آپ کا بنگلہ ہے اور میرا بیٹا سنجے وہاں لارنس سکول میں پڑھتا ہے، مجھے اس سے ملنے جانا ہے، کیا میں آپ کے بنگلے میں رہ سکتی ہوں؟''

خشونت سنگھ نے کہا:

''ایک شرط پر!''

نرگس نے گھبرا کر پوچھا:

''وہ کیا؟''

خشونت سنگھ بولے:

''مجھے سب کو یہ بتانے کی اجازت ہو گی کہ آپ میرے بستر پر سوئی تھیں!''

نرگس دت قہقہہ لگا کر، ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی:

''مجھے اپنا ہاتھ دو!''

اور ہم دوست بن گئے!

پاگل

ارشد منیم
(مالیرکوٹلہ)

وہ کون تھے۔۔۔؟ کہاں سے آئے تھے۔۔۔؟ کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔اُن کا تو اصلی نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔سب لوگ اُنھیں پاگل کہہ کر بلاتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کچھ ایسے مذہبی مسائل لوگوں کو بتاتے تھے جنہیں آج تک شہر کی کسی بھی مسجد کے امام نے لوگوں کو بتانا شاید مناسب نہیں سمجھا تھا۔جیسے قربانی بقرعید کے چوتھے دن بھی کر سکتے ہیں یا پھر اگر آدمی اپنی بیوی کو ایک ہی ٹائم میں تین بار طلاق بول دے تو طلاق نہیں ہوتی۔ایسے ہی اور کئی مذہبی مسائل وہ لوگوں کو بتاتے رہتے،جنہیں سن کر لوگ اُن کا مذاق بناتے اور اُن کو پاگل کہہ کر بلاتے۔دھیرے دھیرے لوگ اُن سے کترانے لگے تھے۔مگر مجھے اُن کے پاس بیٹھنا اُن سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔

دیکھنے میں وہ ساٹھ سال کے قریب لگتے تھے۔اُن کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔وہ پانچ وقت کے نمازی تھے۔اُن سے میری پہلی ملاقات بھی مسجد میں ہی ہوئی تھی۔وہ جمعہ کا دن تھا۔امام صاحب نے جمعہ کی نماز سے پہلے کوئی مذہبی مسئلہ بیان کیا،نماز سے فارغ ہو کر انھوں نے امام صاحب سے اس مسئلے کی وضاحت جاننا چاہی تو وہ کوئی معقول جواب نہ دے پائے۔انھوں نے کہا کہ آپ نے غلط مسئلہ بیان کیا ہے آگے سے اس طرح کے مذہبی مسائل بیان کرنے پرہیز کریں۔یہ سن کر امام صاحب ان سے الجھ پڑے تھے۔وہاں موجود لوگوں نے دونوں کے درمیان آ کر بیچ بچاؤ کرتے ہوئے دونوں کو الگ کیا اور انھیں گھر بھیجنے کے بعد لوگ امام صاحب کو یہ سمجھاتے ہوئے پرسکون کرنے لگے کہ اس سے کیا الجھنا یہ تو پاگل ہے۔

لیکن مجھے اُن کی دلیلوں میں دم لگا تھا ان سے ملنے کی میرے اندر چاہت بڑھ گئی تھی۔کسی نے مجھے ان کے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اکیلے ہی رہتے ہیں۔ان کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں نا رشتہ دار،نا ہی بیوی بچے۔گزر بسر کے لئے تھوڑی بہت محنت مزدوری کر لیتے ہیں۔ان کے بارے میں یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میں اگلے روز ان کے گھر کی طرف چل دیا جو میرے گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ان کے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھوڑی دیر بعد انھوں نے دروازہ کھولا اور میری طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹے۔۔۔؟! بولو۔۔۔کیا کام ہے۔۔۔؟!''

میں نے اُنھیں سلام کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔؟''

یہ سن کر وہ کچھ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگے اور پھر دروازے سے تھوڑا ہٹ کر بولے۔

''ضرور۔۔۔! آؤ اندر آؤ۔۔۔''

گھر کے اندر داخل ہو کر میں نے پورے گھر پر نگاہ ڈالی۔کافی کھلا صحن تھا۔سامنے کی طرف ایک کمرہ اس کے ساتھ ہی چھوٹا سا کچن ایک طرف غسل خانہ بنا ہوا تھا۔صحن میں ایک کرسی اور پرانی طرز کا لکڑی کا ایک پلنگ پڑا تھا۔ایک طرف باغیچہ بھی تھا جس میں مختلف اقسام کے کافی پودے لگائے ہوئے تھے۔صحن کے ساتھ ساتھ کمرے کی چھت پر بھی بہت سے گملے پڑے تھے۔جن سبھی میں لگے پودے ان کے باغبانی میں دلچسپی ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔میں ان کے گھر کا جائزہ لے ہی رہا تھا۔انھوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''ہاں بیٹے۔۔۔؟ بولو کیا کام ہے۔۔۔؟! کیسے آنا ہوا۔۔۔؟''

میں نے نرمی سے کہا۔

''انکل میرا نام عارف ہے۔کام تو کوئی خاص نہیں تھا،بس آپ سے ملنے کو دل چاہا اس لئے چلا آیا۔''

یہ سنتے ہی اُن کی حیرانی حد تک بڑھ گئی۔وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''مجھ سے ملنے کو دل چاہا۔۔۔؟! بھئی لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں اور تمھارا دل۔۔۔؟ کمال ہے۔۔۔!!''

میں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''انکل کل جمعہ کی نماز کے بعد جب آپ امام صاحب سے کسی مذہبی مسئلہ کو لے کر بحث کر رہے تھے تو آپ کی باتیں سن کر میرے اندر آپ سے ملنے کی چاہت بڑھ گئی تھی۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''اچھا تو تم نے کل وہ سب باتیں سنی تھیں۔؟ آؤ....کمرے میں آؤ۔۔۔!''

کہتے ہوئے وہ مجھے کمرے میں لے گئے۔کمرے میں ایک بیڈ لگا تھا۔ایک طرف دیوار کے ساتھ دو کرسیاں پڑیں تھیں۔کرسیوں کے سامنے میز پر بہت سی کتابیں اور اخبارات سلیقے سے رکھے تھے۔ایک طرف ٹیبل پر پرانی ٹی وی آن تھا۔ٹی وی کے بغل میں لوہے کی بڑی الماری کھڑی تھی۔کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولے۔

''بیٹھو۔''

میں خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔اُنھوں نے ٹی وی بند کیا، الماری کھول کر ایک کتاب نکالی اور میرے قریب آ گئے۔کتاب کا ایک صفحہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولے۔

''لو یہ پڑھ کر تم خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا کل میں غلط تھا یا صحیح..؟!''

اُن سے کتاب پکڑ کر میں پڑھنے لگا۔وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔میں نے وہ صفحہ پورا پڑھنے کے بعد اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چہارسُو''

''کل آپ بالکل صحیح کہہ رہے تھے، امام صاحب غلط تھے۔''

وہ افسردہ ہوکر بولے۔

''پتہ نہیں کیوں آج کل کے امام صاحبان اسلام کی اصلی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے پرہیز کرنے لگے ہیں۔''

اُس دن میں کافی دیر اُن کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ مجھے اُن کی باتیں اچھی لگی تھیں۔ اگلے روز شام کے وقت میں پھر اُن کے گھر پہنچ گیا اور کافی دیر بیٹھا اُن سے باتیں کرتا رہا۔ میرا یہ معمول ہی بن گیا، میں شام کو اُن کے پاس چلا جاتا تھا۔ مجھے اُن سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا۔ اُن کا نام وہاب الدین تھا اور وہ کئی سال پہلے بہار سے یہاں آکر بس گئے تھے۔ مجھے یہ معلومات اُن سے ہی میسّر ہوئی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں کئی بار مجھ سے کہتے۔

''عارف۔۔۔ تم ہر روز میرے پاس آتے ہو، اس سے مجھے کوئی دقت نہیں۔ مگر اس بات کو لے کر کہیں تمھارے دوست تمھیں مذاق کا موضوع نہ بنالیں۔''

میں اپنے کندھے اُچکاتے ہوئے اُنھیں کہتا۔

''مجھے کسی کی پراوہ نہیں، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ آپ اچھے اور نیک انسان ہو۔ مجھے آپ کے پاس آکر بہت اچھا لگتا ہے اور ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔''

ویسے اُن کی بات بھی سچ تھی کیونکہ جب سے میرے دوستوں کو یہ پتہ چلا تھا کہ میں ان کے پاس آتا جاتا ہوں تو وہ اکثر یہ کہتے ہوئے میرا مذاق بناتے کہ اس سے بچ کر رہا کرو اب اس کی دوستی ایک پاگل سے ہو گئی ہے۔ میرے گھر والوں نے بھی مجھے ایک دو بار ان کے پاس جانے سے منع کیا تھا، مگر میں کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر ان کے پاس چلا جاتا۔ اب تو جیسے انھیں بھی میرا انتظار رہنے لگا تھا۔ اگر کبھی کسی ضروری کام کی وجہ سے اُن کے پاس نہ جا پاتا تو اگلے روز جب ان کے پاس پہنچتا تو مجھے دیکھتے ہی پوچھتے۔

''عارف۔۔۔ کیا بات کل نہیں آئے۔۔۔؟ طبیعت تو ٹھیک تھی تمھاری۔۔۔؟!''

ان کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب آگئے تھے۔ ہم دونوں کی عمر میں فرق ہونے کے باوجود ہماری جان پہچان اب دوستی میں بدل گئی تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق ان سے ہنسی مذاق بھی کر لیتا تھا۔ اب تو میں بغیر دروازہ کھٹکھٹائے ان کے گھر میں داخل ہو جاتا تھا۔

میں نے ایک بات نوٹ کی تھی، اُنھیں صرف دو چیزوں کا شوق تھا۔ ایک مطالعہ دوسرا پودوں کا، گھر میں موجود پودوں کی اچھے سے دیکھ بھال کرتے۔ اُنھیں وقت پر پانی لگاتے۔ کئی بار تو مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لگا لیتے۔ میں نے کئی بار اُنھیں پودوں کے پاس بیٹھ کر مسکراتے اُن سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ایک بار میں نے اُنھیں ایک پودے کے پاس بیٹھے روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ اکثر کہتے۔

''عارف.... میرا کوئی بھی نہیں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ بس یہ پودے ہی میری فیملی ہیں۔ مجھے یہ اپنی جان سے بھی پیارے ہیں۔ جب ان میں سے کسی پودے کی ٹہنی یا پتا سوکھ جاتا ہے تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ دن میں محنت مزدوری کے لئے نکلتا ہوں تو یہ تڑپ رہتی ہے کہ میں جلدی سے جلدی ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ مجھے پتہ ہے یہ بول نہیں سکتے پھر بھی میں ان سے باتیں کرتا ہوں، ان کے ساتھ مسکراتا ہوں اور جب کبھی بہت اُداس ہوتا ہوں تو ان کے پاس بیٹھ کر رو لیتا ہوں اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔

اُس روز میں پیدل ہی ان کے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ پچھلے پانچ دنوں سے میں ان کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ ملک کے ایک صوبہ میں سیلاب نے بہت تباہی مچادی تھی۔ وہاں سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ ہزاروں لوگ مر گئے تھے اور لاکھوں لوگ بے گھر۔۔۔ زندہ بچے لوگوں کے پاس کچھ نہیں بچا تھا نہ کھانے پینے کو راشن نہ پہننے کو کپڑے۔ ٹی وی اور اخبارات میں وہاں کے مناظر دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ہم نے یہاں اپنے شہر میں ایک فلاحی تنظیم بنائی ہوئی ہے۔ سیلاب زدہ علاقے کے حالات دیکھ کر ہم نے تنظیم کے ممبران کی میٹنگ کر کے یہ فیصلہ لیا کہ وہاں امداد بھیجی جائے۔ ہم شہر میں لوگوں سے فنڈ اکھٹا کرنے لگے۔ پورے شہر میں ہم نے چار جگہ کاؤنٹر لگائے تھے۔ سبھی ممبران الگ الگ گروپ میں بازاروں اور محلوں کی طرف نکلتے، لوگوں سے مل رہے تعاون جس میں روپے، کپڑے اور راشن کا سامان ہوتا لاکر کاؤنٹر پر جمع کرتے رہتے۔ اسی وجہ سے ان کے پاس جانے کے لئے وقت نہیں ملا تھا۔ ایک بار ہم ان کے گھر کی طرف بھی گئے تھے۔ جب ان کے گھر کے سامنے پہنچے تو گروپ کے ایک ممبر نے کہا تھا۔

''یہاں سے کیا ملنا ہے۔ کنڈی مت کھٹکھٹانا، کہیں باہر نکل کر کوئی اور ہی مسئلہ بیان نہ کر دیں یہ مفتی صاحب۔۔۔! کہیں یہ ہی نہ کہہ دیں کہ اس طرح چندہ اکٹھا کرنا حرام ہے۔۔۔!''

یہ سن کر سبھی ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیئے تھے۔ حالانکہ مجھے اس کی بات سن کر بہت غصّہ آیا تھا مگر نا جانے کیوں میں چپ رہا۔

اُس دن کچھ فرصت ملتے ہی میں ان سے ملنے کے لئے چل دیا تھا۔ ان کے گھر کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ وہاں ایک بھی پودا نہیں تھا۔ نا باغیچے میں نا ہی گملوں میں۔! میں حیرانی کے سمندر میں ڈوبا پودوں سے خالی جگہ کو دیکھتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اندر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے سلام کیا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''وعلیکم سلام بیٹا۔۔۔ کیا بات ہے عارف۔۔۔؟! کئی دنوں کے بعد آئے۔؟ خیریت تو ہے۔۔۔؟!''

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''جی۔۔۔ بس وہ سیلاب زدہ لوگوں کے لئے فنڈ اکھٹا کرنے میں لگا رہا۔''

وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے گہری سانس لے کر بولے۔

''ہاں یار۔۔۔میں نے ٹی وی پر بھی دیکھا ہے اور اخبار میں بھی پڑھا ہے، بہت نقصان ہوا ہے وہاں پر۔۔۔!''

کہتے ہوئے وہ الماری کی طرف بڑھ گئے۔میں پریشان کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ ان سے پودوں کے بارے میں کیسے پوچھوں۔؟! اتنے میں انھوں نے ایک پیکٹ لاکر میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور بولے۔

''یہ اچھی بات ہے تم لوگ اُن لوگوں کے لئے یہ سب کر رہے ہو۔اُن لوگوں کے حالات دیکھ کر مجھے بھی بہت دکھ ہوا ہے۔میں بھی اُن لوگوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔مگر مجبور تھا۔میرے پاس روپے نہیں تھے۔لیکن ٹی وی پر دیکھے وہاں کے حالات۔۔۔لوگوں کے مایوس اور بے بس چہرے مجھے تڑپا رہے تھے۔بہت سوچ سمجھ کر میں نے آج صبح اُن لوگوں کے لئے اپنے سبھی پودے بیچ دیئے، یہ بیس ہزار روپے ہیں۔تم لوگ جو فنڈ اکھٹا کر رہے ہو، اُس میں میرا یہ حصّہ ڈال دینا۔''

میں نے ایک نگاہ پیکٹ پر ڈالنے کے بعد اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔مجھے اُن کی آنکھوں میں ایک درد محسوس ہوا جو شاید اپنی فیملی کھو دینے کا درد تھا، مگر اُن کا چہرہ پرسکون تھا۔وہ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔میرے ہونٹوں پر الفاظ جیسے جم گئے تھے۔

''میں ابھی آتا ہوں۔''

کہتے ہوئے میں اُن کے گھر سے نکل کر سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا۔وہاں بیٹھے لڑکے کی طرف میں نے پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لو بیس ہزار روپے۔۔۔رسید کاٹ دو۔۔۔''

وہ رسید بک کھولتے ہوئے بولا۔

''واہ عارف۔۔۔!تم اکیلے نے ہی اتنے روپے اکھٹے کئے۔!بڑی محنت کر رہے ہو، اللہ تمھیں اس کا اُجر ضرور دے گا۔یہ کتنے لوگوں نے فنڈ دیا ہے؟ ایک ایک کر کے رقم کے ساتھ نام بولو تا کہ میں رسیدیں کاٹ دوں۔''

وہاں بیٹھے دوسرے ممبران بھی ہمارے قریب آ گئے تھے۔میں نے کہا۔

''کئی نے نہیں صرف ایک آدمی نے ہی اتنے روپے فنڈ میں دیئے ہیں۔''

وہ حیرانی سے اپنی آنکھیں گھما کر بولا۔

''صرف ایک۔۔۔؟! نام بولو اُس نیک انسان کا، میں رسید کاٹ دیتا ہوں۔پھر سبھی ممبران اُن کے گھر جا کر شکریہ ادا کر کے اُنھیں رسید پکڑا کر آئیں گے۔بولو۔۔۔کون ہیں وہ۔؟!''

میں کاؤنٹر پر تھوڑا جھکا اور اُس کے قریب ہو کر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''وہی جس کو تم لوگ پاگل کہتے ہو۔!''

بقیہ ۔۔۔ اُستاد لال سنگھ

میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔گاڑی میں بیٹھتے ہی بختاور نے اپنا سوٹ کیس لال سنگھ کو اپنی سیٹ کے نیچے چھپانے کے لئے کہا۔اُسکا کہنا تھا کہ اس سوٹ کیس میں روپے ہیں اسلئے انہیں چھپا کر رکھنا ضروری ہے۔لال سنگھ نے اُسکا سوٹ کیس اپنی سیٹ کے نیچے چھپا لیا۔

جب گاڑی لکھن پور ٹول ناکے پر پہنچی تو بختاور یہ کہہ کر گاڑی سے اُترا کہ وہ چائے پی کے آئے گا۔جب لال سنگھ کی گاڑی کی تلاشی لی گئی تو اُنہیں سیٹ کے نیچے بختاور کا سوٹ کیس ملا۔ایک سپاہی نے لال سنگھ کو سوٹ کیس کھولنے کو کہا تو اُس نے سپاہی سے کہا۔

''اسمیں کوئی چرس گانجا نہیں بلکہ تھوڑے بہت پیسے ہیں۔'' وہ علیا سے مخاطب ہو کے بولا۔

''ارے بلاؤ اس بندے کو''

علیا نے اُسے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔وہ کہیں نہیں ملا۔سپاہی نے غصہ ہو کر اس سوٹ کیس کا تالا توڑ دیا۔جونہی سوٹ کیس کا ڈھکن کھلا تو لال سنگھ تیورا کے نیچے گرا۔سوٹ کیس میں واقعی چرس بھرا ہوا تھا۔سپاہیوں نے اُسے اور اُسکے کلینر کو پکڑ لیا۔اُن دونوں کو تھانے پہنچایا گیا۔بختاور تو کہیں اُڑن چھو ہو گیا اور لال سنگھ کو چرس لیجانے کے الزام میں حوالات میں بند کر دیا گیا۔علیا سرکاری گواہ بن گیا اور اسطرح لال سنگھ اس کیس میں بری طرح پھنس گیا۔

لال سنگھ کو چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔جب پرکاش کور اُس سے ملنے جیل پہنچ گئی تو لال سنگھ آہنی سلاخوں سے سر جوڑ کر رونے لگا۔وہ پشیمانی سے سر جھکا کر بولا۔

''مرد کنا بھی سونا ہو فطرت سے وڈا ایے مروت اور ہرجائی ہوندا ہے۔وہ سور کی طرح ہمیشہ اتھے اُتھے منہ مار دا رہندا ہے۔اُس دی نظر وچ ہمیشہ کھوٹ ہوندی ہے۔جتھے کوئی حسین کڑی ویکھی اُتھے نظر پھسلی۔میری بھی نظر پھسلی، نیت بھی ڈول گئی اور میں اتھے جیل وچ پہنچ گیا۔مجھے کدی معاف نہیں کرنا پرکاش۔مجھے کدی معاف نہیں کرنا۔جب ایک مرد شواس کی سیما توڑ دے تو اُسے اسی طرح کی زلت اور رسوائی ملدی ہے''

یہ کہہ کر وہ ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

'' جمالِ یار کی تفہیم ''

نوید سروش

(میرپور خاص)

ہوئی زیست اپنی بسر در گذر میں
گرا ہی نہیں میں کسی کی نظر میں

یہ بہتر تھا اس حلقۂ دوستاں سے
چلے جاتے ہم دشمنوں کے نگر میں

مقابل ہوں دشمن کے سب سے بچھڑ کر
نہیں خود میں مدت سے اپنے اثر میں

وہ جس کا بہت میڈیا پر ہے چرچا
کوئی بات ایسی نہیں ہے خبر میں

سفر عشق کا انتہائی کٹھن ہے
شجر بھی نہیں کوئی راہِ سفر میں

جو بستی میں دیوانوں کی خامشی ہے
خرد مند ہے کوئی اِن کی نظر میں

جو برسوں رہا سب کی نظروں کا مرکز
سروش اب وہ منظر کہاں اس نگر میں

○

طلعت منیر

(انٹاریو، کینیڈا)

سچ مسلسل معنی کی ترمیم میں جاتا رہا
اور تجسس مقصدِ تعمیم میں جاتا رہا

زندگی کو معنی دینے کے لیے جو وقت تھا
وہ جمالِ یار کی تفہیم میں جاتا رہا

ایک مدت تک یہ دانائی، شعور، احساس سب
عشق کی ایک مضطرب تجسیم میں جاتا رہا

وقت پہلا جبر تھا اس عالمِ امکان کا
سلسلہ تخلیق کا تنظیم میں جاتا رہا

زندگی ہے مختصر سا ایک مبہم دائرہ
موت کی جو گم شدہ اقلیم میں جاتا رہا

زُعمِ مختاری تھا جو ہم خود پرستوں کو منیر
اک اصولِ جبر کی تعظیم میں جاتا رہا

○

کومل جوئیہ

(ملتان)

ٹوٹتا دل سنبھالنے کے لئے
شکریہ! ہجر ٹالنے کے لئے

اس نے آسان کردیا رستہ
ایک مشکل میں ڈالنے کیلئے

آخرش زخم کھا لئے ہم نے
آئینوں کو اجالنے کے لئے

چاک پر دھر دیا گیا اک روز
مجھ کو کوزے میں ڈھالنے کے لئے

دل سے رخصت کیا محبت کو
اک غلط فہمی پالنے کے لئے

ہاتھ برباد کر لئے تم نے
مجھ پہ کیچڑ اچھالنے کے لئے

○

سبیلہ انعام صدیقی
(کراچی)

دل ہے تُمھارے ہجر میں ناشاد اِس طَرح
دیکھا گیا نہ کوئی بھی برباد اِس طَرح

گزری ہوں راہِ ہجر سے یوں مُسکرا کے مَیں
آشفتہ کوئی دیکھا ہے دلشاد اِس طَرح؟

دنیا کے سامنے بَنی تصویر، دے کے کچھ
کرتا ہے آج آدمی امداد اِس طَرح

نظروں کی رَہ سے دل میں جو دلبر اُتر گیا
پڑتی ہے ایک خواب کی بنیاد اِس طَرح

بِن پیار تشنگی ہُوئی دل کی زمین پر
بِن آب ریگ زار ہُو آباد اِس طَرح

مَیں خود کو دیکھ لیتی ہوں شعروں میں، نظم میں
کہتی ہوں اپنے دل کی مَیں رُوداد اِس طَرح

خود پر کبھی تو نقد و نظر ہونی چاہیئے
کرتا ہے کیا کبھی کوئی نقّاد اِس طَرح؟

خود سونپ کر سبیلہ اُسے اپنے سارے خواب
رکھتے ہیں دل کو فکر سے آزاد اِس طَرح

○

تصور اقبال
(اٹک)

ننگے پاؤں چلیے گر تو پھر یہ چھالے ہوتے ہیں
بے شک رستے گاؤں والے دیکھے بھالے ہوتے ہیں

جس گھر میں یہ ویرانی بھی ڈیرا پکا کرتی ہے
اُس گھر کی دیواروں پر تو ہر سُو جالے ہوتے ہیں

جن کی اپنی سوچ نہیں ہے جو جذبات سے عاری ہوں
ایسے ہر اک فرد کے لب پر دو دو تالے ہوتے ہیں

ان کا کام یہی ہوتا ہے عادت سے مجبور ہیں وہ
ڈس لیتے ہیں سانپ وہی جو ہم نے پالے ہوتے ہیں

گھر سے رخصت کب ہوتے ہیں آسانی سے آخرکار
کوشش کر کے مشکل لمحے وہ جو ٹالے ہوتے ہیں

وہ پیسے تو ہر قیمت پر خرچ ہوئے ہیں اچھی جا
اپنے ہاتھ سے لنگر میں جو ہم نے ڈالے ہوتے ہیں

وہ جو سینہ تان کے اپنا ملتے ہیں اقبال میاں
ان کے دل تو ہر صورت میں کالے کالے ہوتے ہیں

○

اکمل شاکر
(کوئٹہ)

میرے کاندھے پہ اپنا سر رکھیے
خود کو دنیا سے بے خبر رکھیے

ہے سفر یہ تو کوہساروں کا
بوجھ کاندھے پر مختصر رکھیے

جو بھی دیکھے وہ دیکھتا ہی رہے
اپنا انداز پر اثر رکھیے

ان کے ماتھے پہ چاند اترے گا
دل کو قابو میں، رات بھر رکھیے

حوصلے پست ہو گئے شاکر
ہر قدم اب کے سوچ کر رکھیے

○

عمران راقم
(کلکتہ)

بلا کی دھوپ میں تالاب سوکھ جاتے ہیں
پرندے پیاس نہ جانے کہاں بجھاتے ہیں

شعور آیا نہیں جن کو بات کرنیکا
زباں پہ وہ بھی مری کنڈیاں لگاتے ہیں

زمانہ جن کو بہت پارسا سمجھتا ہے
وہ لوگ دن میں نہیں رات میں نہاتے ہیں

نہ جانے کس لئے بادل گرجنے لگتا ہے
وہ اپنی زلف کو چھت پر جہاں سکھاتے ہیں

تم تو اپنے صوفے سے اک پل ذرا نہیں ہلتے
مکاں کے ہم کئی زینوں کو پھاند جاتے ہیں

امیر شہر کی دولت خموش رہتی ہے
فقیر شہر کیس کے ہی کھنکھناتے ہیں

ہزاروں عیب حقیقت میں جن کے اندر ہیں
زمانے بھر کو وہی آئینہ دکھاتے ہیں

بہت حسین ہیں دنیا کی تتلیاں لیکن
تمہارے حسن کے جلوے نظر کو بھاتے

وہاں تو ہوتی ہے ہر گام قاتلوں کو سزا
ہمارے ملک کے قاتل مزے اڑاتے ہیں

بدن میں درد نہیں پھیلتا ہوا کی طرح
ترے ستم پہ مرے داغ مسکراتے ہیں

وہ اپنے غصے کا اظہار ہی نہیں کرتے
سیاسی لوگ سنبھل کر چھری چلاتے ہیں

اسے بھی زیست کا اک سانحہ کہیں راقم
کہ آج اندھے ہمیں راستہ دکھاتے ہیں

○

سعید سادھو
(جرمنی)

نیند خوابوں سے بھری، رات بھری تاروں سے
کتنا مصروف ہوں میں دور پڑا یاروں سے

قرب کے پہلے پڑاؤ پہ میں لرزیدہ تھا
دفعتاً ہونٹ مرے مس ہوئے رخساروں سے

اس کی آنکھوں پہ تھی کجلے کی وہ باریک سی دھار
اور لڑنا تھا نہتا مجھے تلواروں سے

ہاتھ چھونے کی تمنا کا کیا تھا اظہار
گال جل اٹھے تھے اک ہونٹ کے انگاروں سے

ایک چادر میں لپیٹے ہوئے سب مال و متاع
حسن اُتر آیا تھا ملنے مجھے کہساروں سے

○

طارق تاسی
(لاہور)

قفس سے جو نکلا تو ڈر میں رہے گا
پرندہ ہمیشہ سفر میں رہے گا

بتا تو نے یہ بات سوچی بھی کیوں ہے
کہ شاعر سرِ شام گھر میں رہے گا

کسی کو ملے گی ہر اک گام منزل
کوئی عمر بھر رہگزر میں رہے گا

صنم مسکرا کر جسے تو نے دیکھا
وہ تا دیر تیرے اثر میں رہے گا

ہمیں ناخدا نے بتایا نہیں تھا
سفینہ ہمارا بھنور میں رہے گا

خدا جانے کب بادشاہ کاٹ ڈالے
یہی خوف دست _ ہنر میں رہے گا

اگر اس پہ چشمِ کرم ہو گئی، تو
زمانے کی تاسی نظر میں رہے گا

○

امتیاز علی گوہر
(گلاسگو)

ایسی کیا بات ہے جوانی میں — مثلِ دریا ہوں میں روانی میں
تو نے کیسے بھلا دیا مجھ کو — میں بھی کردار تھا کہانی میں
اس نے بس اک نظر ہی دیکھا تھا — آگ لگنے لگی تھی پانی میں
تو نے لفظوں میں لکھ دیا کیا کیا — بات سمجھوں میں کس معانی میں
اس لئے پھول پاس رکھتا ہوں — تیری خوشبو ہے اس نشانی میں
کس طرح سب سے پوچھتا گوہر — کس کو کیا دکھ ہے زندگانی میں

○

مادھو کوشک
(چندی گڑھ)

ہواؤں پر ہواؤں کے ہوائی پل بناتی ہے — یہ کیسی نسل ہے جو خود ہی اپنا گھر جلاتی ہے
جہاں کی میڑھ بارش کے بہانے ٹوٹ جاتی ہے — ندی اس گاؤں کی تقدیر پر آنسو بہاتی ہے
ذہن میں گھر، سمندر، جھیل، جھرنے ہی نہیں ہوتے — مجھے جلتے ہوئے ہر پیڑ کی بھی یاد آتی ہے
وہی ہوتا ہے سب سے پیشتر کیوں بے زباں یاروں — گگن کے چھور تک جس شخص کی آواز جاتی ہے
بہت ہی پیار سے جو پیار کو باندھے نہیں رکھتا — یہ وہ گنگا ہے جو رات میں ہی سوکھ جاتی ہے

○

ذکی طارق بارہ بنکوی
(بھارت)

ہے کتنی پُر اوصاف یہ تخلیقِ خدا بھی — سورج میں تمازت بھی ہے ظلمت بھی ضیا بھی
اے جانِ غزل کچھ تجھے اس کا ہے پتہ بھی — کے تو ہی تو خوشبو بھی ہے گل بھی ہے صبا بھی
کچھ اور ہمارے ہو محبت کے سوا بھی — اس بات پہ کیا تم نے کبھی غور کیا بھی
وہ کیوں نہیں آیا میں کہوں کیسے کہ جبکہ — آتے ہوئے چلنے کے لئے اس کو کہا بھی
سب کچھ جو ہوا خاک تو کیا اس میں تعجب — جب پاس ہی پاس آگ بھی ہے اور ہوا بھی
بن جاؤ اگر تم مرے اے جانِ تمنا — پھر آئے مجھے زندگی جینے میں مزہ بھی
مجھ کو دلِ بیتاب کا قصہ نہ سنا کے — جو حال ترا ہے، ہے وہی حال مرا بھی
اس درجہ مروت کہ بنا وہ بھی قصیدہ — ہونٹوں پہ ہمارے جو کبھی آیا گلہ بھی
افسوس مری سمت اٹھائی نہ نظر تک — وہ مجھ کو اچانک جو سرِ راہ ملا بھی
کتنی بھی وفائیں کرو یا جان لٹاؤ — ملتا ہے مقدر سے محبت کا صلہ بھی
اس پر "ذکی" بنیادِ یقیں کیسے میں رکھوں — وہ ایک دیا جو کہ جلا بھی ہے بجھا بھی

○

حماد حیدر
(فیصل آباد)

ہم غریبوں کا چولہا جلانا تو ہے
اس خدا نے خدا کہلوانا تو ہے

چاہے امید کا اک دیا ہی سہی
جانتا ہوں کہ اس نے جلانا تو ہے

لاکھ چاہے بہانے بناتا رہوں
جانے والے نے آخر میں جانا تو ہے

چاہے جتنی مسافت بھی ہم کاٹ لیں
گھر کو واپس کسی شام آنا تو ہے

بعد مرنے کے گھر اک نیا مل گیا
کم سے کم مستقل اب ٹھکانہ تو ہے

○

جاوید جدون
(ایبٹ آباد)

ہم مارنے مرنے کو ہیں تیار، خبردار
ہم کو نہ دکھانا کبھی تلوار، خبردار

ہیں قابلِ تعظیم و عقیدت، ہے بجا پر
کعبہ نہیں بن سکتے یہ دربار، خبردار

لے جا تو سبھی کچھ تجھے دیتا ہوں اجازت
گر تیری نظر میں ہے یہ دستار، خبردار

کب تک رہیں تھامے ہوئے ہم صبر کا دامن
اچھی نہیں ہر بات پہ تکرار، خبردار

ہم عشق کے ماروں کا تمسخر نہ اڑاؤ
ہم یوں بھی ہوئے بیٹھے ہیں بیزار، خبردار

اے میرے عدو ساتھ جو بیٹھا ہے ترے اب
کل تک تھا وہی میرا طرف دار، خبردار

ان تخت نشینوں کی نہ باتوں میں تم آنا
جھوٹے ہیں فریبی ہیں یہ مکار، خبردار

بیٹوں کو بٹھا کر یہ کہا باپ نے آخر
اس گھر میں بھی اٹھ جائے نہ دیوار، خبردار

سرحد کے تھا اِس پار لکھا "ہر کدے آؤ"
تحریر تھا اُس پار، ''خبردار خبردار''

○

علی شاہد دلکش
(کوچ بہار)

سر زمیں بیتِ مقدس کے مکینوں کو سلام
اے فلسطین ترے شہر کی گلیوں کو سلام

پاک دامن جو بے رحمی سے کچل ڈالے گئے
اَن گنے پھول کی معصوم سی کلیوں کو سلام

غاصبوں سے لڑے جی جاں سے نڈر ہو کے سبھی
جاں ہتھیلی پہ لیے سارے شہیدوں کو سلام

ہیں ڈٹے ظلم کے طوفان میں جتنے بھی شجر
عزم آہن لیے مضبوط درختوں کو سلام

ظلم کے خون سے بچے ہوئے جتنے بھی شہید
ان فلسطین کے معصوم فرشتوں کو سلام

بیت اقدس کے لیے دست دعا ہے جو اُٹھا
قبلہ اول سے محبت بھرے جذبوں کو سلام

تیز اور تند ہوا میں بھی ہے روشن جو چراغ
ظلم کی آندھی میں ان جلتے چراغوں کو سلام

خوں محبانِ فلسطین کا ناحق جو بہا
ناز بردار شہیدوں کے عقیدوں کو سلام

اولیں قبلہ پہ سر سب کا جو شاہد ہے جھکا
مسجدِ اقصیٰ کی اطہر گلی کوچوں کو سلام

○

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میاں)

قسط ۱۶

''ہاں میاں صاحبزادے۔۔۔کس سوچ میں گم ہو۔۔۔منہ سے کچھ بولوگے۔۔۔یا۔۔۔یونہی۔۔۔سوفتے میں بیٹھے رہوگے۔۔۔؟''

''کہاں تک سنوگے۔۔۔کہاں تک سناؤں۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔ابھی سے گھبرا گئے۔۔۔وہ شعر نہیں سنا کیا۔۔۔؟''

''کونسا۔۔۔؟''

''وہ اللہ بھلا کرے تمہارا۔۔۔بھلا سا شعر ہے۔۔۔کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔ہاں:

آغازِ عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا''

''یہاں جان پہ بنی ہے۔۔۔اور۔۔۔آپ کو شعر سوجھ رہے ہیں۔۔۔!''

''برخوردار۔۔۔برخوردار۔۔۔حوصلے سے کام لو۔۔۔ابھی سے ہمت ہار بیٹھے۔۔۔تو۔۔۔پہاڑ جیسی زندگی۔۔۔کس طرح کاٹو گے۔۔۔اقبال نے۔۔۔آپ جیسے تھڑدلوں کے لیے ہی تو کہا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں''

''نابابا نا۔۔۔میں بھرپایا۔۔۔عشق وشق۔۔۔اور۔۔۔امتحان ومتحان سے۔۔۔میں تو اُس دن کو، کوستا ہوں۔۔۔جب ابّا میاں نے مجھے پاکستان بھیجا تھا۔۔۔!''

''کیوں میاں۔۔۔پاکستان نے۔۔۔تمہاری بھینس مار لی ہے۔۔۔یا۔۔۔تمہارا کفّا کھول لیا ہے۔۔۔پاکستان پہ اتنے چیں بہ چیں کیوں ہو۔۔۔؟''

''اجی چھوڑو۔۔۔میرا تو جی کھٹّا ہو گیا تمہارے پاکستان سے۔۔۔!''

''کوئی وجہ تو ہوگی۔۔۔جی کھٹّا ہونے کی۔۔۔!''

''ایک ہو تو بتاؤں۔۔۔!''

''ایک۔۔۔ایک۔۔۔کرکے۔۔۔ساری بتلا دو۔۔۔!''

''میاں۔۔۔وہ ہے نا۔۔۔!''

''کون۔۔۔؟''

''ہماری پھپھو۔۔۔اور کون۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔کیا ہوا تمہاری پھپھو کو۔۔۔؟''

''میاں سارا فضیتا۔۔۔اُنہیں کا تو ہے۔۔۔!''

''کیسا فضیتا۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔وہ محاورہ نہیں سنا تم نے۔۔۔!''

''کون سا۔۔۔؟''

''ٹٹرا رولوں۔۔۔بھیجا کھاؤں۔۔۔!''

''آگے بتاؤ۔۔۔آگے۔۔۔تبھی جواب دوں گا۔۔۔!''

''بڑی ملمع ساز عورت ہے۔۔۔!''

''وہ کس طرح۔۔۔؟''

''وہ کہتے ہیں نا۔۔۔ہاتھی کے دانت۔۔۔کھانے کے اور۔۔۔دکھانے کے اور۔۔۔ہو بہو یہی پالیسی ہے۔۔۔اُن کی بھی۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔؟''

''پہلی پہلی بار جب میں لاہور آیا۔۔۔تو۔۔۔اس طرح واری صدقے جا رہی تھی۔۔۔جیسے کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''جب تک۔۔۔ابّا میاں کا ہاتھ کھُلا رہا۔۔۔تب تک للّو چپّو ہوتی رہی۔۔۔جیسے ہی ابّا میاں نے ہاتھ کھینچا۔۔۔ویسے ہی۔۔۔پھپھو نے۔۔۔اس طرح آنکھیں پھیر لیں۔۔۔جیسے کعبے سے کافر پھر جاتا ہے۔۔۔!''

''بھئی پیسے لیے۔۔۔تو۔۔۔کیا بُرا کیا۔۔۔تمہاری ناز برداری پر ہی خرچ کیے ہوں گے نا۔۔۔!''

''قسم اللہ پاک کی۔۔۔مجال ہے۔۔۔جو اک دھیلا بھی میرے اوپر خرچ کیا ہو۔۔۔!''

''اماں جاؤ۔۔۔جاؤ۔۔۔کسی اور کو۔۔۔اُلّو بناؤ۔۔۔!''

''قرآن پاک کی قسم۔۔۔جھوٹ بولوں۔۔۔تو۔۔۔کھڑا کھڑا مر جاؤں۔۔۔!''

''یہ طوطا مینا کی کہانی کسی اور کو سنانا۔۔۔ہمیں سب پتہ ہے جو گُل کھلا کے تم آئے ہو۔۔۔!''

''اُس کی بھی سن لو۔۔۔مان نہ مان۔۔۔میں تیرا مہمان والا معاملہ تھا (رازدرانہ انداز میں شفیق صاحب کے کان کے نزدیک منہ لاکر) تالی ایک ہاتھ سے بج رہی تھی۔۔۔قسم اللہ پاک کی۔۔۔!''

''یہ طوطا مینا کی کہانی کسی اور کو سنانا۔۔۔میرے منہ میں۔۔۔پورے بتیس دانت ہیں۔۔۔روٹی کو چوچی نہیں کہتا۔۔۔جو تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آجاؤں۔۔۔!''

''دیکھو۔۔۔دیکھو۔۔۔ایک منٹ۔۔۔میری طرف دیکھونا۔۔۔!''

''بکو۔۔۔!''

''ایک بار۔۔۔ٹھنڈے دل سے میری بات سن لو۔۔۔پھر۔۔۔جو جی میں آئے فیصلہ کر لینا۔۔۔!''

''سن تو رہا ہوں۔۔۔اور۔۔۔کیسے سنوں۔۔۔!''

''یہ بھی پھپھو کی چال لگتی ہے۔۔۔!''

''کیسی چال۔۔۔!''

''مجھے اڑنگے میں پھنسانے کی۔۔۔اور کیسی۔۔۔!''

''صاف صاف بات کرو۔۔۔ صاف صاف۔۔۔ پہیلیاں مت بجھاؤ۔۔۔!''

''میں مانتا ہوں۔۔۔ جوان لونڈے۔۔۔ اور ۔۔۔ لونڈیاں۔۔۔ نزدیک ہوں۔۔۔تو۔۔۔دیکھا بھالی۔۔۔تاکا جھانکی۔۔۔ہنسی مذاق۔۔۔لپٹا چپٹی۔۔۔حتی کہ۔۔۔ چومّا چاٹی۔۔۔اکثر ہو جاتی ہے۔۔۔مگر۔۔۔ یہ کہیں نہیں ہوتا۔۔۔''(رک کر سانس لیتے ہوئے)

''کیا نہیں ہوتا۔۔۔ہیں۔۔۔ کیا نہیں ہوتا۔۔۔ ذرا ہم بھی تو سنیں۔۔۔''

''یہ ہی۔۔۔کہ۔۔۔کہ۔۔۔!''

''بول بھی چکو۔۔۔!''

''یہ ہی۔۔۔کہ۔۔۔ماں باپ کی موجودگی میں۔۔۔جوان بیٹی۔۔۔ دوسرے کمرے میں بے خبر سوتے لڑکے کے لحاف میں گھُس کر کہے۔۔۔!'' (منہ کھولتے کھولتے رک جاتا ہے)

''ابے یار۔۔۔تم میں۔۔۔ یہ ہی خرابی ہے۔۔۔بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہو۔۔۔!''

''لحاف میں گھس کر کہے۔۔۔کہ۔۔۔تم کیسے مرد ہو۔۔۔جوان لڑکی کو دیکھ کر۔۔۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔۔۔تمہاری جگہ میں ہوتی۔۔۔تو۔۔۔ کچّا چبا جاتی۔۔۔!''

''توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ اللہ توبہ (گالوں پر دو ہتڑ مارتے ہوئے) قیامت کی نشانی ہے۔۔۔قیامت کی۔۔۔!''

''آپ ہی بتاؤ۔۔۔ایسی صورت میں۔۔۔ مجھے گناہ گار ٹھہرانا۔۔۔ قاضی کو بلا کر۔۔۔زبردستی۔۔۔لونڈیا کو میرے سر منڈھنا۔۔۔کہاں کا انصاف ہے۔۔۔؟''

''نا۔۔۔ نا۔۔۔ برخوردار۔۔۔ نا۔۔۔ گناہگار۔۔۔ تو ۔۔۔ تم ہو۔۔۔سو فیصد ہو۔۔۔!''

''مگر۔۔۔!''

اگر۔۔۔مگر کی۔۔۔گنجائش ہی کہاں چھوڑی ہے تم نے۔۔۔!''

''یہ تو زیادتی کر رہے ہو ماموں۔۔۔سراسر زیادتی۔۔۔!''

''دیکھو میاں برخوردار۔۔۔ سیانے کہتے ہیں۔۔۔ روپے پیسے سے غریب ہونا۔۔۔ بری بات نہیں۔۔۔صحت کمزور ہو۔۔۔تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔البتہ اگر آپ کے اخلاق۔۔۔و۔۔۔کردار سے۔۔۔کسی کو تکلیف پہنچتی ہے۔۔۔تو۔۔۔اس سے بڑی برائی۔۔۔اور۔۔۔اس سے بڑا گناہ۔۔۔ ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ سو میری مانو۔۔۔ تو۔۔۔ ابھی بیٹی۔۔۔ باپ کے گھر ہے۔۔۔اللہ کا نام لے کر۔۔۔غلطی کا ازالہ کر ڈالو۔۔۔اور۔۔۔اس شعر کی تفسیر بن کے دکھا دو:

عشق میں معرکے بلا کے رہے
آخرش ہم شکست کھا کے رہے
یہ الگ بات ہے کہ ہارے ہم
حشر اک بار تو اُٹھا کے رہے

☆

''ہاں میاں شہزادے۔۔۔کیسے مزاج ہیں۔۔۔سناؤ۔۔۔رات کیسی رہی۔۔۔مچھروں نے تو نہیں ستایا۔۔۔؟''

''اجی۔۔۔مچھر تو تب ستائیں گے نا۔۔۔جب سوچیں پیچھا چھوڑیں گی۔۔۔!''

''ہیں۔۔۔سوچیں۔۔۔اور۔۔۔اس عمر میں۔۔۔اللہ کا نام لو۔۔۔ اللہ کا۔۔۔!''

''اجی۔۔۔اللہ کے آسرے پر ہی تو جی رہے ہیں۔۔۔ ورنہ۔۔۔ اپنوں نے۔۔۔مارنے میں۔۔۔تو۔۔۔کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔!''

''اپنوں نے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔اپنوں نے۔۔۔!''

''ذرا میں بھی تو سنوں۔۔۔کن اپنوں نے۔۔۔میرے بچے کو۔۔۔ ستایا ہے۔۔۔؟''

''وہ ہیں نا۔۔۔آپ کی صفیہ آپا۔۔۔اور۔۔۔کون۔۔۔؟''

''یہ بھی خوب رہی۔۔۔ میری صفیہ آپا۔۔۔ چلو چھوڑو۔۔۔ کیا کیا۔۔۔میری صفیہ آپا نے۔۔۔؟''(لفظوں کو چباتے ہوئے)

''اجی۔۔۔اُنہوں نے۔۔۔تو۔۔۔وہ کچھ کر ڈالا۔۔۔ جو دشمن بھی نہیں کرتے۔۔۔!''

''اب منہ سے کچھ پھُٹو گے بھی۔۔۔یا۔۔۔لفظوں کی جگالی کرتے رہو گے۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔ آپ کی صفیہ آپا نے۔۔۔ پولیس میں رپٹ کر دی میرے خلاف۔۔۔پولیس میں۔۔۔!''

''میری صفیہ آپا نے۔۔۔تمہارے خلاف۔۔۔پولیس میں رپٹ لکھوا

دی۔۔۔عجیب بات ہے۔۔۔رقیبوں کا۔۔۔رپٹ لکھوانا تو سنا تھا۔۔۔مگر۔۔۔ اپنوں کا۔۔۔پہلی بار سن رہا ہوں۔۔۔!''

''یہ پاکستان ہے۔۔۔یہاں۔۔۔اپنا پرایا نہیں۔۔۔ٹھن ٹھن گوپال دیکھا جاتا ہے۔۔۔ٹھن ٹھن گوپال۔۔۔!''(ہاتھ کے اشارے سے پیسہ اچھالتے ہوئے)

''ایسا کیا جرم کر دیا تھا تم نے۔۔۔جو۔۔۔صفیہ آپا کو تمہارے خلاف رپٹ لکھانا پڑی۔۔۔!''

''میاں جرم۔۔۔تو۔۔۔ابّا میاں نے کیا تھا۔۔۔بھگت میں رہا ہوں۔۔۔!''

''ابّا میاں نے کیا تھا۔۔۔ایسا کیا جرم کر دیا تمہارے ابّا میاں نے۔۔۔جو تمہارے خلاف رپٹ لکھانا پڑی۔۔۔؟''

''یہ چھوٹا جرم ہے۔۔۔جو۔۔۔مجھے پاکستان بھیج دیا۔۔۔!''

''بھئی جس طرف کا کان پکڑنا ہے اُسی ہاتھ سے پکڑو۔۔۔یہ جو تم ہاتھ گھما کر کان پکڑتے ہو نا۔۔۔اس کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی۔۔۔!''

''میاں۔۔۔سیدھی بات یہ ہے کہ۔۔۔پہلے پہل تو ہمارے سر پر ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔۔۔ننھے میاں۔۔۔آ بیل مجھے مار۔۔۔اُلٹی گنگا۔۔۔اور۔۔۔بہنا کے آنسو میں۔۔۔کام ملنے کے باعث۔۔۔اُمید کی کرن نظر آئی۔۔۔مگر۔۔۔چاروں کی چار فلمیں۔۔۔اوندھے منہ زمین پر گرنے کے باعث۔۔۔ہماری نیّا مکمل طور پر ڈوب گئی۔۔۔اُدھر پھپھو کا گھر چھوڑنا پڑا۔۔۔ابّا میاں نے۔۔۔سارا ماجرا۔۔۔صفیہ آپا کو فون پر سنایا۔۔۔تو۔۔۔ صفیہ آپا۔۔۔اور۔۔۔اُن کے شوہر۔۔۔صوفی عتیق نے۔۔۔اس شرط پر ہمیں کراچی میں کاروبار کرانے کی حامی بھر لی۔۔۔کہ۔۔۔ابّا میاں۔۔۔پاکستان آتے، جاتے لوگوں کے ذریعہ۔۔۔رقم ارسال کر دیں۔۔۔ابّا میاں نے۔۔۔ وعدے کے مطابق۔۔۔ہزار۔۔۔دو ہزار۔۔۔کر کے۔۔۔صفیہ آپا کو بیس ہزار روپے بھجوا دیئے۔۔۔!''

''کتنے۔۔۔؟''

''بیس ہزار۔۔۔''

''بیس ہزار۔۔۔(الفاظ کھینچتے ہوئے) بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔۔۔ بیس ہزار۔۔۔''(ایک مرتبہ پھر الفاظ کھینچتے ہوئے)

''جھوٹ تھوڑی بول رہا ہوں۔۔۔یقین نہ آئے۔۔۔تو۔۔۔صفیہ آپا سے پوچھ لو۔۔۔!''

''اچھا چھوڑو۔۔۔آگے بتاؤ۔۔۔آگے کیا ہوا۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔پہلے پہل۔۔۔تو۔۔۔صفیہ آپا کے گھر بھی۔۔۔پھپھو کے گھر کی طرح۔۔۔خوب آؤ بھگت رہی۔۔۔مگر۔۔۔آہستہ آہستہ۔۔۔گرم جوشی کم ہوتے ہوتے۔۔۔بے رخی میں بدل گئی۔۔۔!''

''پھر۔۔۔!''

''پھر کیا۔۔۔میں جب بھی۔۔۔کاروبار کرنے کا ذکر کرتا۔۔۔صفیہ پھپھو۔۔۔اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ جاتیں۔۔۔!''

''کس قسم کے دکھڑے۔۔۔؟''

''کبھی بیماری۔۔۔کبھی لاچاری۔۔۔کبھی قرض۔۔۔کبھی کلیم۔۔۔ کبھی کچھ۔۔۔کبھی کچھ۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔؟''

''ایک دن میری برداشت جواب دی گئی۔۔۔میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔۔۔آپ نے کاروبار اپنی جیب سے تھوڑی کرانا ہے۔۔۔ابّا میاں نے۔۔۔جو رقم بھیجی ہے۔۔۔اُس سے کرانا ہے۔۔۔؟''

''ٹھیک۔۔۔اس پر صفیہ آپا نے کیا جواب دیا۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔وہ تو۔۔۔صاف مکر گئی۔۔۔!''

''صاف مکر گئی۔۔۔یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔!''

''بولیں۔۔۔اے لڑکے۔۔۔تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔۔۔کس رقم کی بات کر رہا ہے تُو۔۔۔؟''

''یہ کہا صفیہ آپا نے۔۔۔کس رقم کی بات کر رہا ہے تُو۔۔۔؟''

''جی جناب۔۔۔بالکل یہ ہی کہا۔۔۔ہو بہو انہیں الفاظ میں۔۔۔!''

''پھر تم نے کیا کیا۔۔۔؟''

''ایک دفعہ تو۔۔۔میرا بھیجا گھوم گیا۔۔۔مگر۔۔۔میں نے سوچا۔۔۔ صفیہ آپا سے منہ ماری کرنے کے بجائے۔۔۔ابّا میاں سے بات کر لوں۔۔۔!''

''ٹھیک۔۔۔پھر کی تم نے بھائی میاں سے بات۔۔۔؟''

''اُسی رات۔۔۔تار گھر سے۔۔۔ٹرنک کال بک کرا کے۔۔۔ابّا میاں کو سارا ماجرا سنایا۔۔۔تو۔۔۔ابّا میاں۔۔۔سناٹے میں آ گئے۔۔۔کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد۔۔۔بولے۔۔۔تم کچھ نہ کہنا۔۔۔میں خود بات کروں گا صفیہ سے۔۔۔!''

''پھر۔۔۔بھائی میاں نے کی بات صفیہ آپا سے۔۔۔!''

''کچھ دن۔۔۔تو۔۔۔صفیہ آپا۔۔۔ابّا میاں سے بات کرنے میں۔۔۔آنا کانی کرتی رہی۔۔۔جب ابّا میاں کے فون کا تانتا بندھ گیا۔۔۔ تو۔۔۔صفیہ آپا نے۔۔۔اپنے گھر کا فون ہی کٹوا دیا۔۔۔!''

''فون کٹوا دیا۔۔۔صفیہ آپا نے۔۔۔؟''

''جی جناب۔۔۔فون کٹوا دیا۔۔۔صفیہ آپا نے۔۔۔آپ کی صفیہ آپا نے۔۔۔!''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا۔۔۔؟''

''میں نے۔۔۔تو۔۔۔کچھ نہیں کیا۔۔۔البتہ۔۔۔ابّا میاں کی ہدایت پر سلیمان پہلوان۔۔۔درمیان میں آ گئے۔۔۔''

''سلیمان پہلوان کون۔۔۔؟''

''ابّا میاں کے پرانے ملنے والے ہیں۔۔۔چتلی قبر دہلی میں خراد کا بڑا کارخانہ تھا۔۔۔ ٹین ہٹی پر بھی خراد کا کارخانہ ہے۔۔۔ لالو کھیت میں رہتے ہیں۔۔۔!''

''سلیمان پہلوان نے کیا کیا۔۔۔؟''

''سلیمان پہلوان نے۔۔۔سیدھے۔۔۔سیدھے۔۔۔ایک ہفتے کا نوٹس دیا۔۔۔صفیہ آپا۔۔۔اور۔۔۔صوفی عتیق کو۔۔۔ وعدہ خلافی کی صورت میں۔۔۔سنگین نتائج کی دھمکی بھی دے ڈالی۔۔۔!''

''معاملہ یہاں تک جا پہنچا۔۔۔!''

''ابھی کہاں۔۔۔صفیہ آپا۔۔۔اور۔۔۔اُن کے شوہر۔۔۔سلیمان پہلوان کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے۔۔۔ میرے خلاف پولیس میں رپٹ درج کرا دی۔۔۔!''

''کس نے۔۔۔صفیہ آپا نے۔۔۔؟''

''صفیہ آپا نے کرائی۔۔۔یا۔۔۔اُن کے کسی لگے سگے نے۔۔۔بات تو ایک ہی ہے۔۔۔!''

''پھر کیا ہوا۔۔۔؟''

''ہونا کیا تھا۔۔۔ سلیمان پہلوان قائدِ اعظم کی سفارش لے کر آئے۔۔۔اور۔۔۔جان چھوٹ گئی۔۔۔!''

''قائدِ اعظم کی سفارش۔۔۔کیا اُول فول بک رہے ہو۔۔۔؟''

''تمہاری سادگی پر ترس آ رہا ہے مجھے۔۔۔قسم اللہ پاک کی۔۔۔پورا پاکستان۔۔۔قائدِ اعظم کی سفارش پہ چل رہا ہے۔۔۔اور۔۔۔آپ کو۔۔۔پتہ تک نہیں۔۔۔!''

''دوہری ندامت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔۔۔ایک صفہ آپا کا عمل۔۔۔ دوسرے تم۔۔۔ بھگو۔۔۔ بھگو۔۔۔ کے مار رہے ہو۔۔۔ کاش زمین پھٹ جاتی۔۔۔ اور۔۔۔ میں اُس میں سما جاتا۔۔۔ ہائے ۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔!

سودا جو بے خبر ہے وہی یہاں کرے ہے عیش
مشکل بہت ہے اُن کو جو رکھتے ہیں آگہی

☆

''کیا نام بتلایا تھا آپ نے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔عمران۔۔۔!''

''پورا نام بتلایئے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔وہ۔۔۔(ہچکچاتے ہوئے) پیرزادہ آلِ عمران۔۔۔!''

''بات یہ ہے۔۔۔ پیرزادہ ۔۔۔ ارے۔۔۔ آپ کھڑے کیوں ہیں۔۔۔ بیٹھئے۔۔۔ بیٹھئے۔۔۔آرام کے ساتھ بیٹھئے۔۔۔ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔۔۔؟''

''جی۔۔۔وہ۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔تو۔۔۔ پیرزادہ صاحب۔۔۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔۔۔ کہ۔۔۔جس قدر شفیق صاحب عزیز ہیں۔۔۔اُسی قدر آپ عجیب ہیں۔۔۔؟''

''جی۔۔۔؟'' (حیرت اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ)

''دیکھئے۔۔۔ آپ کو۔۔۔ کام کی بھی تلاش ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ ملازمت بھی نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ہے نا۔۔۔عجیب بات۔۔۔؟''

''جی۔۔۔وہ۔۔۔ہمارے خاندان میں۔۔۔!''

''جانتا ہوں۔۔۔اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔آپ کے والد صاحب سے کئی ملاقاتیں ہیں میری۔۔۔ مگر۔۔۔ خیر۔۔۔ چھوڑیئے۔۔۔ ایک شعر سنئے۔۔۔ ہمارے دوست۔۔۔اور۔۔۔آج کے دور کے معروف شاعر۔۔۔ احمد مشتاق صاحب کا ہے:

کہیں اُمید سی ہے دل کے نہاں خانے میں
ابھی کچھ وقت لگے گا اُسے سمجھانے میں

''کیسا لگا شعر۔۔۔کچھ سمجھ آیا۔۔۔یا۔۔۔؟''

''جی۔۔۔اچھا ہے۔۔۔بہت اچھا۔۔۔!''

''شفیق صاحب سے۔۔۔کیا رشتہ ہے آپ کا۔۔۔؟''

''رشتے کے ماموں ہیں میرے۔۔۔امّی کے تایا زاد بھائی۔۔۔!''

''آپ کے رشتے کے ماموں ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ ہمارے سگے دوست۔۔۔ بلکہ۔۔۔سگوں سے بھی۔۔۔دو ہاتھ آگے۔۔۔!''

''جی۔۔۔اچھا۔۔۔'' (پہلو بدلتے ہوئے)

''عمران میاں۔۔۔ بات دراصل یہ ہے ۔۔۔کام کوئی اچھا۔۔۔ یا۔۔۔ برا نہیں ہوتا۔۔۔کام کرنے کا طریقہ۔۔۔صحیح یا غلط ہوا کرتا ہے۔۔۔اگر آپ۔۔۔محنت۔۔۔ایمانداری۔۔۔اور۔۔۔لگن سے۔۔۔کام کریں۔۔۔ تو۔۔۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔کہ۔۔۔آپ ۔۔۔ملازم ہیں۔۔۔ یا۔۔۔مالک۔۔۔وہ۔۔۔اصغر گونڈوی کیا خوب کہہ گئے ہیں:

ہے عشق کی شورش رعنائی و زیبائش
جو خون اُچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے

اگر عشق کی جگہ علم۔۔۔یا۔۔۔عمل پڑھ لیں۔۔۔تو۔۔۔بات واضح ہو جاتی ہے۔۔۔!''

''جی۔۔۔جی۔۔۔صحیح فرمایا۔۔۔!''

''اس ساری گفتگو کا مطلب۔۔۔آپ سے تعلق استوار کرنا ہے۔۔۔ کیا استوار کرنا ہے۔۔۔؟''

''تعلق۔۔۔!''

''دراصل ۔۔۔ہمیں بھولنے کی عادت ہے۔۔۔ اس لیے سامنے

والے سے۔۔۔اپنی بات کی تصدیق کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔۔۔ہماری کیفیت نثار یار جنگ کے اس شعر کی مانند ہے:

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اُس نے کہا تھا
کیا اُس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں

''اچھا یہ بتلائیے۔۔۔لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔کچھ۔۔۔کچھ۔۔۔ہے۔۔۔!''

''پاکستان کے بارے۔۔۔ کیا جانتے ہیں۔۔۔ پاکستان چھوڑیئے۔۔۔ کراچی کافی ہے۔۔۔ کراچی کے بارے کچھ۔۔۔ اتا پتہ ہے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔کچھ۔۔۔کچھ۔۔۔ہے۔۔۔!''(اٹک اٹک کر)

''مثلاً۔۔۔؟''

کراچی جنوبی پاکستان میں۔۔۔ بحرعرب کے عین شمال میں واقع ہے۔۔۔کراچی شہر کا رقبہ 527.3 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔۔۔ کراچی دریائے سندھ پر 52-24 شمال ۔۔۔اور۔۔۔ 3-7 مشرق پر ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔۔۔ جو۔۔۔ابتدا میں ۔۔۔کروکولا کے نام سے جانی جاتی تھی۔۔۔ وادیٔ سندھ میں۔۔۔مہم جوئی کے بعد۔۔۔سکندر اعظم نے۔۔۔ یونان واپسی پر۔۔۔ یہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔۔۔سکندر اعظم کے سپہ سالار نیارخوس نے۔۔۔کراچی کو نتو بار کے نام سے موسوم کیا تھا۔۔۔ماہرین۔۔۔نتو بار کو۔۔۔ منوڑا کا بگڑا ہوا تلفظ بتلاتے ہیں۔۔۔عرب سیاہ۔۔۔کراچی کو دیبل کے نام سے یاد کرتے تھے۔۔۔۷۱۲ عیسوی میں محمد بن قاسم نے سندھ سے اپنی فتوحات کا آغاز کیا۔۔۔تو۔۔۔ اُس وقت محمد بن قاسم ۔۔۔ اور۔۔۔ اُس کے سپاہی ۔۔۔ کراچی کو۔۔۔دیبل کے نام سے یاد کرتے تھے۔۔۔۱۷۷۲ میں۔۔۔جس وقت مسقط۔۔۔اور۔۔۔بحرین کے ساتھ کراچی کو تجارت کے لیے بطور بندرگاہ منتخب کیا گیا۔۔۔تو۔۔۔ اُس وقت۔۔۔ ایک بلوچ ہندو خاتون مائی کولاچی۔۔۔ بلوچستان سے ہجرت کر کے۔۔۔ یہاں آباد ہوئی۔۔۔ مائی کولاچی کے ساتھ۔۔۔بلوچستان کے چند ماہی گیر بھی کراچی آ کر بس گئے۔۔۔اُس دور میں کراچی کو۔۔۔مائی کولاچی کے نام سے۔۔۔یاد کیا جانے لگا۔۔۔وقت گزرنے کے ساتھ۔۔۔مائی کولاچی۔۔۔صرف۔۔۔کولاچی ہوگیا۔۔۔اور۔۔۔آہستہ ۔۔۔آہستہ۔۔۔کولاچی۔۔۔کا تلفظ۔۔۔کراچی ہوگیا۔۔۔!

جیسے جیسے شہر کی آبادی بڑھتی گئی۔۔۔ویسے ویسے۔۔۔شہر کے گرد فصیلیں بنانے کا۔۔۔کام ہونے لگا۔۔۔مسقط سے توپیں درآمد کر کے۔۔۔شہر کے گرد تعمیر کردہ فصیلوں پر نصب کر دی گئیں۔۔۔شہر میں داخل ہونے کا ایک دروازہ۔۔۔سمندر کی جانب تھا۔۔۔جسے کھارادر کے نام سے موسوم کیا گیا۔۔۔ دوسرا دروازہ لیاری ندی کی جانب تھا۔۔۔ اُسے میٹھا در کا نام دیا گیا۔۔۔ ۱۷۹۵ تک ۔۔۔ کراچی خان آف قلات کی مملکت کا حصہ رہا۔۔۔ اُسی سال۔۔۔سندھ کے حکمرانوں۔۔۔اور۔۔۔خان آف قلات کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔۔۔اس جنگ میں خان آف قلات کی فوجوں کو شکست ہوئی۔۔۔اور۔۔۔سندھ کے حکمران کراچی کے حکمران بھی بن گئے۔۔۔اس کے بعد اندرون سندھ۔۔۔اور۔۔۔دیگر شہروں کے لوگ بھی۔۔۔روزگار کی تلاش میں۔۔۔کراچی کا رخ کرنے لگے۔۔۔جس کے سبب کراچی کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔۔۔آبادی میں اضافہ کے ساتھ کراچی کی بندرگاہ بھی تیزی سے ترقی کرنے لگی۔۔۔اس ترقی کے باعث جہاں ہندوستان بھر کے لوگوں کی توجہ کراچی کی جانب ہوئی۔۔۔وہیں۔۔۔انگریز سرکار بھی۔۔۔للچائی نظروں سے۔۔۔کراچی پر قبضہ کی تدبیر نکالنے لگی۔۔۔!

انگریز حکومت نے اپنے منصوبوں پر عمل کی غرض سے ۔۔۔ ۳۔فروری ۱۸۳۹ء میں کراچی پر ہلاّ بول دیا۔۔۔سندھ کے حکمران ۔۔۔ انگریزوں کی جامعہ حکمت عملی۔۔۔اور۔۔۔جدید سامانِ حرب کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے۔۔۔انگریز حکومت نے۔۔۔فتح کے بعد کراچی کو ضلع بنانے کا اعلان کر دیا۔۔۔کراچی کی تیز رفتار ترقی کے پیش نظر ۱۸۸۰ میں۔۔۔ریل کی پٹڑی بچھا کر۔۔۔کراچی کو۔۔۔پورے ہندوستان سے جوڑ دیا گیا۔۔۔ریل گاڑی کے تیز رفتار سفر کے باعث۔۔۔۱۸۸۱ تک کراچی کی آبادی۔۔۔ پچاس ہزار تہتر افراد تک پہنچ چکی تھی۔۔۔ جبکہ۔۔۔ ۱۸۹۱ تک۔۔۔یعنی صرف دس سالوں میں۔۔۔کراچی کی آبادی چار گنا ہو کر۔۔۔ایک لاکھ ناوے ہزار ایک سو پانچ نفوس کو پہنچ چکی تھی۔۔۔اُس وقت کراچی۔۔۔گندم درآمد کرنے والا سب سے بڑا شہر بن چکا تھا۔۔۔!

۱۹۱۱ میں۔۔۔برطانوی حکومت نے۔۔۔دہلی کو دارالخلافہ بنانے کا اعلان کیا۔۔۔تو۔۔۔کراچی کو ریل کی پٹڑی کے ذریعہ جوڑ دیا گیا۔۔۔جس کے بعد مسافروں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔۔۔۱۹۳۶ میں۔۔۔سندھ کو صوبہ کا درجہ دیا گیا۔۔۔تو۔۔۔کراچی شہر کی زندگی میں نئی لہر دوڑ گئی۔۔۔جس کے بعد ۱۹۴۷ء میں۔۔۔لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کی آمد سے۔۔۔جہاں کراچی کی آبادی میں۔۔۔ بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔۔۔ وہیں۔۔۔ برق رفتار صنعتی۔۔۔و۔۔۔تجارتی ترقی نے۔۔۔شہر کی رونق میں چار چاند لگا دیئے۔۔۔!

کراچی ایک ناہموار میدانی علاقہ ہے۔۔۔کراچی کی شمال۔۔۔ اور۔۔۔مغربی سرحدیں۔۔۔پہاڑیوں پر مشتمل ہیں۔۔۔شہر کے درمیان سے دو بڑی ندیاں۔۔۔ملیر ندی۔۔۔اور۔۔۔لیاری ندی گزرتی ہیں۔۔۔اس کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی ندیاں۔۔۔اور۔۔۔ برساتی نالے بھی۔۔۔شہر کے وسط سے گزرتے ہیں۔۔۔!

اس وقت کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر۔۔۔اور۔۔۔سب سے بڑا صنعتی۔۔۔ تجارتی۔۔۔ تعلیمی ۔۔۔و ۔۔۔ اقتصادی مرکز ہے۔۔۔ کراچی۔۔۔دنیا کا چھٹا بڑا شہر ہے۔۔۔پاکستان کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ۔۔۔

اور۔۔۔سب سے بڑی بندرگاہ بھی کراچی میں واقع ہے۔۔۔ساحل سمندر پر آباد ہونے کے باعث کراچی کا موسم معتدل ہے۔۔۔دیگر شہروں کی نسبت۔۔۔ کراچی شہر میں بارشیں نسبتاً کم ہوتی ہیں۔۔۔ایک اندازے کے مطابق۔۔۔ کراچی میں۔۔۔ڈھائی سو سے تین سو ملی میٹر بارش ہر سال ہوتی ہے۔۔۔کراچی میں گرمیوں کا موسم۔۔۔اپریل۔۔۔تا۔۔۔اگست تک رہتا ہے۔۔۔کراچی کی آب و ہوا میں نمی کا تناسب دیگر شہروں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔۔۔ نومبر۔۔۔تا۔۔۔دسمبر سردی کے مہینے ہوتے ہیں۔۔۔دسمبر۔۔۔اور۔۔۔ جنوری۔۔۔کراچی شہر کی رونق کے حوالے سے اہم مہینے گردانے جاتے ہیں۔۔۔ اس دوران ۔۔۔شادی بیاہ۔۔۔اور۔۔۔سیّاحوں کی آمد زیادہ ہوا کرتی ہے۔۔۔کراچی آنے والے سیّاحوں کی توجہ کا مرکز عبداللہ شاہ غازی کا مزار۔۔۔ گاندھی گارڈن۔۔۔کلفٹن۔۔۔کماڑی۔۔۔ڈاک یارڈ۔۔۔کے علاوہ۔۔۔ مزار قائد ہوا کرتے ہیں۔۔۔!

کراچی شہر کی بلدیہ کا آغاز۔۔۔۱۹۳۳ء میں ہوا۔۔۔ابتدا میں۔۔۔ ایک میئر۔۔۔اور۔۔۔ستاون کونسلر منتخب ہوا کرتے تھے۔۔۔ازاں بعد کراچی کو۔۔۔بلدیہ عظمیٰ کا درجہ دیا گیا۔۔۔اس کے بعد کراچی شہر کو۔۔۔کئی ٹاؤن میں تقسیم کر کے۔۔۔ان کا بلدیاتی نظام الگ کر دیا گیا۔۔۔اس کے بعد۔۔۔یونین کونسلوں کا نظام متعارف کرایا گیا۔۔۔!

گذشتہ سو سالوں پر نظر دوڑائیں۔۔۔تو۔۔۔کراچی کی آبادی۔۔۔ وسائل۔۔۔اور۔۔۔مسائل میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔۔۔جس کا سب سے بڑا سبب کراچی کا کثیر النسل ہونا بتلایا جاتا ہے۔۔۔اعداد و شمار کے مطابق۔۔۔ کراچی کی چورانوے فیصد آبادی۔۔۔شہر میں قیام پذیر ہے۔۔۔کراچی میں اردو بولنے والوں کا تناسب 52-48 فیصد۔۔۔پنجابی زبان والوں کا 6-13 فیصد۔۔۔پشتو زبان بولنے والے 42-11 فیصد۔۔۔سندھی زبان بولنے والے 22-7 فیصد۔۔۔اور۔۔۔سرائیکی زبان بولنے والے 11-2 فیصد قیام پذیر ہیں۔۔۔!

''واہ میاں۔۔۔واہ۔۔۔کمال کا رٹّا لگایا ہے۔۔۔اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔۔۔چھٹی کلاس سے لے کر۔۔۔دسویں کلاس تک۔۔۔چوبیس لڑکے تھے۔۔۔معافی چاہتا ہوں۔۔۔آٹھویں کے امتحان بورڈ کے ہوتے تھے۔۔۔پریم کمار۔۔۔اور۔۔۔حفیظ نے۔۔۔امتحان کے بعد سکول چھوڑ دیا تھا۔۔۔اور۔۔۔شہر کے نئے ڈی۔ایس۔پی۔۔۔رشید علی خان کے بیٹے راحت علی خان نے۔۔۔نویں جماعت میں داخلہ لے لیا تھا۔۔۔اس طرح تیئیس لڑکے رہ گئے تھے۔۔۔ایک سے ایک دھاکڑ۔۔۔اور۔۔۔پھنّے خان۔۔۔ میرے۔۔۔اور۔۔۔فرید کے علاوہ۔۔۔سارے مادر۔۔۔مرغا بنے ہوتے۔۔۔معافی چاہتا ہوں۔۔۔روانی میں زبان سے گالی نکل گئی۔۔۔ویسے بھی۔۔۔آپ کی عمر میں دوستوں کے درمیان۔۔۔آپ جناب تھوڑی ہوتی ہے۔۔۔دیکھو میں پٹڑی سے اُترنے لگا ہوں۔۔۔مگر۔۔۔اپنے بڑے میاں ہیں نا بہت کام کے آدمی ہیں۔۔۔ہر آڑے وقت میں مدد کو پہنچ جاتے ہیں:

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔۔۔؟''

''جی۔۔۔وہ۔۔۔دوستوں کے درمیان بے تکلفی۔۔۔!''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔۔۔ایک دفعہ کا ذکر ہے۔۔۔ہم تین دوست۔۔۔بنواری لال کے ہوٹل پر۔۔۔الائچی والی چائے پینے گئے۔۔۔ تو۔۔۔کیا دیکھتا ہوں۔۔۔ہماری اُن کے ماموں۔۔۔اپنے کسی دوست کے ہمراہ۔۔۔پہلے سے بنواری لال کے ہوٹل پر فروکش تھے۔۔۔کیا تھے۔۔۔!''

''فروکش۔۔۔!''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔۔۔بائی داوے۔۔۔آپ کی بھی تو کوئی اُن ضرور ہو گی۔۔۔؟''

''جی نہیں۔۔۔بالکل نہیں۔۔۔!''(شرم سے سر جھکا کر)

''میاں۔۔۔مرد بنو۔۔۔مرد۔۔۔آپ تو۔۔۔لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔۔۔بقول اکبرالہ آبادی:

حیا سے سر جھکا لینا، ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔۔۔؟''

''بنواری لال کے ہوٹل پر چائے۔۔۔!''

''یہ ہوئی نا بات۔۔۔جیسے ہی ہماری نظر۔۔۔اپنی اُن کے ماموں۔۔۔تعریف صاحب پر پڑی۔۔۔فوراً نعیم۔۔۔اور۔۔۔افضال کی جانب آنکھ مارتے ہوئے۔۔۔السلام علیکم ماموں جان۔۔۔سنایئے مزاج کیسے ہیں۔۔۔ممانی جان کیسی ہیں۔۔۔بڑے ماموں صاحب خیریت سے ہیں۔۔۔؟''

''آخ خاہ۔۔۔جمیل میاں آپ کدھر۔۔۔جی۔۔۔وہ۔۔۔ہم لوگ۔۔۔نظام الدین اولیاء کے مزار پر جا رہے تھے۔۔۔!''۔

''سب خیریت ہے نا۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔سب خیریت ہے۔۔۔دراصل آج جمعرات ہے نا۔۔۔اس لیے۔۔۔!''

''ہر جمعرات کو جاتے ہیں نظام الدین اولیا کے مزار پر۔۔۔؟''

''جی۔۔۔ہر جمعرات۔۔۔بلاناغہ۔۔۔!''

''اکیلے جاتے ہیں۔۔۔یا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ہم۔۔۔تینوں دوست جاتے ہیں۔۔۔(دوستوں کو قریب بلاتے ہوئے) اماں افضال بھائی۔۔۔اماں نعیم بھائی۔۔۔دور کیوں کھڑے ہیں۔۔۔ان سے ملئے۔۔۔آپ ہیں تعریف ماموں۔۔۔ آ۔۔۔آپ (تعریف صاحب کے ہمراہی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے

ہوئے۔۔۔؟''

''معراج الدین۔۔۔!''

''جی۔۔۔معراج صاحب۔۔۔اماں کھڑے کیوں ہیں۔۔۔تشریف رکھیئے نا۔۔۔!''

''شکریہ۔۔۔!''(نعیم اور افضال نے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہم آواز ہوکر)

''آج رات کو۔۔۔ٹاؤن ہال میں مشاعرہ ہے۔۔۔آپ لوگ آیئے نا۔۔۔!(تعریف صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے ہمیں مخاطب کیا۔۔۔ تو۔۔۔ہم نے ترت۔۔۔نعیم۔۔۔اور۔۔۔افضال کی رائے جاننا چاہی)

''کیوں میاں نعیم۔۔۔کیا خیال ہے۔۔۔شام کے مشاعرے میں چلئے گا۔۔۔''

''اماں ہمیں تو فراغت ہے۔۔۔ افضال بھائی سے دریافت کر لیجیے۔۔۔!''

''جی افضال بھائی۔۔۔آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔جس طرح آپ فرمائیں گے۔۔۔ بندہ حاضر ہے۔۔۔!''

''تعریف ماموں۔۔۔اور۔۔۔معراج صاحب سے۔۔۔الائچی دار چائے کی چسکیوں میں ۔۔۔ دہلی کے موسم۔۔۔ ماحول ۔۔۔ اور۔۔۔ ادبی محفلوں پر گفتگو کے بعد۔۔۔ محفل برخاست ہوئی۔۔۔ تو۔۔۔ بے خیال میں۔۔۔کچھ دیر۔۔۔دونوں دوستوں سے۔۔۔آپ جناب کہہ کر بات کرتے رہے۔۔۔اچانک افضال کی برداشت جواب دے گئی۔۔۔!''

''دیکھ بے دیکھ۔۔۔ بہت ہوگئی بدتہذیبی۔۔۔ اب۔۔۔تمیز سے بات کرلے۔۔۔!''

''افضال کے مطالبے پر۔۔۔ ہم نے۔۔۔ مادر والی گالی دے کر مخاطب کیا۔۔۔تو۔۔۔افضال نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔۔۔!''

''اب آیا نا لائن پر۔۔۔!''

''ہائے۔۔۔ہائے۔۔۔وہ بھی کیا زمانہ تھا۔۔۔''(چشمہ اتار کر رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے)

''خیریت۔۔۔؟''

''ہاں میاں۔۔۔ خیریت ہی ہے۔۔۔خمار صاحب شدت سے یاد آنے لگے ہیں:

بجھ گیا دل حیات باقی ہے
چھپ گیا چاند رات باقی ہے
حال دل ان سے کہہ چکے سو بار
اب بھی کہنے کی بات باقی ہے
اے خوشا ختم اجتناب مگر
محشر التفات باقی ہے
عشق میں ہم سمجھ چکے سب سے
ایک ظالم حیات باقی ہے
ناصحان کرام کے دم سے
شورش کائنات باقی ہے
رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے
رحمت بے پناہ کے صدقے
اعتماد نجات باقی ہے
نہ وہ دل ہے نہ وہ شباب خمار
کس لیے اب حیات باقی ہے

☆

''خواتین وحضرات۔۔۔آپ نے جس بھرپور طریق پر۔۔۔صدرِ محفل۔۔۔محترم صبا اکبر آبادی کے۔۔۔نوجوان فرزندِ ارجمند۔۔۔ جناب سلطان جمیل نسیم کی۔۔۔حوصلہ افزائی فرمائی۔۔۔اُس کے بعد اہلِ کراچی کی نسبت۔۔۔کسی بھی نوع کی حاشیہ آرائی کی۔۔۔گنجائش باقی نہیں بچتی۔۔۔اب باری ہے۔۔۔آج کی محفل کے دولہا۔۔۔!''

(قمر علی عباسی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے بلند آواز میں جملہ اُچھالا۔۔۔)

''دولہا۔۔۔اس طرح۔۔۔ہم باراتی ہوئے۔۔۔؟''

''جی ہاں۔۔۔دولہا۔۔۔!''

''اس حساب سے۔۔۔تو۔۔۔سلطان جمیل نسیم کو شہہ بالا کا خطاب دینا چاہیے۔۔۔!''(محسن بھوپالی نے برجستہ فقرہ کسا تو شرکائے محفل سے کسی صاحب نے کہا)

''وہ اپنے حصہ کا کام کر رہے ہیں۔۔۔ آپ اپنے حصے کا کیجیے۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔تو۔۔۔خواتین وحضرات۔۔۔ میں عرض کر رہا تھا۔۔۔ اب باری ہے۔۔۔آج کی محفل کے دولہا۔۔۔ہم سب کے محبوب۔۔۔ جناب مصطفےٰ زیدی ۔۔۔ ڈپٹی کمشنر کراچی۔۔۔ بلکہ۔۔۔ ہردلعزیز۔۔۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر۔۔۔ مصطفےٰ زیدی صاحب ۔۔۔ تازہ غزل۔۔۔ آپ کی توجہ۔۔۔ و۔۔۔ رہنمائی کے لیے پیش کریں گے۔۔۔تشریف لایئے مصطفےٰ زیدی صاحب۔۔۔!''

''سب سے پہلے۔۔۔ یہ وضاحت کرنا ضروری ہے۔۔۔کہ میں فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے وقت جس کرسی پر بیٹھتا ہوں۔۔۔وہ مجھے ڈپٹی کمشنر

کہلانے کا حق دیتی ہے۔۔۔ کرسی سے اُترنے کے بعد۔۔۔ چاہے عارضی ہو۔۔۔ یا۔۔۔ دائمی۔۔۔ میری طرح ہر شخص عام آدمی ہوتا ہے۔۔۔ ویسے۔۔۔ ہمارے۔۔۔ آپ کے محبوب۔۔۔ مرزا اسداللہ خان غالب۔۔۔ شاعری کو باعث عزت نہ گردانتے تھے۔۔۔ مگر۔۔۔ ہمارے لیے۔۔۔ شاعری نہ صرف باعث عزوشرف ہے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ محبوب کے درجہ پر فائز ہے۔۔۔!''

''یہ الزام ہے شاعری پر۔۔۔ سراسر الزام۔۔۔!'' (ایک آواز)

''ایک اور سہی۔۔۔ (مصطفےٰ زیدی نے آواز کسنے والے صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے مختصر جواب دے کر بات آگے بڑھائی)

ہاں۔۔۔ تو۔۔۔ خواتین وحضرات۔۔۔ اس غزل کا معاملہ بھی عجیب ہے۔۔۔ کل شام۔۔۔ بلکہ۔۔۔ رات تک۔۔۔ اس غزل کا نام ونشان تک نہ تھا۔۔۔ قریب آڑھائی بجے صبح۔۔۔ اڑھائی بجے صبح ہوجاتی ہے نا۔۔۔!

''ہماری۔۔۔ تو۔۔۔ ہوجاتی ہے۔۔۔!'' (شان الحق حقی نے برجستہ کہا)

''ہمیں بھی۔۔۔ اپنے ساتھ شامل سمجھئے۔۔۔ (مصطفےٰ زیدی نے ترکی بہ ترکی جیب سے غزل نکالتے ہوئے) خواتین وحضرات۔۔۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔۔۔ کہ۔۔۔ زیرنظر غزل۔۔۔ صبح اڑھائی بجے وجود میں آئی ہے۔۔۔ ابھی اس کی نک سک درست کرنا باقی ہے۔۔۔ اُمید ہے۔۔۔ یہ فریضہ آپ۔۔۔ بہ حسن وخوبی انجام دیں گے۔۔۔ مطلع عرض ہے:

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے

''سبحان اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔ کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے (مختلف آوازیں ایک ساتھ)

غمِ دل میرے رفیقوں، غمِ رائیگاں نہیں ہے

''کیا کہنے زیدی صاحب۔۔۔ پھر پڑھیے۔۔۔! (حمایت علی شاعر نے فراخدلی سے کہا)

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غمِ دل میرے رفیقوں، غمِ رائیگاں نہیں ہے

''اور عرض کیا ہے۔۔۔!''

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی راز داں نہیں ہے

''کیا کہنے۔۔۔!'' (ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آواز نمایاں)

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی راز داں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہرباں نہیں ہے

بہت خوب مصطفےٰ زیدی۔۔۔ بہت خوب (ادا جعفری نے ہاتھ اُٹھا کر داد دی تو مصطفےٰ زیدی نے آداب عرض ہے کہہ کر اگلا شعر پڑھا)

کسی غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غم دل میرے رفقیوں غمِ رائیگاں نہیں ہے

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی راز داں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہرباں نہیں ہے
میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو

''پھر پڑھیے مصطفےٰ بھائی پھر پڑھیے (جمیل جالبی صاحب نے جھومتے ہوئے کہا)

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
میرا مجلسی تبسم میرا ترجماں نہیں ہے

''ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ ظالم کیا کہہ دیا۔۔۔ پھر سے کہو۔۔۔!''

(دلاور فگار نے ران پر ہاتھ مارتے ہوئے گرمجوشی کا اظہار کیا)

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
میرا مجلسی تبسم میرا ترجماں نہیں ہے

اور عرض کیا۔۔۔

کسی زلف کو صدا دو کسی آنکھ کو پکارو

کسی کی ضرورت کیوں آن پڑی۔۔۔؟ (ایک آواز)

کسی زلف کو صدا دو کسی آنکھ کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائبان نہیں ہے

''پھر پڑھیے۔۔۔ پھر سے پڑھیے۔۔۔!'' (تابش دہلوی نے لہک کر فرمائش کی)

کسی زلف کو صدا دو کسی آنکھ کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائبان نہیں ہے

''واللہ کمال کرتے ہیں مصطفےٰ صاحب۔۔۔!'' (محشر بدایونی نے والہانہ طریق پر سراہتے ہوئے)

کسی زلف کو صدا دو کسی آنکھ کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائبان نہیں ہے

اور مقطع ملاحظہ فرمایئے:

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

ارے واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ لوٹ لیا۔۔۔ پھر پڑھیے۔۔۔ پھر پڑھیے (ایک ساتھ بہت سی آوازیں)

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ سبحان اللہ کی بے شمار آوازیں۔۔۔ کوئی مبارک باد دے رہا ہے۔۔۔ کوئی مصافحہ۔۔۔ تو کوئی معانقہ کر کے۔۔۔ اپنی حاضری لگوا رہا ہے۔۔۔!

☆

''ہاں بھئی۔۔۔کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟''

''کونسا مسئلہ۔۔۔؟''

''یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا۔۔۔؟''

''ظاہر ہے۔۔۔''

''دیکھ رہے ہیں۔۔۔رئیس بھائی۔۔۔اس کی یہ ہی ادا مجھے زہر لگتی ہے۔۔۔!''

''کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔۔۔عالی میاں تم۔۔۔مگر۔۔۔ سچی بات یہ ہے۔۔۔کہ۔۔۔اس امر سے میں بھی۔۔۔قطعی لاعلم ہوں۔۔۔کہ۔۔۔اس وقت۔۔۔درپیش مسئلہ کیا ہے۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔بڑے۔۔۔بڑوں کی۔۔۔عمر گزر جاتی ہے۔۔۔جھک مارتے۔۔۔تب جا کے۔۔۔اس طرح کی داد میسر آتی ہے۔۔۔بلکہ۔۔۔بہت سے نامراد۔۔۔تو۔۔۔ یہ آرزو لئے۔۔۔ اس جہان سے کوچ کر جاتے ہیں۔۔۔!''

''یہ ہی۔۔۔تو۔۔۔میں سوچ رہا ہوں۔۔۔یہ تنقیدی اجلاس تھا۔۔۔یا۔۔۔لوہاری۔۔۔بھاٹی۔۔۔کا مشاعرہ۔۔۔؟''

''تو اس میں مضائقہ کیا ہے۔۔۔؟''

''میرا خیال تھا۔۔۔کوئی نقص۔۔۔کوئی خامی۔۔۔یا۔۔۔کم از کم کسی طرح کی کوئی تجویز دی جاتی۔۔۔مگر۔۔۔ مجال ہے۔۔۔ جو کسی نے ایک لفظ۔۔۔غزل کی صحت کے حوالے سے کہا ہو۔۔۔!''

''اگلی بار جب تازہ غزل ہو تو مجھے دے دینا۔۔۔تمہاری یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔۔۔!''

''تمہیں دینے سے۔۔۔میری حسرت کا۔۔۔کیا تعلق۔۔۔؟''

''تمہاری غزل۔۔۔کسی پھٹیچر شاعر کو دے کر۔۔۔حلقے میں بھیج دوں گا۔۔۔پھر دیکھنا۔۔۔غزل۔۔۔اور۔۔۔شاعر۔۔۔دونوں کے بخیئے نہ اُدھڑ جائیں۔۔۔تو۔۔۔میرا نام بدل کر رکھ دینا۔۔۔!''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو عالی۔۔۔؟''(رئیس امروہوی نے سنجیدگی سے دریافت کیا)

''رئیس امروہوی۔۔۔نہ سہی۔۔۔کم از کم۔۔۔جنگ جیسے بڑے اخبار کے ایڈیٹر کو۔۔۔یہ سوال زیب نہیں دیتا۔۔۔!''

''تمہاری یہ عادت۔۔۔ مجھ پر سخت گراں گزرتی ہے۔۔۔کہ۔۔۔تم۔۔۔سیدھی سادی بات کو۔۔۔اچھا خاصا پیچیدہ بنا دیتے ہو۔۔۔یہ ہی گلہ میں نے اکثر۔۔۔تمہارے کالم۔۔۔نقار خانے۔۔۔کے حوالے سے بھی کیا ہے۔۔۔''

''کالم کا ذکر کہاں سے آ گیا۔۔۔سیدھی سی بات ہے۔۔۔ہر دوسرے۔۔۔تیسرے دن۔۔۔کوئی نہ کوئی۔۔۔ ادیب۔۔۔شاعر۔۔۔نقاد۔۔۔ مکان کی۔۔۔دکان کی۔۔۔نوکری کی۔۔۔الاٹمنٹ کی۔۔۔درخواست لے کر۔۔۔ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے پاس۔۔۔سائل بن کر جائے گا۔۔۔تو۔۔۔اُسے کالے کتّے نے کاٹا ہے۔۔۔جو وہ۔۔۔تمہاری ناراضگی مول لے گا۔۔۔!''

''بات بے بات۔۔۔ میری نوکری۔۔۔ درمیان میں لے آتے ہو۔۔۔کل ہی استعفیٰ دے کر۔۔۔کس بھٹے پر بیٹھ جاؤں گا۔۔۔عرائض نویس بن کر۔۔۔!''

''اگر تمہاری نظر سے۔۔۔ن۔م۔راشد کا قصّہ گزرا ہوتا۔۔۔تو۔۔۔تم۔۔۔ہرگز ایسی بات نہ کرتے۔۔۔!''

''کون سا قصہ۔۔۔؟''

''تُو وہ قطرہ تھا جو اربابِ نظر بن سکتا تھا
تو جا کے صدف میں کیوں بیٹھا جب یونہی گوہر بن سکتا تھا''

''آنند نارائن ملاّ کی یاد کیوں ستانے لگی تمہیں۔۔۔؟''

''دلّی کے ایک تنقیدی اجلاس میں۔۔۔حیات اللہ انصاری نے۔۔۔راشد کے۔۔۔فن و شخصیت پر۔۔۔مقالہ پڑھا۔۔۔شروع سے آخر تک۔۔۔ترقی پسند مصنفین کو۔۔۔تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔۔۔مگر۔۔۔کہیں۔۔۔کہیں۔۔۔راشد کی تعریف بھی کی گئی۔۔۔بحیثیت مجموعی۔۔۔مقالہ۔۔۔راشد کے خلاف نہ تھا۔۔۔کسی عاقبت نا اندیش نے۔۔۔ن۔م۔راشد کو۔۔۔سارا ماجرا جا سنایا۔۔۔تو۔۔۔راشد بہت جُز بز ہوئے۔۔۔رئیس بھائی تو جانتے ہیں۔۔۔کہ۔۔۔راشد۔۔۔مزاجاً بہت سخت گیر تھے۔۔۔آؤ دیکھا۔۔۔نا تاؤ۔۔۔کاغذ قلم اٹھایا۔۔۔حیات اللہ انصاری کے نام۔۔۔نہایت سخت مکتوب لکھا مارا۔۔۔وہ بھی انگریزی میں۔۔۔ انصاری صاحب نے۔۔۔ راشد کے خط کا جواب۔۔۔تو۔۔۔ نہ دیا۔۔۔البتہ۔۔۔ مذکورہ مضمون سے راشد کی تعریف نکال کر۔۔۔سخت اعتراضات شامل کرنے کے بعد۔۔۔مضمون کو۔۔۔''ن۔م۔راشد پر'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔۔۔!''

''اور۔۔۔وہ۔۔۔بھی۔۔۔تو۔۔۔بتلاؤ۔۔۔فوج میں کمیشن والا قصّہ۔۔۔!''

''کمیشن والا قصّہ۔۔۔؟''

''غصیلی طبیعت کے ساتھ۔۔۔ راشد عجلت پسند بھی واقع ہوئے تھے۔۔۔!''

''وہ کیسے۔۔۔؟''(مصطفےٰ زیدی نے اشتیاق جتایا)

''ہوا یوں۔۔۔راشد کو جب اطلاع ملی۔۔۔کہ۔۔۔اُنہیں فوج میں کمیشن مل گیا ہے۔۔۔معمول کی دیگر کارروائی کے علاوہ میڈیکل ہونا باقی تھا۔۔۔طبیعت کی عجلت پسندی کے باعث۔۔۔راشد۔۔۔از خود فوج کے دفتر معائنہ کرانے کے لیے پہنچ گئے۔۔۔ شام کو جب گھر لوٹے۔۔۔تو۔۔۔جسم۔۔۔جگہ۔۔۔جگہ سے۔۔۔زخمی ہونے کے ساتھ۔۔۔منہ بھی سوجا ہوا تھا۔۔۔تھکن کے باعث جسم میں اکڑن پیدا ہو گئی تھی۔۔۔جس کے باعث چلنا

پھرنادوبھرہوگیاتھا۔۔۔معلوم کرنے پر۔۔۔بولے:
''یہ امتحان تو پُل صراط۔۔۔پار کرنے سے کم نہ تھا۔۔۔ بھگایا۔۔۔ دوڑایا۔۔۔اونچے درختوں پر چڑھنے کے علاوہ۔۔۔خاردار تاروں سے گزر کرلمبی چھلانگیں لگانا پڑیں۔۔۔!''

بعد میں معلوم پڑا۔۔۔ یہ معائنہ تو صرف جنگ لڑنے والے۔۔۔ فوجیوں کا کیا جاتا ہے۔۔۔لکھنے۔۔۔ پڑھنے۔۔۔یعنی ایجوکیشن کور۔۔۔اس سے قطعی مستثنیٰ ہے۔۔۔!

اب یہاں ن۔م۔راشدکویاد کیے بنا آگے بڑھنا زیادتی ہے۔۔۔:

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو زندگی تو ہم بھی ہیں!
زندگی سے ڈرتے ہو؟
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
''ان کہی'' سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو

پہلے بھی تو گزرے ہیں
دورِ نارسائی کے ''بے ریا'' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو ہیچ آرزومندی
یہ شب زباں بندی ہے رہ خداوندی
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو
شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر خاک ہو گیا آخر
اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟
ہاں ابھی تو تم بھی ہو
ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں
تم ابھی سے ڈرتے ہو

☆

''میاں مصطفےٰ۔۔۔!''

''جی۔۔۔ جی رئیس بھائی۔۔۔فرمایئے۔۔۔!'' (گہری سوچ سے چونکتے ہوئے)

''ایک بات۔۔۔تو۔۔۔بتلایئے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔پوچھیے۔۔۔!''

''ہمارے دل میں۔۔۔ کئی طرح کے وسوسے ۔۔۔ اور۔۔۔ خدشات۔۔۔سر اُبھار رہے ہیں۔۔۔!''

''کس حوالے سے۔۔۔؟''

''حلقے میں پڑھی گئی۔۔۔غزل کے حوالے سے۔۔۔!''

''میرے دل کی بات کہہ دی۔۔۔ رئیس بھائی۔۔۔ آپ نے۔۔۔!'' (جمیل الدین عالی نے فوراً لقمہ دیا)

تمہارے دل کی بھی۔۔۔خوب رہی۔۔۔:

گل ہو ماہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

''اور رئیس بھائی۔۔۔ رئیس بھائی کی بابت کیا خیال ہے جناب کا۔۔۔؟''

''رئیس بھائی۔۔۔ رئیس بھائی۔۔۔بڑے ہیں۔۔۔ اُن کی بابت۔۔۔لب کشائی۔۔۔میرا منصب نہیں۔۔۔!''

''ذرّہ نوازی ہے میاں۔۔۔جو۔۔۔آپ ناچیز کو۔۔۔عزت دیتے ہیں۔۔۔مگر۔۔۔میرا سوال۔۔۔ہنوز۔۔۔تشنہ طلب ہے۔۔۔؟''

''کون سا سوال۔۔۔؟''

''لومیاں عالی۔۔۔اب تم ہی بتلاؤ۔۔۔کہ ہم بتلائیں کیا۔۔۔؟''

''ابے۔۔۔اس سے پہلے۔۔۔میرے منہ سے۔۔۔کچھ اول فول نکلے۔۔۔صاف۔۔۔صاف۔۔۔بتا دو۔۔۔معاملہ کیا ہے۔۔۔؟''(جمیل الدین عالی نے زبان پر آئے الفاظ پر قابو پاتے ہوئے اٹک اٹک کر جملہ ادا کیا)

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکر تجھ بغیر
اس گفتگو سے فائدہ پیارے گزر گئی

''اب کیا رخنہ آن پڑا۔۔۔؟''

میں نے تم کو دل دیا اور تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تُم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

''میں بات کروں۔۔۔؟''

کوئی کلمہ بھی میرے منہ سے نکلنے نہ دیا
وہ لٹایا مجھے قاتل نے سنبھلنے نہ دیا

''رئیس بھائی۔۔۔میرے پلّے۔۔۔تو۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔پڑ رہا۔۔۔آپ کو۔۔۔کچھ سمجھ آ رہا ہو۔۔۔تو۔۔۔بتلایئے۔۔۔!''

''میاں۔۔۔کھل کر بتلاؤ۔۔۔ہوا کیا ہے۔۔۔یوں۔۔۔پہیلیاں بجھوانے سے۔۔۔تو۔۔۔کام نہیں چلے گا۔۔۔!''

ثبات بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثال حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا، نہ شور دیکھا، نہ موج دیکھی، نہ آب دیکھا

''کوئی تیسرا آ گیا ہے۔۔۔درمیان میں۔۔۔؟''

بزم میں باعثِ تاخیر ہوا کرتے تھے
ہم کبھی تیرے عناں گیر ہوا کرتے تھے
ہائے اب بھول گیا رنگِ حنا بھی تیرا
خط کبھی خون سے تحریر ہوا کرتے تھے

''کون ہے۔۔۔وہ۔۔۔؟''

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

''معاملہ سنجیدہ ہے۔۔۔؟''

''بہت سنجیدہ۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔؟''

''تمہاری۔۔۔میری۔۔۔سوچوں سے پرے۔۔۔!''

''مطلب۔۔۔!''(پریشانی میں بات ادھوری چھوڑتے ہوئے)

''مطلب۔۔۔وطلب۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔پتنگ۔۔۔آسمانوں سے باتیں کرنے لگی ہے۔۔۔!''

''آسمانوں۔۔۔کا۔۔۔وہی مطلب ہے۔۔۔نا۔۔۔جو میں سمجھ رہا ہوں۔۔۔!''

''شاید۔۔۔!''

''شاید کہہ کر۔۔۔میرے یقین کو۔۔۔متزلزل کر دیا۔۔۔تم نے۔۔۔!''

''اب میں۔۔۔تمہیں کیسے بتلاؤں۔۔۔؟''

''جیسے مرضی۔۔۔بتلاؤ۔۔۔بتلانا۔۔۔تو۔۔۔پڑے گا ہی۔۔۔!''

''یوں سمجھ لو۔۔۔!''(کہتے کہتے رک جاتے ہیں)

''کیا سمجھ لوں۔۔۔؟''

''یہ ہی۔۔۔کہ۔۔۔!''(بات نامکمل رہ جاتی ہے)

''آج سے پہلے۔۔۔میں نے۔۔۔تمہیں۔۔۔اس قدر۔۔۔پریشان نہیں دیکھا۔۔۔!''

''میرے کہنے کا۔۔۔مقصد یہ ہے۔۔۔کہ۔۔۔آ۔۔۔آج۔۔۔آج کے۔۔۔دور کا۔۔۔سب سے بڑا۔۔۔عوامی۔۔۔را۔۔۔را۔۔۔راہنما۔۔۔؟؟؟

بستی ہو فقیروں کی کہ عشرت گہہِ کسریٰ
بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں سب کے لیے ہے

(مصطفےٰ زیدی)

ایس ایم ایس

دنیا کا پہلا SMS تین دسمبر 1992 کو بھیجا گیا۔ یہ 22 سالہ ٹیسٹ انجینئر نیل پیپ ورتھ Neil Papworth نے کمپیوٹر پر ''merry Christmas'' ٹائپ کر کے ووڈافون کے ڈائریکٹر رچرڈ جاروِس Richard Jarvis کے سیل فون پر بھیجا تھا جو اس وقت ایک پارٹی میں تھے۔

جگت بازی

جگت بازی، فقرے چست کرنے اور بات سے بات پیدا کرنے میں اخلاق احمد دہلوی صاحب کا کوئی جواب نہ تھا۔

ایک دن اقبال بانو نے پوچھا:

''سنا ہے کہ آپ دہریے ہیں؟''

''بھئی ہم تو مادہ پرست ہیں''۔

اخلاق صاحب نے مادہ کو تشدید کے بغیر جنس کے مفہوم میں کہا اور اقبال بانو سمیت تمام محفل کشت زعفران بن گئی۔

"رفعت العرعیر مرحبا"

خوبصورت داستان

رفعت العرعیر
(غزہ)
(۲۳۔ستمبر۱۹۷۹ءتا۷۔دسمبر۲۰۲۳ء)

اگر میں مرجاؤں
تو تم زندہ رہنا
میری کہانی دنیا کو بتانے کے لئے
میری چیزیں بیچنے کے لئے
میرے کفن کا کپڑا خریدنے کے لئے
اور کچھ ڈور بھی
پھر اسے سفید بنانا اور دم دار بھی
تا کہ غزہ میں کوئی بچہ آسمان پر
اپنے بابا کی اس جنت کو تلاش کرتا ہوا سے دیکھے
جو اچانک بڑھکتے شعلوں کی زد میں آ کر جنت سدھار چکا ہے
اپنے پیارے بچّوں کو الوداع کئے بغیر
اپنے گوشت پوست سے بھی بے خبر ہو کر
اپنی ذات کو بھی بنا کچھ کہے
جب وہ بچہ میرے کفن کو دیکھے تو اسے ایک پتنگ نظر آئے
وہ پتنگ جو آپ نے میرا بنایا ہوگا
تو وہ
کچھ دیر کے لئے سوچے کہ ضرور یہ کوئی فرشتہ ہے جو اس سرزمین پر دوبارہ
محبّتیں لوٹانے آیا ہے
اگر میں مارا جاؤں تو اسے امید بخش بنانا
اسے ایک خوبصورت داستان بنانا

(فلسطینی شاعر رفعت العریر کی آخری نظم)

اومیکرن

ولی عالم شاہین
(کناڈا)

اتنے سارے لوگ مرتے جا رہے ہیں
سوگ کس کس کا منائیں
ایک اپنا چل بسا کل
دل میں کیوں یہ کرچیاں سی گڑ گئی ہیں
بھیڑ میں
یہ ایک کالے ایک بوڑھے
اور کسی ہسپانوی بیوہ کا دکھ
دیکھا ہے کس نے
دو برس عمریں سبھوں کی گھٹ گئی ہیں
دوست اور ہم کار
جانے اور انجانے گھرانے
اپنی اپنی ذات، محسوسات سے پوشیدہ
اپنے ماجرائے غم کے پُر اسرار کرداروں سے عاجز
اپنی تنہائی کی بیرونی وباؤں کے قتیل
کون ایسے میں کسی بیمار کی تیمارداری
کا خیال اپنی کسی گٹھری میں ڈالے
کس طرح اومیکرن
کی بے صدا یلغار سے بچتے ہوئے
اپنے قدم آگے بڑھا لے
کن نقابوں کے تلے چہرہ چھپا لے

○

جنگجوقوم کے باشندے

ڈاکٹر پرویز شہریار
(نئی دہلی)

ہم جنگجوقوم کے باشندے
مرنے سے نہیں ہم ڈرتے ہیں
جنگ میں جب بھی اترتے ہیں
کفن سر پر باندھ کے چلتے ہیں
ہم جس سے محبت کرتے ہیں
اس کی خاطر ہم
جان سے بھی اپنی گزرتے ہیں
ہاں! دشمنوں کے لیے لیکن ہم
موت کا پروانہ بنتے ہیں
ہم جنگجوقوم کے باشندے
مرنے سے نہیں ہم ڈرتے ہیں
تم خاک میں ملادو لیکن ہم
اس خاک سے نکل کر تم کو بھی
موت کے گھاٹ اتاریں گے
تم آگ لگادو لیکن ہم
اس آگ سے نکل کر تم کو بھی
طوفان کے حوالے کردیں گے
تم خون سے نہلا دو لیکن ہم
اس خون کو دھو کر تم کو بھی
فولاد سا پگھلا دیں گے
ہم جنگجوقوم کے باشندے
مرنے سے نہیں ہم ڈرتے ہیں
حق کی طاقت ہے ساتھ ہمارے
باطل کو مٹا کر رکھ دیں گے
ایماں کی دولت ہے ساتھ ہمارے
مکاروں کو ننگا کردیں گے
مرد شجاع ہیں ساتھ ہمارے
بزدلوں کو مزہ چکھادیں گے
ہم جنگجوقوم کے باشندے
مرنے سے نہیں ہم ڈرتے ہیں
تری فوج میں کتنی طاقت ہے
تری سیاست نہیں یہ حماقت ہے
تجھے زندہ درگور ہم کردیں گے
ترا زعم مٹا کر رکھ دیں گے
تجھے خاک میں ملا کر رکھ دیں گے
تو نے گر ترچھی نظروں سے پھر دیکھا
تری نظروں کو جھکا کے رکھ دیں گے
ہم جنگجوقوم کے باشندے
مرنے سے نہیں ہم ڈرتے ہیں
جو کہہ دیا سو وہ کر بھی دیا
جو معاف کیا تو درگزر بھی کیا
لیکن ہم سے جو کرے گا دغا بازی
اسے نیست و نابود کردیں گے
ہم جنگجوقوم کے باشندے
مرنے سے نہیں ہم ڈرتے ہیں

○

جمود

فیصل عظیم
(کینیڈا)

وہ کون سی ڈگر ہے جس پہ زندگی سفر میں ہے
مسافرِ ازل نجانے کب سے اپنے گھر میں ہے
یہ آسمان وقت کے پڑاؤ کا نشان ہے
ہمیں تو کائنات کے جمود کا گمان ہے
وہی ہیں آفتاب کی تپش سے سوختہ بدن
وہی پہاڑ جیسے دن کا ریشہ ریشہ پیرہن
وہی ہے اب بھی تیشہ گر ازل سے اک عذاب میں
وہی ہے جوئے شیر کا سوال بھی جواب میں
وہی ہیں اونچ نیچ کی اضافتیں سماج میں
وہی ہے روشنی کی جنگ ظلمتوں کے راج میں
وہی دیے کی کشمکش، وہی ہوا کا مسئلہ
وہی ہے اک ضعیف قوم کی بقا کا مسئلہ
وہی ہے کوزہ گر کا آندھیوں سے ٹوٹتا مکاں
وہی مفکّروں کے سر ہتھیلیوں کے درمیاں
وہی ہے فن کا دیوتا، شکستہ خواب کی طرح
وہ ظلمتوں کے درمیان ماہتاب کی طرح
وہ نیند اور خواب سب سپردِ شب کیے ہوئے
وہ رات رات بھر صدا کو جاں بلب کیے ہوئے
وہ ہانپتے ہوئے بدن تلاشِ روزگار میں
وہ اک ہجومِ بے کراں خداؤں کے حصار میں
وہی ازل سے جاری کشمکش ہے دن کی دھوپ میں
جہاں پہ اک جمود ہے ترقّیوں کے روپ میں

○

بے یار و مددگار فلسطینیوں کے نام

جبیں نازاں
(نئی دہلی)

خاموش ہیں سب آہ و بکا تک نہیں آتی
غزّہ کے اسیروں کی صدا تک نہیں آتی

ملبے سے نکلتی ہوئی بچی نے پکارا
قبروں میں پڑے، پھر بھی قضا تک نہیں آتی

اک بھائی نے بھائی سے کہا آخری جملہ
یوسف کے برادر کو، حیا تک نہیں آتی

سرگشتگی مت پوچھ ان آشفتہ سروں کی
مشتاقِ شہادت ہیں فنا تک نہیں آتی

بارود کی بُو اوڑھے ہیں مسموم فضائیں
تازہ کسی کھڑکی سے ہوا تک نہیں آتی

مظلوم بظاہر، تو بنے پھرتے ہیں قاتل
لعنت ہے، ندامت کی ادا تک نہیں آتی

نازاں کی تو بستی کو کیا خاک، جلا کر
پر آنچ ترے بندِ قبا تک نہیں آتی

○

مسلم حکمرانوں کے نام۔۔۔

گلفام صدیقی
(اورنگ آباد)

تجھ کو معلوم ہے کہ کتنا گناہوں میں ہے تُو؟
غلبہء دین صداقت کی نگاہوں میں ہے تُو
غیرتِ قوم تو رو رو کے یہ فریاد کرے
تیری عیاش مزاجی تجھے برباد کرے
چشمِ سر ہوتے ہوئے بھی تجھے اندھا کر دے
تجھ کو مغرب کی چکا چوند تو رسوا کر دے
تجھ کو معلوم ہے کچھ ارضِ فلسطیں کا بھی حال؟
سینکڑوں بچوں کے ہے خوں سے ہر اک گوشہ لال
تیرے ہونے کا بتا قوم کو حاصل بھی ہے کچھ؟
نرم کیا جذبۂ امت سے ترا دل بھی ہے کچھ؟
تو تو اک امن کا پیغام بنایا گیا تھا
تو نمائندۂ اسلام بنایا گیا تھا
لیکن افسوس ہے تو بزمِ رنگیں کا انساں
ایسے حالات میں کیا ہو گا کہیں کا انساں؟
مثلِ ماضی کے ترا حال بھی کر دے گی سزا
تیری خاطر بھی اب افلاک سے اترے گی سزا
عظمتِ حسن صداقت کا بھی شاہد کوئی
تیری محفل سے ہی نکلے گا مجاہد کوئی
حسنِ افلاک ہے کیا؟ حسن زمیں بھی ہوگا
غلبہء دین صداقت کا امیں بھی ہوگا!!
اس کے ہمراہ زمیں پر یہی امت ہوگی
طاقتِ عظمتِ ایماں کی جماعت ہوگی
اور قائم وہ کرے گا یہاں اللہ کا دین
سرخرو ہوگا یقیناً یہاں اللہ کا دین

○

طبعی موت مرنے کا خواب

مسعود قمر
(سویڈن)

بہت عرصے سے میں
اپنی نیند نہیں سو سکا
ایک دفعہ میں نے
جاگتے خواب میں زندگی کو دیکھا تھا
میں ایک دفعہ بھی
اپنی موت نہیں مر سکا
وہ عورت
ابھی آ کر مجھ سے لپٹ جائے گی
میں بھی اپنی نظم
اس کے گلے میں ڈال کر
اسے نوچنا شروع کر دوں گا
لان میں لگے سارے پودے
گوند کے درختوں میں تبدیل ہو گئے ہیں
بے نیند خواب کے جرمانے
کہاں تک ادا کروں
میں ہر رات
اس عورت کے ساتھ نیند کرتا ہوں
میں
ایک دفعہ طبعی موت بھی مرنا چاہتا ہوں

○

احمد علوی
(احمد آباد)

دعا

میں نے دعا کو ہاتھ اٹھائے ہیں پہلی بار
فرعون بڑھ گئے ہیں بہت نیل بھیج دے
ظالم یہودیوں سے نپٹ لے گا فلسطین
عربوں کے واسطے تو ابابیل بھیج دے

بے شرم

جنہیں ہے دعویٰ کہ تہذیب یافتہ ہیں ہم
جہاں میں رنگ انہیں کے غضب بدلتے ہیں
یہ شیر خواروں کا قاتل نہیں ہے دہشت گرد
کیا شرم گاہوں سے بے شرم اب نکلتے ہیں

نمازِ جنازہ

نمازِ جنازہ پڑھیں غائبانہ
کہ عربوں کے لاشوں سے گھر بھر گئے ہیں
بچے ہیں فلسطین میں چند زندہ
سنا ہے کہ سارے عرب مر گئے ہیں

شہادت

مجاہدین نے سمجھا ہے مولوی نے نہیں
مزا عجیب ہے یہ خون میں نہانے کا
ہوئی نصیب شہادت نصیب والوں کو
یہ راستہ ہے خدا کے قریب جانے کا

کون۔۔۔؟

ایران اور ترکی ہیں بیانوں کے بہادر
اب ان کے سوا اور زمانے میں بچا کون
عیسائی یہودی تو ازل سے رہے دشمن
قاتل ہے فلسطین کا عربوں کے سوا کون

جنگ باز ممالک

ہیں جو دنیا میں امن کے حامی
جنگ دنیا میں یہ کراتے ہیں
اسلحے تاکہ ان کے بکتے رہیں
سارے ملکوں کو یہ لڑاتے ہیں

قتلِ ہیرو شما ہے نام ان کے
یہ فلسطین میں بھی دکھتے ہیں
خونِ معصوم سے رنگ ہیں ہاتھ
پھر بھی یہ امن کے فرشتے ہیں

جنگ ان کے ضروری ہے
جنگ کرتی ہے ان کو مالا مال
امن ہو جائے اس جہاں میں اگر
سارے ہو جائیں دوستو کنگال

ایک امریکہ اور عرب سارے
ان کی عیاشیاں ہیں لاشوں پر
سر سے پا تک لہو میں ڈوبے ہیں
ہے معیشت تمام جنگوں پر

جن کے ہاتھوں میں امن کا پرچم
جان لیجے وہی درندے ہیں
ہوں سعودی عرب یا امریکہ
درحقیقت سبھی درندے ہیں

دہشت گرد

جارج اوبامہ نہ میکائیل دہشت گرد ہے
مار دو اس کو کہ اسماعیل دہشت گرد ہے
صرف یہ کچھ عورتوں بچوں پہ برستا ہے بم
کون کہتا ہے کہ اسرائیل دہشت گرد ہے

''حاضر اللہ سائیں''

نسیم سحر
(راولپنڈی)

ارشد ملک جیسے عزیز دوست اور راولپنڈی اسلام آباد کی ادبی محفلوں کی رونق کی پہچان ایک اچھے شاعر اور ایک عمدہ ناشر کی حیثیت سے تو گذشتہ کئی عشروں سے ہے، مگر جب اُس نے حج کا سفرنامہ لکھا تو اُسے پڑھ کر اُس کے اندر کئی تہوں میں چھپے ہوئے ایک صاحبِ ایمان، اللہ کے بندے اور عاشقِ رسولؐ سے ملاقات ہوئی۔ اس کے اس سفرنامے کو میں 'حج نامہ' اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ محض ایک سفرنامہ ہی نہیں، اور محض حج کے دنوں ہی کی کیفیات کی روداد نہیں، بلکہ اس کی، اس کی شریکِ حیات کی اور اُس کے اِردگرد کے ماحول کی کیفیاتی ترجمانی کرتی ہوئی ایک عرفانی اور روحانی روداد ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ 'حج نامہ' میں اُس نے بہت سے نامے اپنے اللہ کے نام، رسولِ کریمؐ کے نام انفرادی اور اجتماعی طور پر لکھے ہیں اور ان میں عقیدتی اور مناجاتی انداز کے علاوہ امتِ مسلمہ کا اور ارضِ وطن کا استغاثہ بھی پیش کیا ہے۔

ارشد ملک کی نثر نگاری کے اس حسن اور اپنے دل کی کیفیات کو سلیقے اور قرینے سے بیان کرنے کی یہ صلاحیت میرے علم میں پہلی بار آئی ہے اور اِس پر مَیں اسے جتنی بھی داد و تحسین سے نوازوں کم ہوگا کہ ان تمام کیفیات میں حرمین شریفین، دیگر مقاماتِ مقدسہ کا منظر نامہ بھی اُس نے اس کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اُس کی یہ نثر کہیں کہیں نثری نظم کی طرح مرصّع لگنے لگتی ہے۔

ارشد ملک کے اندر ہمیشہ سے ایک درویش صفت شخص چھپا ہوا تھا جو اس سفرنامے میں کئی جگہوں پر ظاہر ہو رہا ہے مثلاً ابتدائیہ میں ہی وہ لکھتا ہے ''سارا دن کتابوں سے باتیں کرنے کے بعد جب اکثر ڈھلتی ہوئی شام مجھے شاعری سے گلے ملنے پر اکساتی ہے تو میں چھوٹے سے سفر پر روانہ ہو جاتا ہوں، کمیٹی چوک سے نیشنل ٹی ہاؤس۔ دوستوں کو کیا خبر کہ ان تک پہنچنے سے پہلے مجھے بہت سی روحوں سے باتیں کرنی پڑتی ہیں، راستے میں موجود قبرستان اور ''بابا شاہجہان'' کے مزار سے اٹھنے والی ہوائیں میرے وجدان پر دستک دیتی ہیں اور ابدی زندگی کے بارے میں بتاتی ہیں''۔ اس نے اپنے اور کچھ احباب کے خوابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں انہیں بتایا گیا کہ ارشد تو حج پر گیا ہوا ہے۔ ایسے خواب اسے حج پر جانے سے بہت پہلے دکھائی دیتے تھے جن میں وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوتا ہے اور جن کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ''وہ منظر، وہ خوشبو، وہ روشنی، مَیں جاگنے کے بعد بھی کئی سال تک محسوس کرتا رہا''۔ یقیناً جب وہ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا تو اُسے یہ منظر، یہ خوشبو اور یہ روشنی نامانوس نہیں لگی ہوگی۔ اور خوابوں کے حوالے سے اس نے یہ حدیث بڑے عجز سے بیان کی ہے جس میں آقاؐ کا فرمانِ عالی شان ہے کہ ''سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے''۔

کمال یہ کہ اس کتاب میں اُس نے کئی جگہ یہ اعتراف کیا ہے کہ اُس نے حج کا سفر اپنی بیوی کے اصرار پر اختیار کیا۔ لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ ارشد ملک کو اصل میں بُلاوا اُدھر ہی سے آیا تھا اور اپنی شریکِ حیات کے توسّط سے آیا تھا، اس کا یہ حج کا سفر کوئی جبری نہیں، اختیاری سفر تھا اور اس حج نامے میں اس کی کیفیات کچھ ایسی ہیں کہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ اُسے وہاں بلایا گیا تھا، طلب کیا گیا تھا، بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کسی بندے کو براہِ راست بلانا مناسب نہیں سمجھتے تو کسی دوسرے وسیلے سے اسے بلایا جاتا ہے۔

اس کی کتاب کا انتساب ملاحظہ ہو جو اس کے محبِ رسولؐ ہونے کے علاوہ اس کی والدہ محترمہ مرحومہ کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے: ''معلّمِ اعظمؐ کے نام، انتساب (۲): اس روح کے نام جس نے میری والدہ کے بدن میں اس وقت تک قیام کیا جب تک اس سفرنامے کی آخری سطر پر اس کی ساعتوں نے خوشی ثبت نہیں کی۔''

ارشد ملک نے حج کے سفر پر جانے سے قبل کیا تیاریاں کی تھیں اس بارے میں معروف نعت گو شاعر شرف الدین شامی دیباچے میں قلم برداشتہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ارشد ملک اللہ سائیں کے روبرو پیش ہونے سے پہلے بھی اس کے حضور حاضر ہو چکا ہے اور ابھی تک حضوری کے دائرۃ الاثر میں ہے، وہ ایک ایڈونچر کرنے جا رہا تھا اس لیے اس نے پہلے ہی حرمین شریفین پر بہت سا معلوماتی مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اس سے پیشتر اس نے اس سفر کے بارے میں سنجیدگی سے کبھی نہیں سوچا، اسے شریکِ حیات کے مسلسل اصرار نے مکہ مدینہ کی سمت بکھرتے ہوئے راستوں کی طرف مائل کیا جو بیت اللہ کے انوارات سے پہلے بھی سرشار ہو چکی تھیں''

ایک اہم بات یہ ہے کہ ارشد ملک نے حج پر جانے سے پہلے ہی تیاری کی اور اس سفر کی روداد قلمبند کرنے کا خیال اسے روانہ ہونے سے قبل بھی تھا، اسی لیے وہ روزانہ کی بنیاد پر اپنے سفر کی کیفیات، محسوسات اور روحانی واردات کو قلمبند کرتا رہا جس نے بعد میں مزید صیقل ہو کر ایک حج نامے کی صورت اختیار کر لی۔ رسولؐ کو بجا طور پر معلمِ اعظم کا خطاب دیتے ہوئے اس نے ان کے ایک متعلم کی حیثیت سے اپنے قلم میں اجالے بھر کر اپنی نثر میں حرمین شریفین کی مناسبت سے بلیغ استعارے، اشارے، کنائے اور تلازمے برت کر اپنی مجز بیانی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مطالعے میں آنے والے بہت سے گذشتہ حج کے سفرناموں کے موازنے سے مَیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ ارشد ملک نے ایک جدا لہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس نے یہ سفرنامہ کچھ اتنی تفصیل سے اور مستند معلومات اکٹھی کرنے کے بعد لکھا کہ اس کی ضخامت کوئی آٹھ سو صفحات تک پہنچ گئی، مگر کئی سال تک اس مسودے پر نظرِ ثانی کرنے کے بعد اس نے اس کا جو فائنل مسودہ

اشاعت کے لیے تیار کیا اس کی کچھ رُوداد اُسی کی زبانی ملاحظہ ہو:

''میں نے آخری بار جب سفرنامے پر کام دوبارہ شروع کیا تو جو لکھتا اپنی والدہ کو سناتا۔ سنانے کے دوران اور سنانے کے بعد میں ان کے چہرے کے تاثرات بھی نوٹ کرتا۔ والدہ تو کبھی حوصلہ شکنی نہیں کرتیں مگر مجھے بڑا کام کرنے جانا تھا، اس لیے بار بار سوچنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے جس تحریر پر والدہ کی جانب سے شاباش ملتی اور والدہ جس تحریر کو سن کر زیادہ خوش ہوتیں اور بوریت بھی محسوس نہ کرتیں، میں اس تحریر پر ''گڈ'' کا نشان لگا کر اپنے آپ کو سو میں سے سو نمبر دے دیتا۔''

ایک منفرد لہجے کا شاعر ہونے کے ناتے اس نے اس سفرنامے میں بھی جا بجا اپنے خوبصورت غزلیہ اشعار اور نظمیں درج کی ہیں۔ اس کی یہ مختصر نظم ملاحظہ ہو جس میں وہ اپنی کیفیات کا اظہار ایک دھمالی کیفیت میں کر رہا ہے:

یوں اپنی خاک پہ چل چل کر
ہم راہ میں تیری گرد ہوئے
پھر روح ہماری سبز ہوئی
پھر جسم ہمارے زرد ہوئے
ہم خاک نشینوں کے دم سے
آباد تری درگاہ پیا
ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا
پھر بھید کھلا اک دن ہم پر
اس دل میں کہیں موجود ہے تو
ہر دھڑکن تیری شاہد ہے
ہر دھڑکن کا مشہود ہے تو
آباد ہے تیرے جلووں سے
احساس کی یہ درگاہ پیا
ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا

ارشد ملک کا یہ سفرنامہ تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے نہیں بلکہ کیفیات کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے، ایک ہی باب میں وہ مکے میں بھی موجود ہوتا ہے اور مدینے میں بھی اور دیگر مقاماتِ مقدسہ پر بھی، دراصل وہ مقاماتی کے بجائے کیفیاتی اور عقیدتی تسلسل برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ اس کی تحریر کے کچھ ذیلی عنوانات بھی قابلِ ذکر اور تجسّس میں مبتلا کرنے والے ہیں جنہیں پڑھ کر کتاب کا وہ حصہ فوراً پڑھنے کی بے تابی جاگ اٹھتی ہے، مثلاً ہاتھیوں کے درمیان ایک مشاعرہ، میں جنت البقیع میں دفن ہو گیا، میں اُحد پہاڑ سے ہم کلام تھا، بنگالی بابوں کی باتیں اور تختی، تعمیری سپیڈ اور تخریبی سپیڈ، بغیر کنکریوں کے شیطان سے مقابلہ۔

ارشد ملک کے سفرنامے کا ایک خاص پہلو اُس کی زندہ دلی اور شگفتہ بیانی ہے۔ وہ کئی جگہوں پر اپنی عمدہ حس مزاح کا اظہار خوبصورت جملوں سے کرتا ہے اور اس کی یہ زندہ دلی کسی طور بھی شائستگی اور تہذیب کے دائرے سے باہر کا رُخ نہیں کرتی۔ مسجدِ جن میں داخل ہوتے ہوئے لکھتا ہے ''جب میں مسجدِ جن میں داخل ہوا تو مجھے جنات کا خیال بالکل بھی نہیں رہا۔ ویسے بھی عام بات مشہور ہے کہ شاعروں سے تو جناب بھی پناہ مانگتے ہیں''۔ ایک مقام پر رش کی جہ سے حادثے سے بال بال بچنے کے بعد لکھتا ہے: ''ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم بچ گئے اور شیطان کو سنگسار کرنے پہنچ گئے۔ اگر ہم بھی اس حادثے کا شکار ہو جاتے تو جنت میں مَیں اپنی بیگم کو کسی شہد کی ندی کے کنارے بیٹھ کر میر تقی میرؔ کا یہ مصرع سنا رہا ہوتا:

''مناسب تھا نہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا''

ارشد ملک کے اس حج نامے میں کئی جگہوں پر خود سے ہم کلامی کی اور کئی جگہوں پر خدائے بزرگ و برتر سے ہم کلامی پر مبنی خوبصورت عبارتیں اس حج نامے کی ادبی و تخلیقی تزئین میں اضافہ کر رہی ہیں۔

ارشد ملک کے اس سفرنامے کو اگر میں بھی قارئین کی طرف سے سو بٹا سو نمبر دوں تو قارئین یقیناً اس کی تردید نہیں کریں گے۔ آخری بات یہ کہ اس سفر نامے میں ارشد ملک کی والدہ اور شریکِ حیات کا کردار بھی اہم ہے۔ شریکِ حیات کے اصرار پر وہ حج پر گیا اور والدہ محترمہ کی پسندیدگی کے بعد اس نے اس سفرنامے کو اشاعت کے مرحلے سے گزار کر ہم سب کو اس میں کچھ یوں شریک کیا کہ گویا ہم نے بھی اس کے ساتھ نہ صرف حج کر لیا، حرمین شریفین اور دیگر مقدس مقامات کی زیارت کر لی، بلکہ ان تمام مقامات کی تاریخی حیثیت سے بھی آگاہ ہو گئے۔ چنانچہ ارشد ملک کو مبارک دینا تو بنتا ہے نا۔ مجھے خود بھی زندگی میں حج کی سعادت کئی بار حاصل ہوئی ہے مگر ارشد ملک کا حج نامہ پڑھ کر میں نے جو کیفیاتی اور تصوراتی حج کا روحانی تجربہ گھر بیٹھے کر لیا، میرا یقینِ کامل ہے کہ اُس کا ثواب اور اجر بھی میرے ساتھ ساتھ ارشد ملک کو بھی پہنچے گا۔

اس حج نامے کا اختتام جس تحریر پر ہوتا ہے اس کا مختصر اقتباس دیئے بغیر شاید میرا یہ اظہاریہ نامکمل رہے گا کہ اس میں ارشد ملک کی حج کے بعد کی کیفیات کا ذکر ایک عجیب مجذوبی انداز میں ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''(کمیٹی چوک سے نیشنل ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے) میرے راستے میں ''بابا شاہ جہان'' کا مزار اور وسیع قبرستان بھی آتا ہے جسے میں حج سے پہلے بھی غور سے دیکھا کرتا تھا اور قبروں سے باتیں کیا کرتا تھا، اور حج کے بعد بھی غور سے دیکھا کرتا ہوں اور قبرستان سے باتیں کرتا ہوں۔ مجھے آج بھی جنت البقیع کی خوشبو یاد آتی ہے۔ میں وہی ارشد ملک ہوں جو وہاں دفن ہو چکا تھا، میں بے شمار قبروں میں اپنی قبر تلاش کر رہا ہوں، مجھے قبرستان سے کوئی مانوس سی آواز آتی ہے۔ یہ آواز کسی روح کی ہے۔۔ شاید میری روح کی''۔

خدائے بزرگ و برتر ارشد ملک کو طویل زندگی دے کہ وہ تخلیقی کائنات میں یونہی مزید زرخیزیاں بھرتا رہے۔ آمین۔

خُنثیٰ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

اظہر حسین
(صوابی)

ادب اور نفسیات ایک دوسرے سے مختلف علم ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ادب انسان اور انسانی زندگی کے اُتھار چڑھاؤ سے عبارت ہے جبکہ نفسیات انسان کے کردار، رُوح اور ذہن کا مطالعہ ماحول اور سماج کے تناظر میں کرتا ہے۔لہذا جب ایک ناول نگار ناول تخلیق کرتا ہے تو شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کے ہر ایک سطر اور ہر ایک مکالمے کے پیچھے نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔یہ نفسیاتی عوامل مَحبت، نفرت، اوڈی پس کمپلیکس، نرگسیت، نمائشیت، انا، ضِد، اِنتقام، احساسِ کمتری و برتری وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ناول نگار جب ان عوامل سے گزرتے ہوئے ناول تخلیق کرتا ہے تو اس کے کرداروں کی حرکات وسکنات، گفتگو، افعال، شخصیت، کردار اور حتیٰ کہ خاموشی سے ان کے نفسیاتی کیفیات سامنے آتے ہیں۔نفسیات جہاں ان کرداروں کے انفرادی افعال و اعمال کو سامنے لاتی ہے وہاں ان کے ذریعے پورے معاشرے کی اجتماعی نفسیات کو بھی نشان زد کرتی ہے۔رخشندہ شہناز علمِ نفسیات کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''نفسیات(Psychology)دو یونانی الفاظ psycho اور logus کا مجموعہ ہے۔ psycho کا مطلب روح، ذہن، ذات اور logus کا مطلب ہے علم یعنی جاننا، گویا نفسیات کا مطلب روح کا علم، ذہن کا علم اور ذات کا علم ہے۔''(۱)

یعنی نفسیات انسانی محسوساتی نظام اور روح کے متعلقات کا وہ علم ہے جو انسان کے کردار اور ذہن کا مطالعہ اس کے ماحول کے پسِ منظر میں کرتا ہے۔نفسیات کے ڈانڈے زندگی کے ساتھ ہمیشہ مربوط رہے ہیں۔یونانی فلسفیوں کا نظریہ تھا کہ انسان کی تخلیق روح اور جسم کے آمیزش سے ہوئی ہے، مگر تخلیق کے اس مرحلے میں روح کو جسم پر فوقیت دی گئی ہے۔اس فوقیت کی وجہ یہ ہے کہ روح انسانی جسم، ذہن اور اس کے حرکات کو کنٹرول کرتی ہے۔روح انسانی جسم اور ذہن سے جو کام لینا چاہتی ہے، لیتی ہے۔اس کی اجازت کے بغیر جسم اور ذہن بذاتِ خود کچھ نہیں کرسکتا۔جب انسانی روح جسم سے علیحدہ ہوجاتی ہے تو جسم کے حرکت وعمل کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے اور کسی کام کے لائق نہیں رہتا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان ہر عمل روح کے حُکم پر کرتا ہے۔رینو بہل نے ناول کے مرکزی کردار شیکھر/شیکھا کے ذریعے جسم و روح اور ظاہر و باطن کی اصلیت دِکھائی ہے کہ انسان کی اصلی پہچان جسم یا ظاہری ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ روح یا باطن ہے۔وہ روح کو جسم پر فوقیت دیتی ہے۔دنیا والے انسان کو ظاہری پیمانوں پر تولتے ہیں حالانکہ انسان کی اصل پہچان اس کی روح ہے۔ناول میں شیکھا کہتی ہے:

''آج شیکھا وجود میں آئی تھی اور میں جانتی تھی کہ ایک روز شیکھر دھیرے دھیرے ختم ہوجائیگا اور صرف شیکھا کا وجود ہی زندہ رہے گا کیوں کہ شیکھا ہی اس جسم کی پہچان ہے۔جسم تو فانی ہے روح امر ہے۔جسم مرد اور روح عورت کی۔اس روح کو زندہ رہنا ہے۔''(۲)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو جنسوں (مرد اور عورت) کے جوڑے کی شکل میں پیدا کیا ہے۔مگر تخلیق کے اس کٹھن مرحلے میں ایک ایسی جنس بھی پیدا ہوجاتی ہے جس کا جسم مرد کا تو روح عورت کی ہوتی ہے یا جسم عورت کی تو روح مرد کا ہوتا ہے۔شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس کے جسم و روح کے مابین ایک تشویش اور کشمکش شروع ہوجاتی ہے جس کا خاتمہ اس کی موت پر ہوتا ہے۔ڈاکٹر رینو بہل کا ناول "میرے ہونے میں کیا برائی ہے" ایک نفسیاتی ناول ہے۔اردو ناول کی روایت میں یہ ناول اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھوتا اور منفرد ہے۔ناول کا مرکزی کردار متوسط ہندو گھرانے سے تعلق رکھنے والا ''شیکھر'' ہے۔شیکھر پیدائشی خُنثیٰ (جسے عرفِ عام میں مُخنّث، ہیجڑا، چھکّا، اُردھ ناری، تیسری جنس، خواجہ سرا اور کُھسر اوغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔) ہوتا ہے۔جب سات آٹھ سال کی عمر میں اس کے جسم و روح اور ظاہری حرکات وسکنات میں خُنثیٰ کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوجاتے ہیں، اسکول کے پروگرام میں اس کے ناچ گانے اور خُنثیٰ افراد کیساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی بدولت باپ اُسے سبھی رشتوں سے عاق کرکے گھر سے نکال دیتا ہے۔شیکھر اپنی خُنثیٰ دوست "ستارہ" کے توسط سے خُنثیٰ طبقے کے ڈیرے پر چلا جاتا ہے۔وہاں "گُرو" اس کا نام "شیکھا" رکھتا ہے۔گُرو کی خُنثیٰ طبقے میں سواگت کے بعد شیکھا خُنثیٰ کی زندگی اپنا کر مشکلات، مصائب اور آزمائشوں میں زندگی گزارتی ہوئی سماج اور خُنثیٰ طبقے کو اس دلدل سے نکالنے کی جدوجہد شروع کرتی ہے جس کی کامیابی پر ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ڈاکٹر رینو بہل نے شیکھر/شیکھا کی انفرادی اور اِجتماعی زندگی، شعور کی آنکھ کھولتے ہی زندگی میں پیش آنے والے مشکلات، نفسیاتی اُلجھنوں، جذبات و احساسات، معاشی ضروریات، جنسیاتی مسائل، جسم و رُوح کے مابین کشمکش، اُن کے ساتھ سماج میں رُونما ہونے والے دردناک رویّوں اور خُنثیٰ طبقے کے ہر غمی خوشی کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔

خُنثیٰ کے نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلا نفسیاتی عنصر سگمنڈ فرائڈ کا اوڈی پس کمپلیکس سامنے آتا ہے۔سگمنڈ فرائڈ کے اوڈی پس کمپلیکس کے مطابق بچپن میں بچہ جب اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے تو وہ ماں کی محبت کو صرف اپنے لیے مخصوص سمجھتا ہے۔مگر جب اسے پتا چلتا ہے کہ ماں اس کے باپ کو بھی چاہتی ہے تو وہ باپ کو رقیب سمجھ کر اس سے جلنے لگتا ہے اور یہ رقابت اس وقت مزید شدت اختیار کرجاتی ہے جب شرارت کرنے پر باپ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر تُو اس شرارت سے باز نہ آیا تو تیرا عضو تناسل کاٹ دوں گا۔جب وہ

گھر میں اتفاقاً اپنی ماں یا دوسری عورتوں کو عُریاں حالت میں دیکھتا ہے تو اس کو باپ کی دھمکی یاد آجاتی ہے اور سوچتا ہے کہ شرارت کرنے پر ان عورتوں کو بھی عضوِ تناسل سے محروم ہونا پڑا تھا اس لیے وہ باپ سے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اس نے میری ماں کو مجھ سے چھین لیا تھا اور اب میرا عضو لینے کے در پے ہے۔ فرائڈ نے اسی کیفیت کو اوڈی پس کمپلیکس کا نام دیا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر ساجدہ زیدی رقم طراز ہیں:

''فرائڈ نے اوڈی پس کمپلیکس کی اصطلاح دراصل لڑکوں کی ماں سے محبت اور وابستگی اور باپ سے مخاصمت اور عداوت کیلئے استعمال کی ہے اور لڑکیوں کی باپ سے وابستگی و محبت اور ماں سے عداوت و رشک کو Complex Electra کا نام دیا ہے۔''(۳)

ناول کا مرکزی کردار "شیکھر" اوڈی پس کمپلیکس کے جذبے سے مغلوب دکھائی دیتا ہے۔ بچپن سے لیکر خُنثیٰ کی زندگی گزارنے تک وہ باپ کے بجائے ماں سے زیادہ محبت کرتا ہے اور ماں بھی اس کو زیادہ چاہتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف باپ اسے ماں کی طرح نہیں چاہتا۔ جب شیکھر کی بڑی بہن رُکمنی دیدی کے تین سال بعد بڑی منّتوں مرادوں سے پیدا ہوتا ہے تو گھر میں جشن کا سماں ہوتا ہے۔ بچپن کے ابتدائی چار سال امّاں کی محبت اور لاڈ میں گزارتا ہے مگر چھوٹے بھائی للّت کی پیدائش پر اس کا وہ مقام کم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے اپنی محبت کے جذبے سے متعلق ناول میں کہتا ہے:

''رات کو چپکے سے امّاں کے بستر پر جاتا اور اُسے (چھوٹے بھائی للّت) پیچھے کرکے خود امّاں کیساتھ لپٹ کر سو جاتا۔ امّاں نیند میں بھی میری لمس کو پہچان جاتی اور بند آنکھوں میں ہی للّت اور دوسری طرف مجھے لپٹا کر اپنی بانہوں کے حصار میں سُلاتی۔ امّاں کی بانہوں میں آتے ہی میں پریوں کے دیس میں پہنچ جاتا۔''(۴)

اس اقتباس سے شیکھر کی ماں کے ساتھ گہری محبت سامنے آتی ہے۔ شیکھر نے ناول میں ابّا کیساتھ اپنی اٹوٹ محبت سے متعلق کوئی بات نہیں کہی ہے۔ بلکہ جب اس کے خُنثیٰ ہونے کے بارے میں انکشافات بڑھتے ہیں تو امّاں اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے جبکہ ابّا شیکھر سے بات کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ شیکھر کی خُنثیٰ طبقے کے ڈیرے پر جانے سے اس کی ماں ہمیشہ کے لیے بیمار ہو جاتی ہے مگر شیکھر سے بات کرنا نہیں چھوڑتی، ہر وقت اس کے آنے کی راہ تکتی جبکہ دوسری طرف ابّا شیکھر کا نام لینا پسند نہیں کرتے۔ خُنثیٰ طبقے کے ڈیرے پر رہتے ہوئے شیکھر کو بابا کی اتنی یاد نہیں آتی جتنی امّاں کی آتی ہے۔ اُس نے جتنی بار گھر آنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس کا مقصد ماں سے ملاقات ہے نہ کہ بابا سے، کیوں کہ وہ بابا کے قہر و غضب سے ڈرتی ہے۔ جب وہ ماں کا احوال پوچھنے ہسپتال آتا ہے تو بابا بغیر ملاقات کے اُسے دروازے سے واپس رخصت کر دیتے ہیں۔ سالوں سال خُنثیٰ افراد کے ڈیرے پر رہنے کے باوجود اسے کبھی باپ کی یاد نہیں ستاتی۔ وہ جب بھی اپنوں کے متعلق سوچتا ہے تو اس میں سرِ فہرست ماں ہوتی ہے۔ ناول کے آخر میں جب ماں سے ملنے کا مصمّم ارادہ کر لیتا ہے تو ماں بیٹے کی محبت مثالی بن جاتی ہے اور ماں کیساتھ اُس کی محبت سے ہمیں شیکھر اور ماں کی اوڈی پس کمپلیکس کا تعلق سامنے آتا ہے:

''امّاں کے پاس بستر پر بیٹھتے ہی میں نے غور سے اُن کا چہرہ دیکھا، زرد کمزور، جُھریوں اور درد سے بھرا چہرہ میری اُس امّاں کا تھا جو ہر وقت کِھلا رہتا تھا۔۔۔ ڈرتے ڈرتے اُن کا کمزور ہاتھ میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور چوم لیا۔ مُجھ پر نظر پڑتے ہی اُنہوں نے زور لگا کر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ میں اس سے زیادہ ضبط نہ کر سکا اور بچوں کی طرح اُن کے سینے سے لپٹ کر رونے لگا۔ امّاں کا کانپتا لرزتا کمزور ہاتھ اُٹھا اور میرے سر کو سہلانے لگا۔ سارے جہان کی خوشیاں اُس پل سمٹ کر امّاں کے آنچل میں آگئی تھیں جو میری بے سکون روح کو قرار بخش رہی تھی میری تشنگی کو شرابور کر رہی تھی۔ میرا وجود امّاں کی ممتا میں بھیگنے لگا اور پل بھر میں ایسا محسوس ہوا کہ میرا بچپن لوٹ آیا ہو۔''(۵)

ناول کا دوسرا خُنثیٰ اور ثانوی کردار نُورا/ستارہ بھی اوڈی پس کمپلیکس کا شکار ہوتا ہے۔ بچپن میں نورا کو اپنی ماں سے گہری محبت ہوتی ہے۔ اس کے بھائیوں کی غیر سنجیدگی سے ماں پریشانی ہوتی ہے جس کی پریشانی کو دیکھ کر نورا گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتا ہے اور ماں بھی اسے بہت زیادہ چاہتی ہے۔ دوسری طرف ابّا کو نورا سے اس قدر محبت نہیں ہوتی۔ ماں ان کی حرکتوں کی وجہ سے انھیں منع کرنے کے لیے ضرور پیٹتا ہے مگر گھر سے نکالے جانے کی دھمکی تک نہیں دیتی جبکہ ابّا اس کے حرکات سے تنگ آکر رات کی تاریکی میں اسے دھکے دیکر ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیتا ہے۔ نورا ناول میں اپنے ابّا کے متعلق کہتا ہے:

''ایک روز باپ نے تنگ آکر میری ہتھیلی پر سَو کا نوٹ رکھا اور کہا کہ ان کی نظروں سے، ان کی زندگی سے دُور چلا جاؤں۔ بھلا کوئی باپ اتنے چھوٹے بچے کو اس طرح دربدر بھٹکنے کو گھر سے نکال سکتا ہے؟ کبھی دیکھا ہے تم نے ایسا؟ میرے۔۔۔۔ میرے باپ نے نہ صرف نکل جانے کو کہا بلکہ دھکے دیکر گھر سے نکلوا دیا۔ بہت رویا بھی، فریاد بھی کی، گڑگڑایا بھی، یہ بھی کہا کہ رات کے اس پہر میں کہاں جاؤں گا؟ انہوں نے ایک ٹک جواب دیا" جدھرے تمہارے سینگھ سما جائے ادھر جاؤ۔ دنیا بہت بڑی ہے کہیں دور چلے جاؤ۔ بس دوبارہ ادھر کا رُخ مت کرنا۔'' میں نے بڑی امیدوں سے بے بس امی کو دیکھا جو چپ چاپ منہ میں آنچل ٹھونس کر روئے جا رہی تھی مگر ایک لفظ نہ بول سکیں۔(۶)

ان اقتباسات سے دونوں خُنثیٰ کرداروں کا اپنے والدین سے اوڈی پس کمپلیکس کا تعلق سامنے آتا ہے۔ والدین کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ چاہے ان کا بچہ کتنے ہی بدنامی اور شرمندگی کے افعال میں ملوث ہو جائے مگر وہ ڈانٹ ڈپٹ سے اسے دھمکا کر ان افعال سے باز رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور ان کی سابقہ غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ نورا اور شیکھر کی مائیں عین اسی طرح کرتی ہیں

جبکہ ان کے بابا سماج کے ڈر اور غیرت کی وجہ سے طیش میں آ کر اپنے معصوم بچوں کو گھر سے نکال کر سماجی بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اُن کی مائیں منہ میں آنچل ٹھونسے گم سُم کھڑی اپنی اور اپنے بچوں کی بے بسی کا نظارہ تو کرتی ہیں مگر انھیں روک نہیں سکتیں۔

خُنثیٰ کردار کا جائزہ لیتے ہوئے دوسرا نفسیاتی عنصر نرگسیت ہے۔ نرگسیت کو انگریزی زبان میں (Narcissism) کہا جاتا ہے جو (Narcissus) سے مشتق ہے جس کا ترجمہ فارسی میں نرگس کیا گیا ہے۔ یہ علمِ نفسیات کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس سے مراد کسی انسان کا خود پر فدا ہونا اور خود سے عشق کرنا ہے۔ یہاں اپنی ذات کا حسین ہونا اور خود سے عشق کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ یعنی نرگسیت کا شِکار انسان خود عاشق بھی ہوتا ہے اور معشوق بھی۔ ڈاکٹر ظہیر رحمتی "نرگسیت" کی اصطلاح سے متعلق رقم طراز ہیں:

''نرگسیت نفسیات کی اصطلاح ہے جو اُردو میں انگریزی زبان کے ذریعے رائج ہوئی۔ نفسیات کی اصطلاح میں نرگسیت خود پرستی اور خود پسندی کی کشمکش (Complex) سے عبارت ہے۔ جس میں فرد کی جنسی کشش کا محور خود اس کا جسم ہوتا ہے۔ اس کشمکش سے ہر آدمی دوچار ہوتا ہے۔''(۷)

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نرگسیت کا شکار انسان دوسروں سے نفرت کرتا ہے بلکہ وہ داخلی طور پر خود کو چاہتا ہے۔ کیرن ہارنی نرگسیت کو طبعی جذبے کے بجائے سماجی جذبہ قرار دیکر اس کی معنی میں ہمہ گیریت کے قائل ہے۔ وہ نرگسیت کے دائرہ کار میں خودداری، جذبہ محبوبیت، غرور، طلبِ جاہ، شدید فکرِ صحت، دوسروں سے کنارہ کشی، شکل و شباہت، ذہنی صلاحیت، تخلیقی خواہشات، تصوریت اور خودستائی شامل کرتے ہیں۔ ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' میں شیکھر کا کردار نرگسیت کے سانچوں سیاس طرح لبریز ہوا ہے کہ خُنثیٰ افراد کے فطرت کا ایک علامتی کردار بن گیا ہے۔ اسے خُنثیٰ طبقے کے افراد کی جذبات، صحت اور دیگر تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں فکر ہوتا ہے۔ اسے خود سے بھی انتہا درجے کی محبت ہوتی ہے۔ گھر میں والدین اور بہن بھائی کی غیر موجودگی میں ماں اور بہن کے کپڑے اور چوڑیاں پہنتا ہے، رُکمنی دیدی کی سُرخیاں اور سینڈل، اماں کا ناخن پالش اور لِپ اسٹک کیساتھ دیگر بناؤ سنگھار کی چیزیں اُٹھا کر خود کو سنگھار کر کے جب آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہے تو خود پر فدا ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ عکس حقیقت ہے اور میں (میرا وجود) سراپا جھوٹ ہوں:

''جب کبھی میں گھر میں اکیلا ہوتا تو کمرا بند کر کے میں اپنے دل میں چھپی خواہش کو چوری چھپے پوری ضرور کرتا۔ اماں کی الماری سے اُن کے کپڑے نکالتا۔ چولی پہن کر خود کو آئینے میں دیکھتا اور خواہش ہوتی کہ کسی طرح چھاتیوں میں اُبھار آ جائے۔ پھر بلاؤز ساڑھی، اونچی ایڑھی والی سینڈل پہن کر لچک لچک کر چلتا۔ اماں کی بندیاں، نیل پالش، لِپ اسٹک لگاتا خود کو آئینے میں نہارتا اور اپنے ہی عکس پر عاشق ہو جاتا۔''(۸)

اس اقتباس سے جہاں شیکھر کا اپنے ادھورے جسم کو پورے کرنے کی خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری طرف آئینے میں خود کو سنگار کر کے خود پر اس قدر فدا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا فطری وجود ہیچ لگتا ہے۔ وہ اپنے حسن کی وجہ سے ہر وقت خوش فہمی میں رہتا ہے اور اسی وجہ سے خُنثیٰ طبقے میں جانے کے بعد ان کی مقبولیت میں آئے روز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کے مشہور اور بڑے لوگوں سے تعلقات بن جاتے ہیں اور یہی تعلقات اسے زندگی کا مقصد حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو جاتے ہیں۔

خُنثیٰ کے نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے تیسرا نہایت اہم اور مغلوب جذبہ نمائشیت (Exhibitionism) کا سامنے آتا ہے۔ نمائشیت سے مراد کسی انسان کا خود کو بناؤ سنگھار کر کے یا ویسے ناز نخروں سے اپنے آپ کو دوسروں کی نظر کا مرکز و محور بنا کر پیش کرنا ہے۔ نمائشیت کا شکار انسان دوسروں کی توجہ سے لذت حاصل کرتا ہے۔ وہ خود کو ایک شے کی طور پر پیش کرتا ہے جس طرح کسی بازار میں تاجر نمائش کے تحت خوب صورت چیزوں کو سامنے رکھ کر لوگوں کو اپنے دکان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انسانوں میں خصوصاً عورتیں مردوں کے لئے پُرکشش بن کر اپنی نُمائشیت کا اظہار کرتی ہے۔ جدید دور میں مرد بھی نمائشیت کے جذبے سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی نمائشیت کی وضاحت اس طرح کرتی ہے:

''نمائشیت کے تحت انسان خود کو دوسروں کی نظروں کا مرکز بنا کر خوش ہوتا ہے۔ خودنمائی کے اس عمل میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ انفعالی لذت ہے یعنی خود کو معروض یا شے کی حیثیت سے دیکھنے کی لذت، عام زندگی میں اسے عورتوں کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔''(۹)

شیکھا سب کی جانب سے خود کو سراہے جانے کی خواہش مند ہے اس کے ساتھ ساتھ اپنے چاہنے والوں کے علاوہ دوسروں کے طلب گاروں کو بھی اپنی ذات میں محور دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ ایک بیوی کی طرح راشد کے سامنے خود کو بنا سنگھار کر پیش کرتی ہے تا کہ اس کا دل بہلا سکے۔ اس کی نظروں میں خود کو مقبول بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب تو ہو جاتی ہے مگر آدھی ادھوری عورت ہونے کی وجہ سے اس کی زندگی کا ساتھی نہیں بن سکتی۔ وہ اپنے اس ادھورے پن کا بیان ان الفاظ میں کرتی ہے:

''انہیں خاندان کا وارث چاہیے اور آدھی ادھوری عورتیں سینے میں ممتا کا جذبہ تو رکھ سکتی ہیں زرخیز کوکھ نہیں۔ چھاتیاں تو ہیں مگر خشک۔ مردانہ جسم میں عورت کی روح تو بستی ہے، عورت کا دل سینے میں دھڑکتا بھی ہے تڑپتا بھی ہے۔ ماں کی ممتا، شفقت سے دل شرابور بھی ہے مگر مصنوعی نطفہ سے ماں تو نہیں بن سکتی۔ رب کی اس ناانصافی کے ساتھ ہنس کر جینا بہت مشکل ہے۔''(۱۰)

نفسیات کے حوالے سے خُنثیٰ کا چوتھا پہلو تشویش (Anxiety) اور ٹینشن ہے۔ انسان کو تشویشی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس جذباتی عمل میں انسان کے اعصاب بُری طرح متاثر ہو جاتے

ہیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی تشویش (Anxiety) کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''تشویش، وحشت یا (Anxiety)، بعض لحاظ سے سب سے زیادہ تباہ کُن جذبہ ہے جس کی بنیاد خوف بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً سَر زَنش کا خوف، جگ ہنسائی (وہ چیز جس پر دُنیا ہنسے) کا خوف استہزا اور ماں باپ کی شفقت کھودینے کا خوف وغیرہ۔۔۔ تشویش ایک جاری وساری خوف ہے جس کا سبب فرد پر نہیں کُھلتا، وہ سمجھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں ہوا اور اس سے نجات کا راستہ کیا ہے؟ اس کے قوائے عمل معطّل ہونے لگتے ہیں۔'' ص: (۱۱)

سات آٹھ سال کی عمر میں شیکھر جب والدین کیساتھ دادا کے گھر شادی کے سلسلے میں گیا ہوتا ہے۔ وہاں اس کا ماموں اس کے اقوال وافعال سے متاثر ہوکر اسے کمرے میں پیر دبانے کے بہانے بُلا کر جنسی اختلاط کرتا ہے۔ اس کے بعد اسے بتاتا ہے کہ اگر اس نے کسی کو بتایا تو اس کی ماں کو جان سے مار ڈالے گا۔ لہٰذا اسی خوف کے اندر اُس کے ساتھ پورا ہفتہ مسلسل جنسی اختلاط کرتا ہے۔ سات سال کی عمر شیکھر کے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کی وجہ سے وہ خوف اور تشویش میں مبتلا ہوکر اس کے جسم وروح کے مابین ایک کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔ یہی تشویش اور ٹینشن شیکھا کی زندگی کیساتھ بچپن میں ہمسفر بن جاتی ہے۔ شیکھر کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''اُلجھن، کشمکش، حیرانی، بے چینی، بے سکونی کا پہلا بیج میرے دل ودماغ میں سات سال کی عمر میں پڑا جب ننھیال کی ایک شادی میں۔۔۔ ایک شام دور دراز کے بڑی عمر کے ماموں نے کمرے میں ٹانگیں دبوانے کے لیے بُلا لیا۔ میں بھی خوشی خوشی ان کی ٹانگوں پر ایسے چہل قدمی کر رہا تھا جیسے گھٹنے سے ٹخنے کی نہیں بلکہ کسی ڈھلان پر پھسل رہا ہوں۔ پھر نہ جانے اُنہیں کیا سوجھی کہ انھوں نے یکدم سے مجھے دبوچ لیا۔ میں چھٹپٹانے لگا۔ چلّانے لگا تو اُنہوں نے اپنے بڑے سے دہانہ میں میرا منہ بھر کر میری آواز بند کردی۔ میری سانس رُکنے لگی میری آواز میرے اندر ہی گھٹتی رہی اور پھر انہوں نے اپنا وجود مجھ میں پیوست کردیا۔ درد سے کراہتا رہا۔ میری آنکھیں برستی رہیں۔ میں اُن کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ نادان معصوم بچہ سمجھ ہی نہ سکا کہ کھیلتے کُودتے یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ پھر۔۔۔ ڈرایا دھمکایا کہ اگر میں نے کسی کو بھی بتایا تو میری امّاں کو بھی جان سے مار ڈالے گا۔۔۔ جتنے دن ننھیال میں رہے یہ سلسلہ چلتا رہا۔'' (۱۲)

اس سانحے کے بعد اسے کئی دن بُخار چڑھ جاتا ہے اور شادی کے تمام دن ڈر اور خوف میں گزار لیتا ہے۔ شیکھر اپنے جذبات چُھپانے کا ہنر سیکھ لیتا ہے۔ اس کی باتوں میں نزاکت اور نسوانیت کا عمل دخل شروع ہوجاتا ہے۔ اس کی گفتگو، حرکات وسکنات، چال چلن اور پسند ناپسند میں نسوانی پن آجاتا ہے۔ اسے کہیں بھی سکون نہیں ملتا۔ آخرکار ستارہ کے توسط سے خُنثیٰ افراد کے ڈیرے پر ہمیشہ کے لیے بسیرا کرلیتا ہے۔ شیکھر ناول میں ان تمام تکالیف کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے:

''گھر سے نکالے جانے کا غم، معاشرے کا بائیکاٹ، اپنوں کا مُنہ پھیر لینا، ذِلّت، غربت، بیروزگاری، جسم فروشی، چوری چکاری، چھینا جھپٹی یا پھر بھیک مانگنے کا راستہ، یہ سب برداشت کرنے کے لیے حوصلہ چاہیے اور جب یہ حوصلہ پست ہوجاتا ہے تو نشے میں خود کو غرق کرنا سب سے آسان راستہ نظر آتا ہے۔'' (۱۳)

تشویش کا یہ عمل ناول کے دوسرا خُنثیٰ کردار ستارہ کے ساتھ پوری زندگی جاری وساری رہتا ہے۔ وہ اپنی تشویش پر قابو پانے کے لیے بہت کوشش کرتی ہے مگر کسی بھی طور سے اس میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کو بھی شیکھر کی طرح جب گھر سے نکالا جاتا ہے تو خُنثیٰ افراد کے ڈیرے پر جاکر زندگی گزارنے لگتی ہے۔ والدین، گھر، خاندان اور اپنے اقدار سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کی وجہ سے اسے کہیں سکون نہیں ملتا۔ اس لیے وہ کچھ لمحے سکون کی زندگی گزارنے کے لیے شراب کا سہارا لیتی ہے مگر شراب اس کی زندگی کا جزوِ ناگزیر بن جاتا ہے اور آخرکار اس کی موت جسم میں شراب کی کثرت کی وجہ سے ہی ہوجاتی ہے۔ ناول میں کلپنا کے ذریعے جب شیکھا کو خبر ہوجاتی ہے کہ تھانے سے ایک مُردہ لاش ملنے کی خبر آئی ہے جس کے موبائل فون میں آخری نمبر کلپنا کا ہوتا ہے۔ تو دونوں ستارہ کے حوالے سے حیران و پریشان تھانے کی طرف چلنے لگتی ہیں۔ راستے میں شیکھا خود کلامی کرتے ہوئے کہتی ہے:

''کتنی بار سمجھایا اُسے دیر رات تک گھر سے باہر بے مقصد مت گھوما کر۔ شراب کے نشے میں نہ جانے کہاں کہاں ٹکریں مارتی رہتی ہے۔ انسان کے اندر کی بے چینی، بے سکونی، اُسے بھٹکنے پر مجبور کردیتی ہے پھر نہ جانے اس سکون کی تلاش میں وہ کن راستوں پر نکل پڑتا ہے۔'' (۱۴)

خُنثیٰ کی نفسیات کے حوالے پانچواں اہم عنصر الفریڈ ایڈلر کا نظریہ ''احساسِ کمتری'' ہے۔ الفریڈ ایڈلر کہتا ہے کہ پیدائش کے بعد بچہ دنیا کا کمزور ترین مخلوق ہوتا ہے۔ پیدائش سے لیکر بچپن تک اس کی جملہ ضروریات ماں کے ذریعے پوری ہوتی ہے۔ جب وہ تھوڑا کچھ سماج کا شعور رکھنے لگتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سماج کے دوسرے افراد کے مقابلے میں بہت کم زور، بے بس اور لاچار ہے۔ یہ ادراک اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کردیتا ہے جو تمام عمر اس کے ذہن پر سوار ہوتا ہے۔ الفریڈ ایڈلر کہتا ہے کہ پہلے پہل وہ گلی محلے میں کھیلتے کودتے ہوئے اپنے سے بڑے اور طاقت ور بچوں، اسکول میں استادوں، عہدِ بلوغت میں سماجی اداروں اور عملی زندگی میں دنیا کے کسی بھی شعبے میں جاکر اپنے سے خوب صورت، طاقتور، لمبے اور دولت مند افراد کو دیکھتا ہے تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوجاتا ہے اور یہی احساسِ کمتری اس کا دامن نہیں چھوڑتی۔ وہ اپنے احساسِ کمتری پر فوقیت پانے کے لیے ہر اچھے اور بُرے طریقے اختیار کرنا شروع کردیتا ہے جن سے اسے قوت کا احساس ہو۔ ڈاکٹر ساجدہ زیدی اس کے متعلق کہتی ہے:

''ایڈلر کا نمایاں کام یہ ہے کہ اس نے احساسِ کمتری سے پیدا شدہ رجحانِ برتری کو زندگی کا بنیادی مقصد اور رجحان قرار دیا۔ اس کا خیال ہے کہ تمام عمر فرد اسی کاوش میں رہتا ہے کہ یا تو فوقیت کے حقیقی جدوجہد کرے اور اپنے علم و عمل، کارناموں، اکتساب، تخلیق و تعمیر اور کارکردگی کے ذریعے خوش اسلوبی سے دنیا پر اپنی برتری ظاہر کرے اور خود کو اس تکلیف دہ احساسِ کمتری سے نجات دلائے جس کی موجودگی میں وہ سکون و اطمینان حاصل نہیں کرتا۔'' (۱۵)

شیکھر کو بچپن سے یہی احساسِ کم تری ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) خالق نے اس کیساتھ ناانصافی کر کے ایک نامکمل انسان کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ اس کا جسم مرد مگر روح عورت کی ہے۔ بچپن سے لیکر جوانی تک یہی احساسِ کمتری اس کی زندگی کا جزوِ ناگزیر بن جاتا ہے۔ وہ خود کو عورت سمجھتی ہے اور اپنی احساسِ کمتری پر برتری پانے کے لیے گھر کے افراد کی غیر موجودگی میں عورتوں جیسی ہار سنگار کر کے مَسرت محسوس کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ڈانس بار اور خُنثیٰ افراد کے ڈیرے پر جاتا ہے کیوں کہ اسے اپنی شخصیت کی تکمیل اسی میں محسوس ہوتی ہے۔ اسے یہ پتا ہوتا ہے کہ خُنثیٰ افراد کے ڈیرے پر جانے کی خبر جب میرے گھر والوں کو لگ جاتی ہے تو گھر میں کیا، اس سماج میں بھی میری جگہ نہیں ہے لیکن پھر وہ اس کی رجحانِ برتری اسے اسی طرف کھینچ لاتا ہے۔ ناول میں وہ اپنی احساسِ کمتری کے حوالے سے رقم طراز ہے:

''یہ میرے اندر کی کشمکش یہ گھٹن شاید میری زندگی کا اٹوٹ حصہ تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا خود کو بے چینی، کشمکش، بے سکونی، گھٹن میں مبتلا پایا۔ اس کی وجہ شاید میری دوہری شخصیت رہی ہوگی کیوں کہ میں ایک نامکمل انسان ہوں۔'' (۱۶)

وہ اپنے قبیلے والوں کو اس دلدل سے نکالنے، بہتر تعلیم و تربیت دینے اور مختلف ہنر سکھانے کے لیے ایک سینٹر بنانے کا ارادہ کر لیتی ہے تا کہ وہ بھی دنیا کا مقابلہ کر سکیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس کی زندگی میں مشہور فوٹو گرافر راشد آجاتا ہے جو اپنے دوسرے فوٹو گرافر دوست (جس کا سرکار میں اثر رسوخ ہوتا ہے) کی مدد سے شیکھا کے طبقے کے تمام مسائل ریکارڈ کر کے اور ان کے ڈیرے کی تصاویر لیکر دفتروں میں لے جانا شروع کرتے ہیں۔ دونوں کے دس مہینے کی مسلسل جدوجہد کے بعد سرکار کی طرف سے اسے ایک سینٹر کھولنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ راشد کی مدد سے ڈاکٹرز اور اساتذہ ان سے جُڑ جاتے ہیں۔ دن میں باقاعدگی سے تین گھنٹوں کے لیے ڈاکٹرز آتے ہیں اور ایڈز سمیت دیگر نامراد بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی احساسِ کم تری کو شکست دیکر فتح یاب ہو جاتی ہے۔

نفسیات کے حوالے سے خُنثیٰ کی شخصیت کا چھٹا اہم پہلو الفریڈ ایڈلر کا ''خاندانی پوزیشن'' ہے۔ الفریڈ ایڈلر نے کہا تھا کہ گھر میں سب سے بڑوں اور سب سے چھوٹے بچوں کے ساتھ اکثر یتی طور پر والدین کا لاڈ پیار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ درمیانی بچوں کیساتھ اتنا لاڈ پیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہی درمیانی بچے جو والدین کے لاڈ پیار سے زیادہ محظوظ نہیں ہوتے، دنیا کے مقابلے میں سب سے بڑوں اور سب سے چھوٹے بچوں کے مقابلے میں زیادہ محنتی، ہوشیار، جدوجہد کرنیوالے اور ہر طرح کے اچھے بُرے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنیکی ہمت اور طاقت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی ایڈلر کے "خاندانی پوزیشن" کے حوالے سے کہتی ہے:

''اکثر سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بچے جو والدین کے زیادہ لاڈلے ہوتے ہیں اتنی جدوجہد کرنے کے اہل نہیں ہوتے جتنے درمیانی بچے کا لاڈ پیار نہیں ہوتا، ایسے بچے زیادہ محنتی، دنیا کا مقابلہ کرنے میں زیادہ کامیاب اور خود کفیل ہوتے ہیں۔'' (۱۷)

ناول میں شیکھر والدین کا درمیانی بچہ ہوتا ہے جو سات آٹھ سال کی عمر میں جنسی و روحانی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات اور اقوال و افعال کی وجہ سے والدین پریشان رہتے ہیں۔ غرض اسی شخصی دوہرا پن اور تشویش کی وجہ سے والدین کی طرف سے شیکھر کو وہ محبت نہیں ملتی جو بڑی بہن رُکمنی دیدی اور چھوٹے بھائی للّت کو ملتی ہے۔ مگر اس کا شعوری حس بیدار ہوتا ہے۔ سات سال کی عمر سے لے کر بلوغت اور بیس سال کی عمر میں خُنثیٰ افراد کے ڈیرے پر گرو کے ہاں چیلا بن جاتا ہے۔ وہاں وہ خُنثیٰ افراد کی تباہ حال زندگیوں کو دیکھ کر سخت ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتی ہے اور دل میں مُصمم ارادہ کر لیتا ہے کہ میں اپنے طبقے کو ان رسومات کی قید اور اس تباہ حال زندگی سے نکال کر تعلیم و تدریس اور عملی کاموں کی طرف لاؤں گا۔ ناول میں اپنے اس ارادے سے متعلق کہتی ہے:

''رب سے سارے گِلے شکوے پَل میں دُور ہو جاتے اور شُکرانے کے لیے سجدے میں سر جُھک جاتا۔ چاہے اُس نے آدھی ادھوری، ذلت، نفرت، حقارت سے بھری زندگی دی مگر ساتھ میں اُسے بدلنے کی سوجھ بوجھ اور ہمت بھی تو دی۔ صدیوں سے چلتی آئی سوچ، روایت، نظام کو ایک روز میں تو نہیں بدلا جاسکتا اور نہ ہی ایک شخص انقلاب لاسکتا ہے۔'' (۱۸)

اپنی اس حساس طبیعت کی وجہ سے ایک طرف راشد اور اُس کے دوست کے توسط سے تعلیم و صحت کا سینٹر کھولنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو دوسری طرف اس کا خُنثیٰ افراد کے متعلق سماج کے قوانین کو بدلنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے خُنثیٰ ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ تو اس رب کا فیصلہ ہوتا ہے جس کے اشاروں پر کائنات چلتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو ہر صورت میں سماج پر قبول کرنیکی ٹھان لیتا ہے۔ ستارہ کی خودکشی کے بعد اس مقصد کی شروعات اپنے گھر سے کرتا ہے۔ آخر کار وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ماں کی توسط سے باپ کو راضی کر کے ہفتہ میں ایک بار گھر آنے کی اجازت لے لیتا ہے۔ اپنے ان مقاصد کی کامیابی کا بیان ناول کے آخر میں ان الفاظ میں کرتی ہے:

''اتوار کی شام امّاں سے ملاقات ہوتی تو پورے ہفتے مجھے جی توڑ

کام کرنیکی ہمت ملتی، میرے ساتھ بہت سے لوگ جُڑ گئے ہیں اب میں اکیلی نہیں ہوں۔اُن کی آنکھوں میں بھی خواب جھلملانے لگے ہیں۔۔۔شاید آج میری امّاں نے میری حقیقت قبول کرلی ہے کل کو دنیا کے سامنے بھی قبول کرلیگی ہوسکتا ہے دوسرے والدین بھی امّاں کی پیروی میں اپنی اولادوں کو اپنالیں۔دُنیا امید پہ قائم ہے۔''(۱۹)

خُنثٰی کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے جوساتواں اہم نفسیاتی عنصر سامنے آتا ہے وہ جذبیت(Ambivalence) ہے۔ جذبیت کے مطابق انسان میں دومتضاد جذبات یا مخالف قوتیں بیک وقت پائی جاتی ہے جن میں سے ہرایک جذبہ یا قوت اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔جس کے سبب وہ بے چین و بے سکون رہتا ہے۔شیکھا اور ستارہ بھی اس کیفیت سے دوچار ہوتی ہیں۔ان کی روح خُنثٰی طبقے کے ڈیرے پر رہنے کے خواہش مند ہوتیں ہیں جبکہ ماں کی محبت اور بچپن کے گلی کوچے اسے اپنے گھر کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ فیصلہ نہیں کرسکتیں کہ کون سا راستہ اختیار کریں اور جب خُنثٰی ڈیرے پر رہنے کا راستہ اختیار کرتی ہیں تو یہی جذبیت ساری عمر اس کی زندگی کا جزوِ ناگزیر بن جاتی ہیں جس کا مقابلہ کرتے ہوئے ستارہ اپنی جان کھودیتی ہے جبکہ شیکھا اس پر قابو پاکر سماج میں خود کو منوا کر اپنے لیے آبائی گھر کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

خُنثٰی افراد میں نفسیاتی اعتبار سے حساسیّت اور احساسِ دردمندی پائی جاتی ہے۔یہ حساسیّت اور اِحساسِ دردمندی شیکھا اور ستارہ کے کردار میں موجود ہوتی ہے۔وہ کسی پر ظلم نہیں کرتی، کسی کا حق نہیں مارتی، کسی سے بددعائیں نہیں لیتی، بلکہ اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے بدھائی کے لیے جاکر دو پیسہ کماتی ہیں۔ان کی فطرت میں بدکاری، حسد، جسم فروشی اور چھینا جھپٹی نہیں ہوتی ہیں بلکہ فطرتاً خوشی اور محبت دینے والے لوگ ہوتے ہیں۔ناول میں شیکھا کے اپنے پیشے سے متعلق سوال پر ستارہ کہتی ہے:

''ہم لوگوں سے ان کی حیثیت کے مطابق ہی تقاضا کرتے ہیں۔ہمارے پاس دعائیں دینے کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟ لوگ ہماری بددُعا سے ڈرتے ہیں اور اسی لیے جو بَن پڑتا ہے دے دیتے ہیں۔۔۔کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کہ کسی غریب کے گھر کچھ دینے کو نہیں تو ایک ٹکڑا گُڑ ہی کھا کر خوب دعائیں دی ہیں بلکہ دو تین مرتبہ تو دُلہن کو شگن بھی ڈال کر آئے ہیں۔ہم انسان ہیں لٹیرین نہیں۔''(۲۰)

ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' میں شیکھا اور ستارہ کے علاوہ دیگر ضمنی خُنثٰی کردار بھی پائے جاتے ہیں۔جن میں ادھیڑ عمر گُرو، کلپنا، پنچالی، سرلا، سوشیلا، بینا، شکیلا، روزی اور دیگر متعدد خُنثٰی کردار پائے جاتے ہیں جو ناول کے مجموعی پلاٹ کو منطقی ربط دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ناول میں ''گُرو'' کا کردار خُنثٰی افراد کے حوالے سے عظمت اور عزت وتکریم والا کردار ہے۔خُنثٰی ان کو ماں کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے ہر حکم کو سرآنکھوں پر پورا کرتے ہیں۔گُرو احساسِ دردمندی کے ساتھ ان کو اولاد کی طرح پالتی اور چاہتی ہے۔ناول میں ستارہ کے مرنے کے بعد اسے قبرستان لے جاتے وقت گُرو الوداع کرتے ہوئے کہتی ہے:

''رب تیرے سب گناہ اسی جنم میں بخش دے اور اگلے جنم میں تُو مکمل انسان بن کر زمین پر آئے۔''(۲۱)

یہ تمام خُنثٰی کردار اپنے طبقے کے نفسیاتی وسماجی مسائل، مخصوص اقدار، اصول وضوابط، رہائشی نظام، رسوم و رواج، ثقافت، علمی رجحان، معاملات، تعلیم وتعلُّم، مہمان نوازی، ہنرمندی، اخلاق وعادات، سوچ وفکر اور خُنثٰی طبقے سے جڑی متعدد سماجی شعریات کے آئینہ دار ہیں۔یہ چیلے اپنے گُرو کو ماں کا درجہ دیکر انہیں سب کچھ سمجھتے ہیں جن سے ایک فرمان بردار اور محبت کرنے والی اولاد کی مہک اُٹھتی ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل نے شیکھا اور ستارہ کے ذریعے پورے سماج کی نفسیات کو اُجاگر کیا ہے۔یہ موت ستارہ کی نہیں بلکہ ہندوستانی سماج کی موت ہے جس نے ایک کم سِن بچے کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اس کا تماشا کیا۔اس نے مشکل حالات میں جینے کی بھرپور کوشش کی لیکن ایک اکیلا انسان جس کو سماج انسان کی نظر سے بھی نہیں دیکھتا، ایسے حالات کا کتنا مقابلہ کرسکتا ہے۔یہ زوال اور المیہ صرف خُنثٰی افراد کا ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی سماج کا زوال اور المیہ ہے۔ناول میں ڈاکٹر رینو بہل کے قلم سے بیان کیے ہوئے شیکھا اور ستارہ کے تمام مسائل (نفسیاتی کشمکش، تعلیمی مسائل، گھروں سے بے دخلی، والدین سے دوری، عدم تحفظ، نشہ آوری، جسم فروشی، خونی رشتوں کے ناروا رویّے، تشدُّد، اور دیگر مسائل) اُن کے ذاتی مسائل ہوتے ہوئے ہندوستان میں رہنے والے تمام شیکھاؤں اور ستاراؤں کے مسائل ہیں۔ڈاکٹر رینو بہل نے شیکھا اور ستارہ کے ذریعے خُنثٰی کی زندگی کی بہت سی گتھیوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔

رینو بہل ناول میں ایک انسان دوست ادیب کے طور پر سامنے آتی ہے۔وہ انسان کو فرشتہ سیرت پیش کرتی ہے نہ شیطان صفت۔وہ اعتدال میں رہ کر جیتے جاگتے انسانوں سے ناول کے کردار اخذ کرتی ہیں۔ان کے ہاں والدین سایہ خدا بھی ہوتے ہیں اور قہرِ الٰہی بھی۔اگر ایک طرف شیکھا کا ابّا اس کی دوہری شناخت پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے تو دوسری طرف ستارہ کا والد تھوڑی سی بدنامی پر اسے اندھیری رات میں گھر سے نکال دیتا ہے۔ان کے ہاں انسان ہوس کا پجاری بن کر درندگی بھی اختیار کرتا ہے اور حضرتِ خضرؑ بن کر انسانیت کی خدمت بھی کرتا ہے۔اگر شیکھا کا ماموں ہوس کی آگ بجھانے کے لیے سات سال کی عمر میں اُن سے پورا ہفتہ جنسی اختلاط کرتا ہے تو دوسری طرف راشد، اس کا فوٹو گرافر دوست اور شیکھا سینے میں درد بھرے دل رکھ کر ہیجڑا افراد کے مسائل کم کرنے کے لیے صبح وشام محنت کرتے ہیں۔رینو بہل خُنثٰی طبقے کے تمام مسائل کا ذمہ دار صرف سماج کو نہیں ٹھہراتی بلکہ سماج کا روشن چہرہ بھی پیش کرتی ہیں۔

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصّہ

دھرمیندر

دیپک کنول
(ممبئی)

پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک اسکول ماسٹر رہا کرتا تھا جس کے گھر میں ایک بچے نے جنم لیا تھا۔ جب یہ بچہ دو سال کا ہوا تو وہ بڑی جیب وغریب حرکتیں کرنے لگا۔ اُس کی ماں جس گلاس میں اُسے دودھ پلاتی تھیں اُس پر کمپنی کا ایک لال رنگ کا نشان چھپا تھا۔ یہ بچہ جب دودھ پیتا تھا تو اُس لال رنگ کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا اور اُس لال نشان کو نہارتے نہارتے وہ سو جایا کرتا تھا۔ اُن کے پڑوس میں ایک کسان رہا کرتا تھا جس کے یہاں ایک دودھیلی گائے تھی۔ ایک دن یہ بچہ جب گھر سے باہر گیا تو اُس نے دیکھا کہ بچھڑا ماں کے تھن سے لگ کر دودھ پی رہا تھا کہ تبھی وہ کسان باہر آ گیا اور اُس نے بچھڑے کو گائے سے الگ کر دیا۔ بچھڑا ڈکرانے لگا۔ اس حرکت سے اس بچے کے دل میں اس بچھڑے کے لئے پیار اور کسان کے تئیں نفرت پیدا ہوگئی۔ جیسے ہی وہ کسان وہاں سے ٹل گیا تو اُس بچے نے اپنے نازک ہاتھوں سے اُس بچھڑے کی رسی کھولنے کی کوشش کی۔ جب کسان نے باہر آ کے دیکھا تو اُس کی نظر اس بچے پر پڑی۔ وہ شکایت لے کر اُس کی ماں کے پاس گیا کہ اُسکے بچے نے بچھڑے کی رسی کھول کر اُسے سارا دودھ پلا دیا۔ ماں اُس کی دلیل ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئی کہ دو سال کا بچہ بچھڑے کی رسی کیسے کھول سکتا ہے۔ کسان نے بچے کی ماں سے کہا کہ وہ خود چل کر دیکھے۔ باہر آ کے اُس نے دیکھا کہ اُس کا بچہ بچھڑے کے پاس بیٹھا تھا اور بچھڑا چسر چسر کر کے دودھ پی رہا تھا۔

جب وہ بچہ چار سال کا ہوا تو اُس کے والد کا تبادلہ پنجاب کے ایک چھوٹے سیگاؤں للتو کلاں میں ہوا۔ اُنہوں نے اس چار سال کے بچے کو اسکول میں ڈال دیا۔ اُن کا پہلا اُستاد محمد علی تھے جو اُردو پڑھایا کرتے تھے۔ اُس نے اپنی پڑھائی کی شروعات اُردو سے ہی کی۔ یہ وہ دور تھا جب پنجاب میں گورمکھی کے ساتھ اُردو پڑھائی جاتی تھی۔

جب وہ اگلی کلاس میں چلا گیا تو اب کے اُن کے اُستاد اُن کے والد تھے۔ اُن کے والد سکول ہیڈ ماسٹر تھے اور مزاج کے بڑے سخت تھے۔ وہ اپنے والد سے بہت خائف رہتے تھے۔ وہ ماں کے بہت قریب تھا اور اپنی ہر بات اپنی ماں سے سانجھا کر لیا کرتا تھا۔ اُس کے والد اُسے کلاس میں سب سے زیادہ ڈانٹا کرتے تھے۔ اس بچے میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے باپ سے کہے کہ وہ اُسے کلاس میں کیوں ڈانٹتے ہیں۔ وہ اپنی فریاد لے کے اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا کہ پورے کلاس میں اُن کے والد کسی اور کو نہیں بلکہ اُنہیں ہی زیادہ ڈانٹ دیا کرتے ہیں۔ ماں نے اپنے شوہر سے ضرور شکایت کی ہوگی مگر اُس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکی کیونکہ اُن کے شوہر کا ایسا دبدبہ تھا کہ کوئی اُن سے بحث وتکرار نہیں کر سکتا تھا۔

اُس کے کلاس میں اُس کے زیادہ تر دوست مسلم طبقے سے تھے۔ عبدل جبار، حنیف، غلام رسول اُس کے اسکول کے ایّام کے دوست تھے جن کے بنا وہ ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں لڑکی کی ڈولی تب تک نہیں اُٹھتی تھی جب تک مسلمان بھائی ڈولی اُٹھانے کے لئے نہیں پہنچتا تھا۔ تب یہ بچہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ہندو کیا ہوتا ہے اور مسلمان کیا ہوتا ہے۔ آٹھویں جماعت تک اُس نے فلموں کے بارے میں سنا نہیں تھا۔ جب اُس کے دوست ایک فلم دیکھ کے آئے تو وہ وجد کی کیفیت میں تھے۔ جب وہ بچے اُسکے سامنے فلم کی تعریف کرنے لگے تو اُس بچے نے اُن سے پوچھا کہ فلم میں کیا ہے تو اُن کا جواب تھا کہ ہم نے دیکھا کہ پردے پر تصویریں بولتی ہیں۔ اُس کے اندر بھی ایک تجسس پیدا ہوگیا۔ گھر میں ایسا ماحول تھا کہ وہ فلم دیکھنے کی بات نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جب نویں جماعت میں تھا تو اُس کا چاچا اُسے ایک شادی میں لے کر گیا تو اُس نے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ اُسے فلم دکھائے گا تو وہ اُس کے ساتھ چلے گا۔ چاچا نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ اُسے فلم ضرور دکھائے گا۔ وہ اس بچے کو فلم دکھانے لے گیا۔ اُسنے پہلی بار فلم ''شہید'' دیکھی جس کے مرکزی کلاکار دلیپ کمار اور کامنی کوشل تھے۔

میں جس بچے کی بات کر رہا ہوں اس کا نام دھرمیندر کیول کرشن دیول ہے جو 8 دسمبر 1935 کو پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں نصرالی میں پیدا ہوا۔ اُن کے والد کیول کرشن ایک اسکول ماسٹر تھے۔ جب اُن کا تبادلہ سہینوال ہوا تو ننھے دھرم کو چار سال کی عمر میں اسکول میں داخل کیا گیا۔ اُن دنوں اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ دھرمیندر نے شروعات اُردو سے کی۔ آٹھویں جماعت تک وہ فلموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس وقت اُس کی عمر محض بارہ سال تھی۔ نویں کلاس میں جب اُسنے اپنے چاچا کے ساتھ پہلی بار دلیپ کمار کی فلم ''شہید'' لدھیانہ کے منروا سینما میں دیکھی تو فلم دیکھ کر وہ ایسا مسحور ہوگیا کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی مخلوق ہے اور یہ کس دنیا سے آئی ہے۔ یہاں سے فلموں کی طرف اُس کی دیوانگی بڑھ گئی۔ وہ ماں سے پیسے لے کر چوری چھپے فلمیں دیکھ کے آیا کرتا تھا۔ وہ رات دن فلموں کے اس طلسماتی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔

فلم ''شہید'' نے اُس کی زندگی میں ایسی اُتھل پتھل مچائی کہ وہ تصوراتی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ اس فلم میں دلیپ صاحب کے کردار کا نام رام تھا۔ اُسے لگا کہ رام اُس کا بھائی ہے۔ اُس کی ماں ستونت کو جسے وہ پیار سے بی جی کہہ کر بلایا کرتے تھے ایک دن اُس نے بی جی سے جا کر کہا کہ بی جی میں ایکٹر بننا چاہتا ہوں۔ بی جی بات سن کر اُچھل پڑی۔ اُس نے بیٹے کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا اگر تیرے باؤجی نے سن لیا کہ تو ایکٹر بننا چاہتا ہے تو وہ تیرے ساتھ ساتھ مجھے بھی کوٹیں گے۔ بیٹے کی ضد تھی کہ وہ ایکٹر بنے گا۔ بیٹے کی دیوانگی دیکھ کر ماں بیٹے سے بڑی سادگی سے کہتی تھی کہ بمبئی جانے کی بجائے تو وہاں عرضی کیوں

نہیں بھیج دیتا۔ بیٹا ماں کی سادگی اور بھولے پن پر ماں کو سمجھاتے ہوئے کہتا۔ بی جی یہ کام عرضی سے نہیں ہوسکتا۔اس کے لئے خود جانا پڑے گا۔

ماں اُسے فلموں سے دور رکھنے کے لئے اساطیری کہانیاں سنانے لگیں تا کہ اُس کے سر پر جو یہ فلموں کا بھوت چڑھ گیا ہے وہ اُتر جائے۔ گھر میں ایک بنیا سامان دینے آجاتا تھا۔ وہ بھی دھرمیندر کی دیوانگی سے باخبر ہو چکا تھا۔ وہ دھرمیندر کو بھوت پریت کی ایسی خوفناک کہانیاں سنایا کرتا تھا تا کہ وہ ڈر کر گھر سے باہر نہ جائے مگران ٹوٹکوں سے دھرمیندر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ماں نے جتنی بھی کوششیں کیں وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ تو اپنی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔

وہ دلیپ کمار کا اس حد تک دیوانہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی کو بتائے بنا بمبئی کے لئے چل پڑا۔ بمبئی پہنچ کر اُس نے دلیپ کمار کے بنگلے کا پتہ ڈھونڈ نکالا اور ایک دن وہ اُن کے پالی ہل والے بنگلے پر پہنچ گیا۔ یہ قصہ 1952 کا ہے۔ اُن دنوں ایکٹروں کے گھروں پر زیادہ سیکورٹی نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ جب بنگلے کے اندر چلا گیا تو کسی نے اُسے روکا نہیں۔ وہ سیدھے دلیپ صاحب کے بیڈروم میں پہنچ گیا جہاں دلیپ صاحب ایک صوفے پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اس گورے چٹے نوجوان کو نہارنے لگا جس کی فلم دیکھ کر اُس کے اندر ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اچانک دلیپ صاحب کی آنکھ کھلی۔ ایک اجنبی کو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر وہ چونک گئے۔ اُنہوں نے اسٹاف کو آواز دی۔ دھرمیندر اسٹاف کے آنے سے پہلے ہی سیڑھیاں اُتر کر چمپت ہو گیا۔

اسی بیچ اُس نے 1952 میں پھگواڑہ کے ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اُسے ایک امریکن کھدائی کمپنی میں ڈرلنگ میکنک کی نوکری مل گئی۔ اسی نوکری کے دوران اُس کا دل ایک ادھیڑ عمر کی عورت پر آ گیا۔ کام کے دوران اُس نے پہلی بار اسی کمپنی کے ایک امریکن کامگار کے ساتھ شراب کا مزہ چکھا۔ 1954 میں اُس کی شادی پرکاش کور سے ہوئی۔ اُس وقت اُس کی عمر اُنیس سال تھی۔

شادی ہونے کے باوجود اُس کا ایکٹر بننے کا شوق مرا نہیں۔ وہ ماں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ بمبئی جانا چاہتا ہے۔ شاید یہ ماں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ فلم فیئر میگزین میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں نئے کلاکاروں کو مقابلے میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی اور اُنہیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جو اس مقابلے میں کامیاب ہونگے اُنہیں فلموں میں کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ دھرمیندر کو لگا کہ شاید اوپر والے نے اُس کی سن لی۔ وہ اُن دنوں ملیر کوٹلے میں نوکری کر رہا تھا۔ وہاں ایک فوٹو اسٹوڈیو تھا جس کا مالک جان محمد تھا۔ وہ بھاگ کر فوٹو گرافر کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ جان محمد ایسی فوٹو نکال کہ میں دلیپ کمار جیسا لگوں۔ اُس نے اُس کی کئی ساری تصویریں نکالیں۔ اُس نے فارم بھر کر پوسٹ بکس میں لفافہ ڈال دیا اور پوسٹ بکس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اُس سے پرارتھنا کی کہ اُس کی عزت رکھ لینا۔ کئی دنوں بعد اُسے بمبئی سے بلاوا آ گیا۔ اُسکے آنے جانے کا سارا خرچہ فلم فیئر میگزین اُٹھانے والا تھا۔ آنے جانے کا فسٹ کلاس ٹکٹ کے ساتھ بمبئی میں ٹھہرنے کا انتظام ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ دھرمیندر کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ فسٹ کلاس ٹکٹ کا انتظار کرتا۔ وہ ماں سے کچھ پیسے لے کر فرنٹیر میل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بیٹھ کر بمبئی پہنچ گیا۔

اس مقابلے کے روح رواں فلمی دنیا کی معتبر شخصیتیں تھیں۔ جن میں اور لوگوں کے علاوہ بمل رائے اور گورودت سرفہرست تھے۔ دھرمیندر بڑا پروجیہہ اور دراز قد نوجوان تھا۔ اُس میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو ایک ایکٹر بننے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ جب دھرمیندر کا اسکرین ٹسٹ ہوا تو اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ بڑی اُمیدوں اور ارمانوں کے ساتھ اس خوابوں کی نگری میں آیا تھا۔ وہ نتیجہ جاننے کے لئے کئی سارے اسسٹنٹوں سے ملا مگر وہ اتنے فون فاں میں تھے کہ کسی نے اُس کی بات کا جواب نہ دیا۔ دھرمیندر اُمید و بیم کے عالم میں بمل رائے کے دفتر کے باہر کھڑا ٹہل رہا تھا تبھی بمل رائے نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے کہا کہ زرا دھرمیندو کو بلا کر لے آو۔ اسسٹنٹ نے کہا کہ اُس کا نام دھرمیندو نہیں دھرمیندر ہے۔ بمل رائے نے کہا کہ میں اُسے دھرمیندرو کہہ کر ہی بلاؤں گا۔ اسسٹنٹ نے باہر جا کر دھرمیندر کو اندر بھیج دیا۔ بمل رائے نے اُس کے سامنے گھر سے آیا ہوا کھانے کا ٹفن کھول کر اُسے کھانے میں شریک ہونے کے لئے کہا۔ دھرمیندر کی جان تو گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان کے مایہ ناز ہدایت کار کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ اُسے گھر کا کھانا کھلا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اُس نے دھرمیندر سے کہا کہ وہ اُس کی اگلی فلم ''بندنی'' میں رومانٹک ہیرو کا رول ادا کرنے والا ہے۔ نوالہ دھرمیندر کے حلق میں جا کر پھنس گیا۔ سارے بدن میں جیسے بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے یقین نہیں آیا کہ وہ بمل رائے کی فلم میں کام کرنے ولا ہے۔ بمل رائے نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس فلم میں وہ نوتن کے مقابل رومانٹک ہیرو کا رول ادا کرے گا جب کہ اس فلم میں اشوک کمار ایک اہم کردار میں ہونگے۔ دھرمیندر کا دل مارے خوشی وانبساط کے اُچھل کر حلق تک آ گیا۔

اس بار پھر اُس کے دل میں دلیپ صاحب سے ملنے کی خواہش جاگی۔ اُسے کہیں سے پتا چلا کہ دلیپ صاحب کی بہن فریدہ ٹائمز آف انڈیا میں کام کر رہی ہے۔ وہ اُس سے جا کر ملا اور اُس نے اپنی دیرینہ تمنا سے آگاہ کر دیا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ ایک بار اُسے دلیپ صاحب سے ملا دے۔ فریدہ نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ کل ہی اُسکی ملاقات دلیپ صاحب سے کروائی گی۔ دھرمیندر مارے خوشی کے رات بھر سو نہ سکا۔ وہ اُس شخصیت سے ملنے جا رہا تھا جسے اُس نے اپنا آدرش بنایا تھا۔ اگلے روز وہ آٹھ بجے دلیپ صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ملاقات ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوئی اور یہ رات کے ڈیڑھ بجے تک چلتی رہی۔ خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ دھرمیندر سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ دلیپ صاحب نے نوکر سے اپنی ایک گرم بنیان منگوائی اور اسے دھرمیندر کو پہننے کے لئے

دی۔ دلیپ صاحب کا یہ خلوص اور پیار دیکھ کر دھرمیندر دنگ رہ گیا۔ بنیان پہن کر اُس نے دلیپ صاحب سے ہنستے ہوئے کہہ دیا کہ وہ یہ بنیان اب واپس نہیں لوٹائیں گے۔ آپ کے پاس اور بھی سوئیٹر ہونگے۔ دلیپ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں یہ دو بنیانیں پیرس سے لے کے آیا تھا۔ ایک ناصر لے کے چلا گیا اور دوسری آپ لے کے جا رہے ہو۔ یہ دھرمیندر کی زندگی کی ایک تاریخی رات تھی۔ اس میں دلیپ صاحب اُردو میں پنجابی میں اور انگریزی میں ڈیڑھ بجے رات تک بولتے رہے اور دھرمیندر بڑے سکون اور اطمینان سے بیٹھا دلیپ صاحب کی باتیں سنتا رہا۔

چند ہفتے تک وہ ہوا کے دوش پہ اُڑتا رہا۔ بمل رائے اپنے حساب سے فلمیں بناتے تھے۔ بمل رائے نے اُس کے دل میں اُمید کی جو جوت جگائی تھی وہ دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگی۔ اسی بیچ ارجن ہنگو رانی جو کہ ایک فلمساز اور ہدایت کار تھا ایک اُمید وار لڑکی کے ساتھ بمل رائے کے دفتر آیا جایا کرتا تھا۔ اُس نے دھرمیندر کو دیکھ کر کہا کہ یہ لوگ فلم جب بنائیں گے تب بنائیں گے۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ اس سے پہلے میں تمہیں اپنی فلم میں کام دوں گا۔ دھرمیندر ارجن ہنگو رانی کو جانتا نہیں تھا اس لئے اُس نے اُس سے کہا کہ میں گورودت اور بمل رائے کی فلموں میں کام کر رہا ہوں۔ آپ کس کھیت کی مولی ہیں؟ ارجن ہنگو رانی نے مسکرا کے کہا کہ میں ایک ہدایت کار ہوں اور لکھ کر رکھو کہ سب سے پہلے تم میری فلم میں کام کرو گے۔ اس طرح دھرمیندر کو پہلی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا جس کا نام ''دل بھی تیرا ہم بھی تیرے'' تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو دھرمیندر کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ ٹکٹ خرید کر اپنی فلم دیکھ سکتا۔ اس فلم میں کام کرنے کا معاوضہ اُسے اکاون روپے ملے تھے۔ یہ فلم 1960 میں ریلیز ہوئی۔

یہ فلم باکس آفس پر کامیاب نہ رہی۔ دھرمیندر کو ایک اور فلم میں کام کرنے کا موقع ملا جس کا نام ''شعلہ اور شبنم'' تھا۔ یہ فلم بھی کوئی کمال نہ کر سکی البتہ اس فلم کا سنگیت کافی مقبول ہوا۔ اس فلم کے سنگیت کو خیام نے سجایا تھا۔ 1960 سے لے کے 1965 تک اُسنے کئی فلموں میں کام کیا جن میں وہ معاون اداکار کے طور پر ہوتا تھا۔ ''بوائے فرینڈ'' ''صورت اور سیرت'' ''ان پڑھ'' ''شادی'' ''بندنی'' میں وہ معاون اداکار کے رول میں تھا۔ ''بندنی'' میں اُسے پہلی بار پانچ ہزار کا معاوضہ ملا تھا۔ ایک انٹرویو میں اُس نے کہا کہ جب اُسے پانچ ہزار روپے ملے تو اُس نے ایک دارو کی بوتل خریدی اور اپنے اُن سارے دوستوں کو بلایا جو بیچارے کچھ بننے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ سارے لوگ بمبئی کے سمندر کنارے بیٹھ کر اپنی شام رنگین کرتے رہے۔

دھرمیندر مقبول ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے گھر والوں کو بمبئی بلا لیا۔ دھرمیندر کا کہنا ہے کہ جب اُس کی ماں بمبئی کی ٹرین میں بیٹھی تھی تو اُس میں پنجاب کے بہت سارے مسافر تھے جن میں کئی سارے نوجوان لڑکے تھے۔ چونکہ دھرمیندر کی تصویریں ہر میگزین میں چھپ رہی تھیں تو یہ لوگ دھرمیندر کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ وہ اس بات سے شاداں تھے کہ دھرمیندر پنجاب کا منڈا ہے۔ ماں ہمہ تن گوش ہو کے سن رہی تھی۔ برسوں سے وہ بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا تھی۔ بیٹے کے بارے میں لوگوں کے منہ سے اتنی تعریفیں سن کر اُسکی ماں کا بلڈ پریشر کا مرض ٹھیک ہو گیا۔

دھرمیندر نے ''بیگانہ'' ''پوجا کے پھول'' ''میرا قصور کیا ہے'' ''حقیقت'' ''گنگا کی لہریں'' ''آئی ملن کی بیلا'' ''آپ کی پرچھائیاں'' ''میں بھی لڑکی ہوں'' ''پورنیما'' ''نیلا آکاش'' ''کاجل'' ''چاند اور سورج'' اور ''آکاش دیپ'' جیسی فلموں میں دوسرے ہیرو کا کردار ادا کیا۔ پھر آئی 1966 کی فلم ''پھول اور پتھر'' جس میں وہ منفی کردار میں تھا۔ اس فلم میں مینا کماری مرکزی کردار میں تھی۔ اس فلم نے دھرمیندر کی قسمت بدل دی اور اُسے ''ہی مین'' کا ٹائٹل مل گیا۔ اس فلم میں اُس نے سڑک کے ایک غنڈے کا رول اس خوبی کے ساتھ ادا کیا تھا کہ اُس کی ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ اسی سال اُس کی آٹھ فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام ہیں ''ممتا'' ''محبت زندگی ہے'' ''دل نے پھر یاد کیا'' ''دیور'' ''بہاریں پھر بھی آئیں گی'' ''انوپما'' ''آئے دن بہار کے'' اور ''پاری''۔

دھرمیندر کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ ہر سال اُس کی آدھے درجن سے زیادہ فلمیں ریلیز ہوتی تھیں۔ اُس نے فلم انڈسٹری کی بیشتر ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا۔ اُس کے کیریئر کو اُبھارنے میں مینا کماری کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اُس نے مینا کماری کے ساتھ آٹھ فلمیں کیں جن کے نام یوں ہیں۔ ''میں بھی لڑکی ہوں'' 1964 ''کاجل'' 1965 ''پورنیما'' 1965 ''پھول اور پتھر'' 1966 ''منجھلی دیدی'' 1967 ''چندن کا پالنا'' 1967 اور ''بہاروں کی منزل'' 1968 ابتدائی دور میں جب وہ چھوٹے موٹے رول کر رہا تھا تو اُسے وہ عزت نہیں ملتی تھی جو کہ بڑے اداکاروں کو ملا کرتی تھی۔ شروع کے دنوں میں جب وہ ایک فلم وہ مینا کماری کے ساتھ کر رہا تھا تبھی ایک سپاٹ بوائے اُس کیساتھ بدتمیزی سے پیش آیا۔ مینا کماری کو بہت برا لگا۔ اُس نے سب کی کلاس لی۔ اُس نے پرڈیوسر ڈائرکٹر کو تنبیہ کی کہ وہ آگے سے دھرمیندر کو وہی عزت واحترام دیں گے جو وہ دوسرے اسٹارس کو دیتے ہیں۔

مینا کماری ایک جذباتی عورت تھی۔ اُس کے اندر درد کا ایک اتھاہ ساگر پنہاں تھا۔ وہ ایک ٹوٹی ڈالی کی طرح تھی۔ جو بھی اس ڈال کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھتا تھا وہ اُس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی تھی۔ دھرمیندر ایک رومانٹک نوجوان تھا۔ وہ مینا کماری کے ساتھ جذباتی طور پر جڑ گیا۔ مینا کماری نے اُس کے کیریئر کو سنوارنے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مینا کماری جس مقام پر تھی ایسے میں ایک نوخیز اداکار کے ساتھ کام کرنا اپنے کیریئر کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے مترادف تھا۔ اصل میں وہ دھرمیندر کو اُسی مقام پر دیکھنا چاہتی تھی جہاں پر وہ خود کھڑی تھی۔ وہ ''پھول اور پتھر'' جیسی فلم کی معرفت اُسے اُس مقام تک لے آئی۔ اس فلم کے لئے پہلی بار فلم فیئر کے ایوارڈ میں بہترین اداکار کی

زمرے میں دھرمیندر کا نام شامل کیا گیا۔کاروباری لحاظ سے یہ فلم سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلم تھی۔

رشی کیش مکھر جی نے دھرمیندر کو پہلے فلم ''انوپما'' میں کام کروا کے اُس کی اداکارانہ صلاحیتوں کو خوب اُبھارا۔اس فلم کے لئے اُس کی اداکاری کی خوب سراہنا کی گئی ۔دھرمیندر جسے ''پھول اور پتھر'' میں قمیض اُتار کر اپنا بدن دکھانے پر ''گرم دھرم'' نام پڑ گیا تھا،اب رشی کیش مکھر جی کی نظر عنایت سے ایک سنجیدہ اداکار کے طور پر اپنی پہچان بناتا جا رہا تھا۔کئی پروڈیوسر، ڈائرکٹر دھرمیندر کو اُس کی قد کاٹھی کی وجہ سے مار دھاڑ والی فلموں کے لئے موزوں سمجھتے تھے جب کہ دھرمیندر رومانٹک آدمی تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ رومانٹک رول ادا کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی مراد جلدی بر آئی جب اُس نے ''آئی ملن کی بیلا'' ''آیا ساون جھوم کے'' ''میرے ہمدم میرے دوست'' ''عشق پر زور نہیں'' ''پیار ہی پیار'' اور ''جیون جیوتی'' جیسی رومانٹک فلموں میں کام کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایکشن فلموں کے ساتھ رومانٹک فلموں میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔

اُس نے مار دھاڑ اور رومانٹک فلموں پہ اکتفا نہیں کیا۔اُس نے سسپنس فلموں میں بھی اپنی کلاکاری کے جوہر دکھائے۔''شکار'' ''بلیک میل'' ''کب، کیوں اور کہاں'' اور قیمت'' ایسی فلمیں ہیں جو سسپنس بھری تھیں۔بطور ایکشن ہیرو کے جس فلم میں اُسے کافی سراہا گیا وہ فلم تھی ہدایت کار راج کھوسلہ کی فلم ''میرا گاؤں میرا دیش''۔اس فلم سے اُس نے یہ ثابت کیا کہ وہ ہمہ جہت فن کار ہے اور کسی بھی کردار کو بخوبی ادا کر سکتا ہے ۔یہاں یہ بات قابل زکر ہے کہ دھرمیندر کو اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔وہ ایک کاشت کار خاندان سے تعلق رکھتا تھا جن کا آرٹ یا کلچر سے دور دور واسطہ نہیں تھا۔دھرمیندر نے جو کچھ سیکھا وہ فلمیں دیکھ دیکھ کر سیکھا اور ساتھ میں اُس نے کڑی محنت کی اور اسی محنت اور لگن کی وجہ سے وہ نمبر ایک اداکار بن گیا۔

دھرمیندر نے زیادہ تر فلمیں ہیما مالنی کے ساتھ کیں۔''راجہ رانی'' ''سیتا اور گیتا'' ''شرافت'' ''نیا زمانہ'' ''پتھر اور پائل'' ''تم حسین میں جوان'' ''جگنو'' ''دوست'' ''چرس'' ''ماں'' ''چاچا بھتیجا'' ''آزاد'' اور ''شعلے''۔کہا جاتا ہے کہ ''شعلے'' کے ایک سین میں جہاں وہ ہیما مالنی کو پستول چلانا سکھاتے ہیں، اُس سین کو بار بار کرنے کے لئے اُس نے لائٹ بوائے کو دو ہزار روپے دئے کہ وہ لائٹ کو بار بار بگاڑ دے تا کہ اُس کے ری ٹیک ہوتے رہیں۔وہ ری ٹیک کے بہانے بار بار ہیما مالنی کے گلے لگ جاتا تھا۔ان کی پریم کہانی کی شروعات فلم ''تم حسین میں جوان'' سے ہوئی۔ایک طرف خوابوں کی شہزادی تھی تو دوسری طرف ایک پر وجیہہ نوجوان تھا اسلئے ایک دوسرے کی طرف راغب ہونا فطری تھا۔دھرمیندر شادی شدہ تھا اور اُس وقت چار بچوں کا باپ تھا۔ایسے میں ہیما مالنی سے شادی کے بارے میں سوچنا عبث تھا۔ہیما کی ماں نے اُس کی شادی پہلے سنجیو کمار کے ساتھ کرنا چاہی۔ہیما نے شادی سے انکار کر دیا۔دوسری بار یہ خبر آئی کہ ہیما مالنی جیتندر سے شادی کرنے والی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دھرمیندر نے اُس شادی میں رخنہ ڈال دیا۔شروع شروع میں ہیما مالنی ایک شادی شدہ آدمی سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی مگر فلم ''پرتیگیا'' کے اس گانے ''میں جٹ یملا دیوانہ'' نے اُس کا دل لوٹ لیا اور وہ اُس کے پیار میں مبتلا ہو گئی۔جیسے ہی ہیما مالنی کے والد تک یہ بات پہنچی تو اُس نے اس رشتے کی زبردست مخالفت کی۔ایک تو وہ ہیما سے پندرہ سال عمر میں بڑا تھا اوپر سے وہ شادی شدہ تھا۔ادھر ہیما کے گھر والے اس رشتے کے مخالف تھے اُدھر اس خبر سے دھرمیندر کے گھر میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔دھرمیندر کی بیوی پرکاش کور کسی بھی قیمت پر اپنی سوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔اُس نے دو ٹوک لہجے میں اپنے شوہر سے کہہ دیا کہ وہ اُسے کسی بھی صورت میں طلاق نہیں دے گی۔دھرمیندر ہیما کے عشق میں اس قدر دیوانہ ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اُسے پانا چاہتا تھا۔ایک طرف دھرمیندر کے والد اپنی بہو کو سمجھاتے رہے کہ جس آدمی نے اُنہیں ہر آسائش اور آرام میسر کیا، کیا اُس کی خوشی کے لئے ہم اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے ؟ بہو نے اپنے سسر کی بھی بات نہیں مانی جب کہ وہ اپنی ساس اور سسر کا بیحد احترام کرتی تھی۔معاملہ اُلجھ چکا تھا۔اس کے حل کے آثار کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

1980 تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔اس بیچ ہیما مالنی کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، حالانکہ ماں اب بھی اس رشتے کے خلاف تھی۔ان کا پیار تو سر چڑھ کے بول رہا تھا اس لئے وہ کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔دونوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے چاہے اُنہیں ساری دنیا سے کیوں نہ لڑنا پڑے۔سماج سے تو وہ لڑ سکتے تھے مگر قانون سے لڑنا آسان نہ تھا۔ ہندو میرج ایکٹ کے تحت دھرمیندر اپنی پہلی بیوی سے طلاق لئے بنا دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔اُنہوں نے اس کا یہ توڑ نکالا کہ اسلام قبول کر کے شادی کی اور اس طرح وہ قانونی شکنجے سے بچ گئے۔

ہیما مالنی سے اُس کی دو بیٹیاں ہوئیں جن میں سے بڑی بیٹی ایشا دیول ماں باپ کے نقش قدم پر چل پڑی اور اُس نے کئی فلموں میں اداکاری کی۔ دھرمیندر نے فلم سازی میں بھی قسمت آزمائی کی۔اُس نے اپنی بیٹی وجیتا کے نام پر ''وجیتا فلمز'' کی نیو ڈالی اور اپنے بڑے بیٹے سنی دیول کو 1983 میں فلم ''بے تاب'' کے ذریعے پیش کیا۔وہ بینر اور پوسٹر لے کر رات کے وقت دلیپ صاحب کے گھر پہنچ گیا اور اُنہیں فلم کے پریمیر کے لئے مدعو کیا۔وہ چاہتا تھا کہ دلیپ صاحب آ کر اُن کے فرزند کو آشیرواد دیں۔دلیپ صاحب پریمیر پر گئے اور اُنہیں فلم بیحد پسند آئی۔فلم کامیاب رہی۔دلیپ صاحب کے ساتھ اُس کا رشتہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کا تھا۔وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دلیپ صاحب اُس کے بڑے بھائی ہیں اور یہ اُن ہی کی دین ہے کہ آج وہ اس مقام پر کھڑا ہے۔دھرمیندر کے لئے دلیپ صاحب کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔میں نے اُسے

ہرعید کے تہوار پر موجود پایا۔اُس نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ جب چھوٹا تھا تو بڑی بے صبری سے بقرعید کا انتظار کرتا تھا۔اُس کے والد آریہ سماجی تھے اور گھر میں ماَنس مچھلی نہیں پکتی تھی۔وہ ماَنس مچھلی کھانے کا بڑا شوقین تھا اس لئے وہ عید کے روز اپنے مسلم دوستوں کے گھر جا کران ضیافتوں کا مزہ لیتا تھا۔میری آخری ملاقات دلیپ صاحب کے ساتھ عید کے دن ہی ہوئی۔وہ اُن دنوں کافی بیمار تھے۔اُن کا حافظہ بھی کافی کمزور ہو چکا تھا۔جب وہ کھانا کھانے کے لئے ہال سے باہر آگئے تو وہ دھرم جی کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔دلیپ صاحب نے اُس حالت میں بھی دھرم جی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے یہ جاننے کی کوشش کی کیا میں اس آدمی کا جانتا ہوں۔میں نے مسکرا کے کہا کہ میں ان کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔

دھرم جی کے بارے میں میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔دھرم جی نے سونے کا دل پایا ہے۔جب بمل رائے کا انتقال ہوا تو اُن کی ایک فلم ادھوری پڑی تھی جسے دھرم جی نے نہ صرف مکمل کروایا بلکہ اُس کو مکمل کرنے کے لئے پیسے بھی دیئے۔ایک باراُن کے ایک ملازم کو دل کا دورہ پڑ گیا۔برسات کا موسم تھا۔ساری ممبئی جل تھل تھی۔دھرم جی نے بوٹ منگوا کے اپنے اس غریب ملازم کو اپنے بچوں کے ساتھ مل کر اسپتال پہنچایا اور اُس کی جان بچ گئی۔

دھرم جی اوچھی فلمی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔اُن کی کامیابی کے پیچھے اُن کے سبھاؤ کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔اُن کہ وجہ سے کسی بھی فلمساز کو نقصان نہ اُٹھانا پڑا۔سب سے خاص بات جو میں نے دھرم جی میں دیکھی ہے وہ ہے ماں باپ کی سیوا کرنا۔وہ ماڈرن زمانے کا شرون کمار ہے۔

اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے بوبی دیول کو1995 میں فلم ''برسات'' میں پردہ سیمیں پر پیش کیا۔اپنے بھتیجے ابھے دیول کے لئے بھی اُس نے ایک فلم پرڈیوس کی جس کا نام ''سوچا نہ تھا'' تھا۔دھرمیندر نے سیاست کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیئے۔وہ 2004 سے 2009 تک ممبر پارلیمنٹ بنا رہا۔اُسے کئی سارے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔دھرم جی کے دل میں ایک ہی کسک تھی جو اُسے اندر ہی اندر رلا دیتی تھی۔وہ کسک تھی بچوں کی اپنی سوتیلی ماں کے تئیں نفرت اور بے رخی۔جب ایشا دیول کی شادی ہوئی تو بھائیوں نے اس شادی میں شرکت نہیں کی۔اس شادی میں دھرم جی کے پریوار میں سے اُن کے بھتیجے ابھے دیول نے اس میں شرکت کی جب کہ سنی اور بوبی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔خوشی کی بات یہ ہے کہ دھرم جی کی یہ حسرت بھی جیتے جی پوری ہوگئی۔سنی کی فلم ''غدر ۲'' نے سارے گلے شکوے مٹا دیئے۔بھائیوں نے بہنوں کو پریمئر میں بلایا اور اُنہیں گلے لگایا۔اُنہوں نے اپنی سوتیلی ماں کو بلا کر بڑی عزت اور پیار دیا۔دھرم جی کی برسوں کی منت پوری ہوگئی۔

دھرم جی کی زندگی کا احاطہ کرنے بیٹھ جائیں تو اس کے لئے کافی وقت اور صفحات درکار ہیں۔''چہارسو'' اس کی اجازت نہیں دیتا اس لئے میں اپنے اس مضمون کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

- بقیہ -

خُنثٰی کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

حوالہ جات

۱۔رخشندہ شہناز،کاروانِ نفسیات،مکتبہ کاروان لاہور،۲۰۰۸ء،ص:۱

۲۔ رینو بہل،ڈاکٹر،"میرے ہونے میں کیا برائی ہے"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی نمبر۶، ۲۰۱۷ء،ص:۳۷۔۳۸

۳۔ ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کیاسرار ورموز،قومی کونسل برائے فروغِ اردوزبان،نئی دہلی،جولائی ۱۹۹۹ء،ص:۳۵۴

۴۔ رینو بہل،ڈاکٹر، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے ''،محولہ بالا،ص:۱۶

۵۔ایضاً،ص:۸۶

۶۔ایضاً،ص:۲۴

۷۔ظہیر رحمتی،ڈاکٹر،غزل کی تنقید کی اصطلاحات، اترکھنڈ،جواہر لال نہرو یونی ورسٹی،نئی دہلی،۲۰۰۵ء،ص:۴۶۲

۸۔ رینو بہل،ڈاکٹر، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے ''،محولہ بالا،ص:۱۸۔۱۹

۹۔ ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کیاسرار و رموز،محولہ بالا،ص:۳۴۲۔۳۴۳

۱۰۔رینو بہل،ڈاکٹر، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے ''،محولہ بالا، ص:۷۷

۱۱۔ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کیاسرار ورموز،محولہ بالا،ص:۳۹۳

۱۲۔رینو بہل،ڈاکٹر، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے ''،محولہ بالا،ص:۱۶۔۱۷

۱۳۔ایضاً،ص:۹۳

۱۴۔ایضاً،ص:۷۹

۱۵۔ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کیاسرار ورموز،محولہ بالا،ص:۳۸۴

۱۶۔ رینو بہل،ڈاکٹر، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے ''،محولہ بالا،ص:۱۶

۱۷۔ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کیاسرار ورموز،محولہ بالا،ص:۳۸۶

۱۸۔ رینو بہل،ڈاکٹر، ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے ''،محولہ بالا،ص:۱۰۴

۱۹۔ایضاً،ص:۱۱۱

۲۰۔ایضاً،ص:۵۲

۲۱۔ایضاً،ص:۸۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ جس توجہ، لگن اور انہماک کے ساتھ چہارسو کا شمارہ ترتیب دیتے ہیں اُس سے ہر شمارہ ایک طرح سے بالکل نیا اور الگ لگتا ہے۔ آپ اور ادارہ چہارسو کی یہ کاوش لائقِ تحسین ہے۔ میرے لیے یہ بات باعث عزت ہے کہ آپ نے مجھے اس لائق جانا اور ایک اشاعت میرے لیے وقف کی۔

یوں تو چہارسو کے تمام مشمولات لائق توجہ اور لائق مطالعہ ہیں بس ایک معمولی سی تجویز ضرور دینا چاہوں گی کہ متن خاص طور پر شعری متن، نظم ہو یا غزل، اگر ایک ہی رنگ میں ہو تو زیادہ مؤثر ثابت ہوسکتا ہے۔ مختلف رنگ متن کے تاثر پر چھا جاتے ہیں۔

نجیبہ عارف (اسلام آباد)

جناب گلزار صاحب، السلام علیکم۔

محترمہ نجیبہ عارف پر چہارسو کا خاص نمبر نظر سے گزرا۔ آپ کی کاوشوں کا دل سے معترف ہوں۔ سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ اس بار اکادمی ادبیات کی صدر نشیں ایک خاتون ہیں۔ محترمہ نجیبہ عارف ایک باصلاحیت اسکالر ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اکادمی کو بہت آگے تک لے کے جائیں گی۔ محترمہ نجیبہ عارف سے میری ملاقات بالمشافہ تو نہیں لیکن زوم پر وہ ہمارے ادارے کاروانِ فکر وفن کے پروگرام میں آئی تھیں اور ادا جعفری پر بہت ہی دلکش گفتگو کی تھی۔

میں آپ کو داد دیتا ہوں کہ آپ نے محترمہ سے ان کے ناول مکھوٹا سے متعلق یہ سوال کیا کہ اس میں مشرقی پاکستان کے ان بے خانماں لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو پچھلی نصف صدی سے بنگلہ دیش کے کیمپوں میں محصور ہیں۔ ان کا جواب بھی صحیح ہے کہ یہ اس ناول کا موضوع نہیں ہے۔ لیکن سقوط مشرقی پاکستان اور بہاری کیمپوں کا ذکر اس ماحول کے بیان میں آتا ہے جس ماحول میں اس ناول کا مرکزی کردار پروان چڑھا ہے۔

عبداللہ جاوید، جواز جعفری، ثروت زہرا اور فرح کامران کی نظمیں اچھی لگیں۔

جمیل عثمان (نیویارک)

پیارے گلزار جاوید۔ سلام مسنون واحترامات فراواں۔

چہارسُو کا ''ڈاکٹر نجیبہ عارف نمبر'' موصول ہوا، ظاہر ہے اس کا فیصلہ اور تیاریاں پہلے سے جاری ہوچکی ہوں گی مگر اسی اثناء میں محترمہ کی تعیناتی اکادمی ادبیات پاکستان کی چیئر پرسن کے طور پر ہوگئی تو چہارسُو کے اِس شمارے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ اس شمارے میں اُن کے بارے میں جتنی معلومات اور تفصیلات ہیں وہ انہیں محض ایک شاعرہ یا نثر نگار کی حیثیت سے متعارف نہیں کرواتیں بلکہ اُن کی شخصیت میں پنہاں تصوفانہ و عارفانہ رنگ کی نشان دہی بھی کرتی ہیں اور ممتاز مفتی کے علاوہ قاضی احمد سعید صاحب سے ہومیوپیتھی کے حوالے سے ملاقات اور پھر ایک عرصے تک ان کے کلینک میں دواؤں کی پُڑیاں باندھنے کا جو ذکر ہے اس نے ان کی شخصیت کے بارے میں ایک بہت ہی گہرا اور اچھا تأثر دل پر نقش کر دیا ہے۔ اُن سے آپ کا مصاحبہ پڑھنے کے بعد ابھی تک مَیں سوچ رہا ہوں کہ اتنے عمیق سوالات کی داد آپ کو دی جائے یا ان کے اسی قدر بلیغ جوابات کی داد محترمہ کو۔ چلیں ہم کوئی تنازعہ کھڑا کرنے کے بجائے یہ کہے دیتے ہیں کہ یہ برابر کا مقابلہ تھا۔ میں نے کئی برس قبل کسی جریدے میں (غالباً مبین مرزا کے ''مکالمہ'' میں) ان کے ناول ''راگنی کی کھوج میں'' کی قسط پڑھی تھی تو اسی دن سے ان کے کمالِ تحریر کا قائل ہوگیا تھا، تبھی سوچ لیا تھا کہ کسی طرح مَیں یہ کتاب حاصل کر کے پڑھوں مگر پھر کشاکشِ زمانہ میں ایسا نہ کر سکا۔ شاید اب ایسا کر سکوں کہ عنقریب فکشن ہاؤس کی گوجرخان میں برانچ کھلنے والی ہے اور اس کی افتتاحی تقریب میں جانے اور بہت سی کتابیں لینے کا ارادہ بھی ہے۔ برسبیلِ تذکرہ ابھی پچھلے ہفتے اسلام آباد میں جو تین روزہ کتاب میلہ لگا تھا اس میں میں نے ہر بُکسٹال پر یہ ناول تلاش کیا مگر دنیا بھر کی نئی اور سیکنڈ ہینڈ کتابیں دستیاب تھیں ایک راگنی کی کھوج نایاب تھی۔ ان کے بارے میں بہت سے دوسرے مضامین پڑھنے کے بعد ابھی بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر پھر یہ خط مضمون کی صورت اختیار کر جائے گا۔

جناب تابش خانزادہ کا مضمون ''کیڑے مکوڑے'' ہاتھیوں اور ان کے درمیان لڑائیوں کی کہانی پر مشتمل ہے جن میں اس لڑائی کی زد (مضمون میں اسے ضد لکھا گیا ہے!) میں آنے والے لاکھوں حشرات الارض کا ذکر ہے اور اس کے آخری جملے نے اس علامتی کہانی کی کلید کھول دی کہ ''جب بھی دو سیاسی ہاتھی حصولِ اقتدار کی ہوس اور شہوت کے زیرِ اثر ایک دوسرے سے گھمسان کی جنگ لڑتے ہیں تو میدانِ جنگ کی زد (یہاں بھی ضد لکھا گیا!) میں آنے والے عوامی کیڑے مکوڑے مرتے ہیں۔ اب اس علامتی کہانی یا مضمون کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھا جائے یا ہمارے ملک خداداد کے سیاسی منظر نامے میں، اس کی صداقت دونوں جگہ پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ برسبیلِ تذکرہ، یہاں جناب تابش خانزادہ سے ایک حرفِ معذرت کہ تا حال میں ان کے ضخیم ناول ''زہریلا انسان'' پر مضمون نہیں لکھ پایا اگرچہ اسے بارِ دیگر پڑھ بھی لیا ہے (پہلی مرتبہ قسطوں کی صورت میں ''چہارسُو'' میں ہی پڑھا تھا)۔ دراصل اس موضوع پر لکھنے کے لیے بھی جگر اچاہیے، ہوسکتا ہے اگلے شمارے تک۔۔۔

قبلہ وکعبہ حضرت پیرزادہ آلِ انوار کے ناول ''خاکِ شفا'' کی (پچھلے شمارے والی) چودھویں قسط اور موجودہ شمارے کی پندرھویں قسط بیک وقت پڑھیں جہاں بدلتے ہوئے منظر نامے، ثقافتی تنوّع اور شعر و شاعری کا لطف اٹھایا، وہیں

اس کے بنیادی کردار کی زبان کی چاشنی اور کہیں کہیں کچھ الفاظ نہ لکھنے کے باوجود خالی جگہیں اپنے تخیّل کے زور پر پُر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اور جس سلیقے سے پیرزادہ صاحب نے ان قسطوں میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ناصر کاظمی، پنڈت تلوک چند محروم، اکبرالہٰ آبادی، جگن ناتھ آزاد، ضمیر جعفری، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، سجاد باقر رضوی جیسے شعراء وادباء کا اور شوکت حسین رضوی، نور جہاں، اعجاز درّانی، حکیم احمد شجاع پاشا، انور کمال پاشا اور دیگر فلمی دنیا سے وابستہ مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک بہت ہی دلچسپ اور تاریخی حقائق سے روشناس کرتی ہوئی کہانی ہے۔حضرت پیرزادہ آلِ انوار کہیں ملیں تو میری طرف سے آداب وسلام کہیے گا۔ ویسے مجھے میری چھٹی حِس بتا رہی ہے کہ جلد ہی اس ''نقاب پوش'' ہستی سے میری ملاقات آپ ہی کے توسّط سے ہونے والی ہے۔اگے رب دیاں رب ای جانڑیں۔

باقی افسانوں، مضامین اور شعر وشاعری پر کوئی تبصرہ نہیں کر رہا کہ پہلے ہی خط لمبا ہوگیا ہے۔ہاں، چلتے چلتے آپ کا شکریہ ادا کرنا تو واجب ہے کہ میری تقدیسی تنقیدی کتاب ''رہ نوردِ شوق'' کے سرِ ورق کی تصویر بھی آخری صفحے پر دوسری کتابوں کے ساتھ لگا کر قارئین کو کتابوں کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی۔سلامت رہیے۔اللہ حافظ۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کا نجیبہ عارف نمبر دیکھ کر جی خوش ہوا۔مضامین، مکالمہ اور نجیبہ عارف صاحبہ کی تخلیقات جو جس نفاست، نزاکت اور عرق ریزی سے سجایا، سنوارا اور پیش کیا گیا ہے اُسے دیکھ کر حیرت کے ساتھ حسد کی کیفیت میں گرفتار ہوں۔

یوں تو حسد من کی آگ ہے مگر میرے بس میں بھی تو نہیں۔عجب آدمی ہے ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ'' جیسے زیرِ زمین جیل میں ولیم ٹینڈل لکھتا ہی چلا گیا۔داروغہ جیل نے کہ کچھ خدمت کا عندیہ دیا۔تو ولیم ٹینڈل نے کہا سزائے موت تک کچھ موم بتیاں اور کاغذ پہنچاتے رہو میں آخری سانس تک لکھنا چاہتا ہوں۔کچھ ایسا ہی جولیس فیوچک نے کہا کہ فائرنگ اسکوارڈ کے سامنے پیش ہونے والی صبح تک لکھتا رہوں گا۔جب تھامس بیکٹ بھیس بدل کر مچھیروں کی بستی میں روپوش تھا۔کسی کو علم نہ ہوا یہ Archbishop of Canterbury ہے۔یہ کوئی چکر ہے گلزار جاوید بھائی کوئی خاص آدمی ہے۔اس جوتا چور، گڑ ڈھکن اٹھاؤ معاشرے میں CANONISED ہوئے بنا ہی لکھے جاتا ہے۔جبکہ مجھے شکوہ ہے کہ ادب کو نوبیل ایوارڈ کیوں نہیں ملا؟ من کی خواہش یوں تو چھپائے پھرتا ہوں مگر وہ دانت نکوسے گورپچ کی راتوں میں چلی آتی ہے۔اجنبی مسافر کی طرح دستک نہیں دیتی بلکہ پولیس رنگ کیواڑ توڑ رات مناتی ہے۔گلزار جاوید اسلام آباد میں رہتے ہوئے بھی پذیرائی، اعزاز، چین کا دورہ، گرانٹ، ماہانہ وظیفہ، لائف اچیومنٹ ایوارڈ سے دور رہا۔تمغۂ امتیاز سے بھی جسکی NOMINATION میری پوسٹنگ کے دوران تین لاکھ روپیہ معجّل تھی۔محکمے کی سیکرٹری بھی تمغہ امتیاز حاصل کر گئی۔سرکار ابتداء سے ہی آمریت کی کلوننگ سے ادیبوں کی ایک خچر نما نسل پیدا کر چکی ہے جس کے منہ میں لگام آنکھوں پہ اوٹ BLINKERS ہیں۔جو بکے ہوئے قلم اور کٹی ہوئی زبان کے ساتھ ادب میں صرف شادی شادی کھیلتی چلی آئی ہے۔ادبی دنیا اور ٹیلی ویژن پر پاکستان کا سب سے بڑا قومی مسئلہ شادی ہے۔

سرکک کی طرح ایوان اقتدار میں سینے کے بل گھسٹتے نام کماتے جان بناتے ہیں۔جرنل ایوب کی رائٹرز گلڈ اور جرنل ضیاء کی اکادمی ادبیات نے 'یہ ادّھے یہ پوّوے یہ بالشتیے' خوب ہی پروان چڑھائے۔سرکاری INCUBATOR میں پلنے والے ادیب کلچر ڈیپارٹمنٹ کا انگوٹھا چوستے گھٹنوں کے بل چلتے رہے۔گلزار جاوید کا نام ادب کے اولیاء میں ہو بھی تو حسد کیا جاتا ہے۔ہمیں تو وراثت میں بھی تیرھویں صدی کے رائٹرز گلڈ والے ادیب وشاعر ہی ملے۔شیخ سعدی، امیر خسرو جو سرکار ودربار کی غلامی کا سبق دیتے تھے۔سارے ہی ANTIRADICAL علوم نقلیہ والے۔گلزار جاوید خاموشی سے کام کیے جاتا ہے۔میری طرح بیکل نہیں ہوتا۔کاش خدا مجھے بھی ایسا ہی دل بخش دے۔میں بھی چہارسو میں ڈوبا رہوں۔ صرف اور صرف تخلیقی کام ہی کرتا رہوں

آغا گل (کوئٹہ)

گلزار بھائی، سلام۔

چہارسو کا تازہ شمارہ حسبِ سابق عمدہ ترتیب وتزئین سے آراستہ ہے۔نجیبہ عارف صاحبہ کی بابت آپ نے بڑی مفید معلومات مہیا کی ہیں۔محترمہ کے حوالے سے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا اس شمارے کے بعد اُن سے بھرپور تعارف حاصل ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔

ہر شمارے کی طرح اس بار بھی سب سے پہلے پیرزادہ صاحب کا ''خاکِ شفا'' پڑھا۔اس قدر عجوبۂ معلومات خدا معلوم پیرازادہ صاحب کہاں کہاں سے کھوج کر لاتے اور ہم جیسوں کا بھلا کرتے ہیں۔اب یہی دیکھئے کہ مغلوں کی نور جہاں کے ساتھ ملکہ ترنم نور جہاں کی تاریخ رقم کرنا آسان کام تھوڑی ہے۔بہرحال میری دعا ہے کہ چہارسو اسی طرح جاری وساری رہے اور قارئین کی دل بستگی کا سامان کرتا رہے۔

تابش خانزادہ (یو۔ایس۔اے)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

نجیبہ عارف ناول نگاری، شاعری، تنقید وتحقیق اور تبصرہ نگاری کے حوالہ سے شہرت یافتہ ادیب ہیں۔''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ان سے موسوم کرنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمارہ میں اچھے افسانے، مضامین اور شاعری شامل کی گئی ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تحریر کردہ افسانہ ''نیا رواج'' اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ ہم لوگ شادیوں پر بے جا اصراف کے علاوہ ''تمول'' یعنی لفافہ میں کچھ رقم ڈال کر خوشی یا بامر مجبوری دولہا کے گھر والوں کو پیش کرتے ہیں جس کا حساب رکھا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر کسی بیمار کی تیمارداری کے لیے جانا ہو تو جو اخراجات اس کے علاج معالجہ پر اٹھ رہے ہوتے ہیں کبھی بھی ان میں کچھ حصہ ڈالنے کے لیے

لفافہ میں رقم رکھ کر پیش کرنے کا خیال بھی نہیں آتا۔

ڈاکٹر ولا جمال العسیلی کا افسانہ ''جمیلہ'' اس صورتِ حال کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ معاشرہ میں جہاں مرد کھل کر اپنے عام جذبات کا اظہار کر سکتا ہے وہاں عورت کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں جہاں عورت کو ہر طرح کی آزادی ہے وہاں اس کے کچھ منفی پہلو ایسے بھی ہیں جو مشرقی روایات اور پرداشت کے خلاف ہیں۔

تابش خانزادہ صاحب کا افسانہ ''کیڑے مکوڑے'' ہاتھیوں کے رہن سہن اور طرز زندگی کے حوالہ سے نہایت دلچسپ اور معلوماتی تحریر ہے۔ انہوں نے اسی تمثیل کے حوالہ سے ملک میں ''سیاسی ہاتھیوں'' کی لڑائی میں عوام کے بطور کیڑے مکوڑے کچلے جانے کا دلچسپ حوالہ بیان کیا ہے۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آل انوار کی نئی قسط حسب سابق نہایت دلچسپ، معلوماتی اور عمدہ اندازِ تحریر ہے اس میں لاہور کی تاریخ، نور جہاں ملکہ جہانگیر کی داستان، ابوالحسن علی ہجویر کا لاہور کا سفر اور آخر میں مشہور شعرا، ادیبوں اور انشاء مرحوم کی شاعری کا تذکرہ جو تحریر کو مزید خوبصورت بنا دیتا ہے اور یوں قاری اگلی قسط کا منتظر رہتا ہے۔

شاعری میں نوید سروش، اکمل شاکر، فرح کامران، عبداللہ جاوید، علی شاہد دلکش، نسیم سحر، پرتپال سنگھ بیتاب، اشرف جاوید اور نبیل احمد نبیل کا کلام متاثر کن ہے۔ ''چہارسُو'' کو اس عمدہ انداز میں قارئین کی نذر کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

برادرم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

نجیبہ عارف صاحبہ کی شخصیت وفن سے سجا چہارسو دیکھ کر آپ کے لیے دل سے بے شمار دعائیں نکلیں۔ ایک عمدہ شخصیت کا انتخاب بجائے خود قابلِ داد ہے اُس پر مستزاد محترمہ کی بابت بھرپور معلومات سے مزین مضامین اور انتہائی نمائندہ انٹرویو پڑھنے والے کو باغ باغ کر دیتا ہے۔ آپ صاحب، کمال اور واقفِ حال شخص ہیں۔ آپ کا ہر کام قیمتی ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

اعتبار ساجد (لاہور)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

جگمگاتے ہوئے ''چہارسُو'' میں اس دفعہ قرطاسِ اعزاز نجیبہ عارف کے نام نکلا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان سے براہ راست میں آپ کے سوالوں کے جوابات پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ ایک ذہین خاتون ہیں۔ ان کے متعلق مضامین پڑھ کر یہ بھی اچھا لگا کہ وہ تصوف کی طرف مائل ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن کا فیضان نظر بہت اچھا مضمون ہے اور بھی مضامین ان کے بارے میں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کی کتاب ''راگنی کی کھوج میں'' بہت اچھی کتاب ہوگی۔

افسانے میں ہمیشہ غور سے پڑھتی ہوں کہ مجھے بھی کچھ سیکھنے کو ملے۔ اب تک جو افسانے پڑھے ان میں شہناز خانم عابدی کا ''جنبشِ لب'' جو کہ بند ذہن کے لوگوں پر ایک طنز ہے۔ پسند آیا۔ ''کیڑے مکوڑے'' تابش خانزادہ کا افسانہ حسبِ معمول چھوٹا اور دلچسپ۔ ان کے استعارے بہت دلچسپ ہوتے ہیں جیسے ہاتھی اور ان کا خاندان۔ ''جمیلہ'' بھی اچھا افسانہ تھا اس کے علاوہ ''نیا رواج'' مشتاق احمد وانی ''ٹابلیٹ'' جبیں نازاں اچھے افسانے ہیں۔ نجیبہ عارف کی ''جھوٹی کہانی'' مبہم اشاروں کی خوبصورت کہانی ہے۔

چندرولال شاہ کی داستان حیات حسب معمول دلچسپ رہی۔ نظموں اور غزلوں کا بھی اچھا انتخاب ہوتا ہے آپ کے پاس۔ ایوب خاور، فرح کامران، عبداللہ جاوید، اشرف جاوید، فیصل عظیم، ڈاکٹر ریاض احمد اور نزہت شاہ کا کلام اب تک پڑھ سکی۔ بہت عمدہ کلام ہے۔

رس رابطے میں جب بھی کسی قاری نے میرے افسانے پر کچھ کہا ہوتا ہے مجھے بے حد اچھا لگتا ہے۔ ویسے بھی یہ دلچسپ خطوط سے بھرا ہوتا ہے۔

ناول ''خاکِ شفا'' پڑھ کر تو مزا آتا ہی ہے۔ اس دفعہ تو دلچسپی یوں بڑھ گئی کہ مصنف نے لاہور کی سیر کرائی۔ نور جہاں کی خوبیاں بیان کیں۔ سب سے بڑھ کر ہمارے بزرگ شاعروں کا تعارف تو ہوتا ہی ہے ان کی گرما گرم باتیں سننے کو ملیں۔ صوفی تبسم کا ذکر، دوستوں کی چھیڑ چھاڑ، ابنِ انشاء کی غزل نے تو آخر میں ناول کو چار چاند لگا دیئے۔ میری طرف سے مبارک باد وصول کریں۔

رعنا کوثر (نیویارک)

جناب گلزار جاوید، آداب۔

آپ نے جو تعارف ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کرایا ہے وہ بڑا دلکش اور تجسس سے بھرپور ہے اور اسی تجسس نے براہ راست میں آپ کے دیے گئے سوالوں کے جواب اور اُن کی تخلیقات کو پڑھا دیا۔ آپ کے تاثرات سے میں سو فیصد متفق ہوں۔ نجیبہ عارف کی جھوٹی کہانی اپنے کی انداز میں لکھی دلچسپ کہانی ہے البتہ کھوٹا کا باب پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوا۔ یہ شاید اس لیے بھی کہ یہ صرف ناول کا باب ہے اور پورا ناول ہاتھ میں ہو تو بات بنے۔ بہرحال ایک اور خوب سیرت شخصیت سے تعارف کرانے کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔

شہناز خانم عابدی، مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر ولا جمال، عمران عاقب، وسیم عقیل، توصیف بریلوی کے افسانے پسند آئے البتہ جبیں نازاں کے افسانے میں ناممکن بات کہی گئی ہے۔ مانا کہ کہانی ماحول اور حقیقت کی آمیزش سے تیار ہوتی ہے مگر کہانی ایسی ہو جو حقیقت لگے۔ گیارہ سال کے بچے کا گردہ کوئی بھی ڈاکٹر ایسے ہی نہیں نکال سکتا۔ قوتِ پرواز بہت اچھی اور انسپائرنگ کہانی ہے۔ تابش خانزادہ کی کہانی ''کیڑے مکوڑے'' میں ہاتھیوں کے متعلق بڑی اچھی جانکاری ملی جس کا مجھے تو پہلے علم نہیں تھا مگر کیا ہم اسے کہانی کہہ سکتے ہیں؟

آپ سے ایک بات کا گلہ ہے، آپ صرف ناول کا ایک باب ہی شامل کرتے ہیں جیسے کہ ذاکر فیضی کے ناول ''نئی فیکٹری'' کا بھی شامل کیا ہے، اس سے پہلے بھی آپ نے کئی ناولوں کے صرف ایک باب شامل کیے، کیا یہ صرف قاری کے دلوں میں اشتیاق بڑھانے کے لیے ہی ہے؟

''خاکِ شفا'' کا یہ باب بھی ابھی تک اپنی دلچسپی قائم کیے ہوئے ہے۔ اس مرتبہ لاہور شہر کی خوب سیر کرائی۔ نور جہاں کے خاندان کی تفصیل، اس کی پیدائش سے لے کر بادشاہ جہانگیر سے شادی اور اُس کے بعد جہانگیر کا مقبرہ، خود کے کفن دفن کی تیاری اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ اُن کی زندگی کے تمام حالات تک کا قصہ خوب رہا۔ ناول نگار بھی نہ جانے کہاں کہاں سے خوبصورت شاعری تلاش کر کے لاتا ہے۔ تلوک چند کی غزل پڑھ کر لطف آ گیا۔ بھائی واہ واہ۔ داتا صاحب کا شجرہ، شہزادی بامبا جو راجہ رنجیت سنگھ کی پوتی تھیں کی جانکاری بھی دلچسپ اور کمال کی رہی۔ جناب انہوں نے تو مشاعرے کا اہتمام اس طرح کیا کہ مشاعرہ لکھا نہیں بلکہ دکھا دیا۔ اقبال، جگن ناتھ آزاد، صوفی غلام مصطفیٰ، انشاء کی شرکت اس مشاعرے میں خوب رہی۔ اب تک کے ناول کو پڑھ کر اس ناول کو ہم تحقیقی ناول کہہ سکتے ہیں جس میں ہمیں پرانے وقتوں کی نہ صرف تحریک، واقعات ملتے ہیں بلکہ اس دور کا کلچر، کھان پان، رہن سہن، بول چال سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے اکثر مجھے فاروقی صاحب کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' یاد آ جاتا ہے۔ اگر یہ قسطوں میں نہ پڑھ کر پورا ناول ہاتھ میں ہوتا تو اس کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔

سید اختر ملک نے سیمیں کرن کے ناول ایک معتوب کہانی کا تبصرہ بہت عمدہ کیا ہے۔ ابھی تک ناول پڑھ نہیں سکی، مگر اب بہت جلد اسے پڑھنا پڑے گا۔ فلرز کچھ کم تعداد میں لگے مگر جتنے شامل ہیں دلچسپ ہیں۔ پرماتما آپ کو صحت یاب رکھے اور آپ اسی طرح بے لوث ادب کی خدمت کرتے رہیں دونوں طرف کے ادیبوں کو جوڑنا اور دونوں طرف کے ادب کو ایک دوسرے کو پڑھنے کا جو آپ کام کرتے ہیں اسے سلام۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (جنوری فروری ۲۰۲۴ء، جلد ۳۳) اپنی اعلیٰ روایت اور خوب صورت نگارشات سے مزین نظر نواز ہوا۔ محترمہ نجیبہ عارف کا قرطاس اعزاز دیکھ کر دل جھوم اٹھا۔ آپ نے براہ راست کے تعارف میں مختصراً جو محترمہ کے بارے تحریر فرمایا ہے وہ حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی ہے۔ پھر گفتگو کا کوئی جواب ہی نہیں۔ آپ کے سوالات کے تفصیلی اور حقائق پر مبنی جوابات نے نہ صرف لطف دیا بلکہ معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ خاندانی پس منظر، شاعری سے والدہ کا متعارف کروانا، چھپ چھپ کر ناول پڑھنا، شوہر کا جملہ:

''میں تو تمہیں خدا کے حوالے بھی نہ کروں اور تم ایک انسان کے ہاتھ پر بیعت کر آئی ہو۔'' (ص۔۱۲)

کراچی میں سالانہ اردو کانفرنس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کو سننے اور مختصر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ان کی گفتگو نے متاثر کیا۔ ان کے مقالات یا تقاریر میں مدلل بات سادگی سے بیان کرنے کا ہنر موجود ہے۔ ان کے اسلوب میں اپنائیت اور علمی وقار اور مضبوطی ہے۔ فاری شانے محترمہ کے غزلیہ کلام کا انتخاب خوب کیا ہے۔ محمد سلیم الرحمان نے اپنے مضمون فیضان نظر میں نجیبہ عارف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے ان کی فکر تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ مبین مرزا نے ان کے مختلف افسانوں کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ سلمی اعوان اور نعیم الرحمان کی تحریریں بھی لاجواب ہیں۔ یہ گوشہ متعدد سابقہ گوشوں کی طرح اہم اور یادگار ہے۔ ہزار ہا تحسین۔ نجیبہ عارف کا افسانہ جھوٹی کہانی پڑھ کر ان کے دیگر افسانے پڑھنے کی جستجو پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ چنیدہ اشعار:

اپنے ہی اندر گھوم رہا ہوں برسوں سے
دیواروں کے اندر قید ہے جانے کون
(فیصل عظیم)

دہلیز پہ آ بیٹھا کوئی بھیس بدل کر
جو دیکھ رہے ہو وہ حقیقت بھی نہیں ہے
(اشرف جاوید)

دفعتاً اک حجاب گرتے ہی
ہر تماشا جہاں سے اٹھتا ہے
(اسلم راہی)

لے ڈوبا ہم کو عشق میں ناموس کا بھرم
خود داغ داغ ہو گئے دامن بچا لیا
(فرح کامران)

کون سا دکھ ہے جو باقی ہے ابھی دیکھنے کو
غمِ دنیا مجھے اب دشتِ دنیا سے نکال
(ایوب خاور)

چہروں کی اس بھیڑ میں سارے چہرے ملتے جلتے ہیں
پر ان کی پہچان الگ ہے گونا گوں کرداروں میں
(ڈاکٹر قطب سرشار)

آج جتنا بھی ہے دیوار کا بوجھ
سب کا سب سایۂ دیوار پہ ہے
(طارق قمر)

چراغِ وصل کہیں اور بھی بھڑکتا تھا
دُعا کا اور نشانہ تھا مُدعا کا اور
(غلام حسین ساجد)

ایک صدی کا قصہ ''چندو لال شاہ'' کی داستانِ حیات عجیب اپنے خاص انداز سے پیش کی لطف آ گیا۔

''خاکِ شفا'' ایک ایسا ناول ہے جس میں علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور سیاست کی تاریخ کو ادب بنا کر پیش کرنا مصنف کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ موجودہ قسط میں ساحلی شہر بمبئی، کلکتہ، کراچی، تاریخی شہر دلی، لاہور، لکھنؤ، میرٹھ دفاعی نقطہ سے انبالہ اور روال پنڈی ۔۔۔۱۵۳۹۔۔۔ شیر شاہ سوری نے مغل بادشاہ ہمایوں کو شکست، ملکہ نور جہاں، شیر افگن اور جہاں گیر کا ذکر۔۔۔

تاریخ لاہور اور تاریخ فرشتہ میں ''لاہور'' کا تلفظ ۔۔۔ شجرہ حضرت علی، داتا صاحبؒ کی دینی خدمات، کتابیں۔۔۔ رنجیت سنگھ کی پوتی شہزادی بامبا کا ذکر ۔۔۔ ادبِ لطیف کے شیخ برکت علی کا ذکر۔۔۔ ناصر کاظمی کو سامنے لا بیٹھایا۔

''ابے لونڈے۔۔۔ تو شاعر ہے۔۔۔؟''

''میں نے کہا۔۔۔ جی۔۔۔ میں شاعر ہوں۔۔۔''

سنا پھر کوئی شعر

''شعر سنتے ہی چاچا پھڑک گئے۔۔۔ اور۔۔۔ تانگہ باہر نکالتے ہوئے بولے۔۔۔ لے بھئی لونڈے کیا نام ہے تیرا۔۔۔ ناصر کاظمی۔۔۔''

''اب تو جی ناصر کاظمی ہو۔۔۔ یا کوئی اور کاظمی۔۔۔ تُو نے تو مجھے غلام کرلیا۔۔۔''(ص۔۹۶)

کیا کہکشاں سجائی ہے۔ حکیم احمد شجاع، انور کمال پاشا، سید ضمیر جعفری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احمد مشتاق، ظہیر کاشمیری، نذیر ناجی، امتیاز علی تاج، سجاد باقر رضوی، صلاح الدین محمود، انتظار حسین، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی چھیڑ چھاڑ۔۔۔ قاضی صاحب کا سجاد باقر کی شادی کا قصہ بلکہ عشق کا قصہ، پتا چلا کہ کوئی اور سجاد باقر رضوی ہیں۔۔۔ جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم کی نظم۔۔۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک دل کش آرٹ فلم چل رہی ہے جس کے کردار معروف لکھاری ہیں۔ دوسری طرف پھپھو اور بھتیجے کی بے تکلفانہ گفتگو نے ایک عمر کی کیا خوب عکاسی کی ہے۔ ہزار ہا تحسین۔۔۔ سچ یہ ہے کہ بقول فیصل عظیم ناول کو ایک ساتھ پڑھنے کا انتظار ہے۔

''جمیلہ'' ڈاکٹر ولا جمال العسیلی کا مختصر مگر پُر اثر افسانہ ہے۔ جمیلہ اپنے خوابوں کی تکمیل چاہتی ہے مگر خاندان، سماج کے سامنے بے بس۔ وسیم عقیل کا افسانہ تماش بین اور عمران عاکف کا افسانہ ''دو لاکھ روپے کا چیک'' پیش کش کے اعتبار متوازن افسانے ہیں پسند آئے۔

ڈاکٹر جواز جعفری کی نظم ''کہانی ایک شہر کی'' اپنی ذات کی تکمیل اور شناخت کا اعتبار ہے۔ فرح کامران کی نظم کا عنوان ''شب خون'' نظم نازک کیفیت کے لحاظ سے تیز ہے نظم اچھی ہے۔ فیصل عظیم کی نظم ''چھپن چھپائی'' اپنی دریافت کا عمل ہے پس منظر میں خواہش اور خوف کی فضا بھی محسوس ہو رہی ہے۔ بہترین تخلیق ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا، واہ، شایانِ شان! شمارہ شائع کرنے پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ اس سے قبل میں نجیبہ عارف صاحبہ کے نام سے اُس وقت واقف ہوا جب یہ آپ کی ادکامی ادبیات کی چیئر پرسن منتخب ہوئیں۔ بالکل اندازہ نہ تھا کہ اُن کی تعیناتی کے فوری بعد اُن کی شخصیت و فن پر اتنا بھرپور شمارہ منظر عام پر آجائے گا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے آپ جیسے اردو کے سنجیدہ اور مخلص خدمت گار کو۔ جب تک آپ جیسے لوگوں کا جنون زندہ اور تابندہ ہے اردو زبان مر نہیں سکتی۔

پرویز شہریار (دہلی)

ڈیئر گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے۔ یہ فقط آپ کا تخصص ہے کہ آپ منفرد کام کر رہے ہیں۔ آپ شاد و دلشاد رہیں۔

خراجِ تحسین کام کرنے والے تخلیق کاروں کو پیش کرنے کی روایت کا ڈول آپ نے ڈالا ہے۔ عمومی چلن تو یہ تھا کہ مرنے کے بعد قبروں پر کتبے لگائے جاتے ہیں اور پھول پھینکے جاتے ہیں مگر آپ جس طرح زندہ لوگوں کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کر رہے ہیں وہ ایک یادگار کام ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں نجیبہ عارف صاحبہ کے حوالے سے انتہائی مفید معلومات مہیا کیں گئی ہیں۔ چہارسو کا یہ نمبر نکال کر آپ نے بہت عمدہ فریضہ سرانجام دیا ہے یعنی حق بہ حق دار رسید۔

نبیل احمد نبیل (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

اس دور میں جہاں صرف شور ہے اور کسی کی اچھی آواز کانوں میں بمشکل ہی پڑتی ہے وہاں چہارسو جیسا جریدہ سارے شور میں سے اپنے مطلب کی آواز سننے اور سنانے میں کامیاب ہے۔ بات جب صنف نازک کی ہو تو اس کا کام صرف گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رہ جاتا ہے اس کی لیاقت ذہانت اور صلاحیت کو اس کے اپنے قوام اور کفیل ہی دبا دیتے ہیں۔ بقول رفیعہ شبنم عابدی:

دشت میں، شہر میں، گلزار میں کب جاتی ہے
میری آواز میرے گھر ہی میں دب جاتی ہے

بالفرض محال اگر کسی کا خاندان حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اسے باہر کی دنیا میں اپنے لیے جگہ بنانے کا موقع دے بھی دے تو بیرونی دنیا بے شک بہت وسیع ہے لیکن پست ذہنیت اور تنگ نظری کسی خاتون کو آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ دنیا کی تنگ دامنی اسے چند قدم بھی چلنے نہیں دیتی۔ ایسے دور میں چہارسو نے بہت اہتمام سے خاتون قلمکاروں کی عزت و تکریم کرتے ہوئے محترمہ نجیبہ عارف صاحبہ کی شخصیت کو منظر عام پر لانے کا جو قصد کیا وہ قابل تعریف ہے۔ مدیر چہارسو محترم گلزار جاوید صاحب نے جن جن پہلوؤں سے موصوفہ سے سوالات پوچھے، ان کا مقصد خاتون کی زندگی، فکری نہج اور تخلیقی صلاحیتوں کا مکمل احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ قارئین کو یہ باور کروانا تھا کہ عام لوگ بولتے ہیں لیکن خاص لوگوں کا کردار اور ان کا عمل اپنی زبان خود رکھتا ہے، ان کی صلاحتیں اور خدمتیں بولتی ہیں۔ "راگنی کی کھوج" کی مصنفہ جنھوں نے بیس بائیس سال میں پندرہ افسانے لکھے اور بہت کم شائع کروانے کی کوشش کی، خود کو اور اپنی کاوشوں کو ڈھانپ کر رکھا اب اسے ان کا تساہل شاعرانہ کہیں یا تجاہل عارفانہ۔ الغرض "راگنی کی کھوج" ایک منفرد اور دل پذیر ناول ثابت ہوا۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد نے اسے سراہا۔ کچھ لوگوں نے اسے آپ بیتی سمجھا تو کچھ نے تصوف کا سلسلہ گردانا۔ ان کا ناول "مکھوٹا" بھی اپنے نام کی

طرح جدیدیت سے بھرپور ہے۔ان کی تحریروں میں انسانی نفسیات کے ایسے پہلو بیان کیے گئے ہیں جن میں تذبذب اور اضطراب کی کیفیت ہے جو جا بجا اسلامی اقدار کی غمازی کرتی نظر آتی ہے۔ایک عورت کی زندگی کی تہہ در تہہ پرتیں کھولتی تحریریں انھیں دیگر قلمکار خواتین میں ایک الگ مقام دلواتی ہیں۔

نجیبہ عارف کی شہرت ایک نقاد کی حیثیت سے اور تحقیق وتدریس سے وابستگی ان کی حیثیت کو مستحکم کرتی ہے تاہم ان کے اندر ایک تخلیق کار بھی پوری طرح فعال اور سرگرم محسوس ہوتا ہے۔ ماہر لسانیات اور ایک عمدہ ناقد گردانے جانے والی خاتون جن کی رگوں میں دوڑنے والا خون مختلف قدروں اور صفات کو خود میں سموئے ہوئے ہے، عراقی، عربی اور ہندوستانی کلچر کا مکسچر ایک ترقی پسند انٹلکچول انسان جس کو والد کی طرف سے ذمہ داری اور بردباری ومتانت ملی اور والدہ کی طرف سے ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ تعلیمی قابلیت تو بہت ہے لیکن ان کا ایک خاص اعزاز یہ ہے کہ نجیبہ پہلی خاتون چیئر پرسن اکادمی تعینات ہوئیں۔اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر انہوں نے روایاتی سوچ سے ہٹ کر فیصلہ کیا ہے کہ ایک تو وہ اردو اور پاکستان کی دیگر زبانوں کو عالمی سطح پر روشناس کروانے کی کوشش کرنا چاہتی ہیں اور دوسری بہت اہم بات یہ کہ وہ قدیم مخطوطات سے اہم مطبوعہ کتب کی کثیر تعداد کو ڈیجیٹل آرکائیول لائبریری کی صورت میں محفوظ کرنے کی خواہاں ہیں۔ان کی سوچ اور فکر کی جڑیں مذہب سے جڑی ہیں جن کی عکاسی انہوں نے " نواح کاظمہ "اور قصیدہ بردہ شریف کا منظوم ترجمہ کرکے ثابت کردیا۔

نجیبہ عارف کی خوش قسمتی کہیے کہ انہیں پیدائش سے ہی والدین کا سپورٹ اور ادبی فضا ملی جس کی وجہ سے ان میں کتب بینی کا شوق اور اردو ادب میں علامہ اقبال سے لگاؤ پیدا کردیا جس نے اقبالیات میں ان کا درجہ بلند کردیا۔ ان کی کامیابیوں میں ان کے گھر کے مردوں اور پھر ہمسفر عارف صاحب کی حوصلہ افزائی کا بہت ہاتھ مانا جاتا ہے۔اس بات کا وہ برملا اظہار کرتی نظر آتی ہیں کہ ان کے شوہر نامدار ان کے تخلیقی سفر میں بہت معاون ثابت ہوئے۔

نجیبہ عارف میں ایک بھرپور عورت ہونے کا احساس موجود ہے اور وہ نام نہاد فیمینسٹ ہونے کے نعرے کے غلط مفہوم اور مبہم ہونے کے خلاف ہیں۔ ان کے مطابق خواتین کو محض جسم یا جنس سمجھنا اور اس کے ذہن وشعور کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا آج تک معاشرے کی عادت ہی نہیں بلکہ نفسیات رہی ہے۔عورت کو مرد کے برابر انسان سمجھنا تو دور کی بات اسے ایک باشعور ہی نہیں سمجھا جاتا۔عورت کی قدر ومنزلت گھر کی چاردیواری میں ہی اگر نہ ہو تو گھر کے باہر ہونا ناممکن ہے۔ ہمارے گھٹن زدہ معاشرے میں جہاں عورت جب خود کو منوانے نکلتی ہے تو اس پر ہے دریغ کیچڑ اچھالی جاتی ہے، سفلی جذبات کی تسکین کے لیے کوئی سستا اور گھٹیا لطیفہ بنا دیا جاتا ہے، آوازے کسے جاتے ہیں اور اس کے لیے شرمناک رویہ رکھا جاتا ہے۔ایسی صورت میں نجیبہ فیمینسٹ ہونے کے مقصد کو واضح کرتی ہیں کہ معاشرے میں مقام بنانے کے لیے عورت مرد بننے کی کوشش نہ کرے بلکہ اپنی ہستی کو اسی طرح پیش کرے جیسی وہ ہے۔کیونکہ عورت ہو کر بھی وہ بہت مضبوط بن سکتی ہے۔آواز اٹھانی ہے تو اپنے حقوق کے لیے اٹھائی جائے، وراثت میں حق، عزت، احترام گھر میں رواداری اور خلوص کے حصول کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔

نجیبہ عارف تعلیم وتربیت کے حوالے سے سکولز اور کالجز کے معیار کو بہت بلند دیکھنے کی تگ ودو میں لگی ہیں۔انھیں تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کا گہرا دکھ اور رنج ہے۔انہوں نے افسانے بہت کم لکھے لیکن ناول نے ہی ان کا نام ادبی دنیا میں نمایاں کردیا۔ان کی لکھی خوبصورت نثری نظموں میں ازل ابد کے درمیان، سیمیا، شہرآشوب، ہم ابن الفاظ ابوالفاظ، شامل ہیں۔

اس شمارے میں نجیبہ عارف کے حوالے سے مدلل اور مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ان کے تصورات اور خیالات کی گرہوں کو کھول کر عوام کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور ان کو عوام سے متعارف کروانے کا سہرا جناب گلزار جاوید صاحب کے سر جاتا ہے۔ ان کے حوالے سے جتنے مصنفین نے مضامین لکھے اور ان کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کو قارئین کے سامنے اجاگر کرنے کا جو عملی قدم اٹھایا وہ قابل تحسین ہے کیونکہ ایک مضبوط ذہن کا اعلیٰ ظرف مرد ہی کسی ایسی مصنفہ خاتون جو نقاد بھی ہیں محقق اور مدرس بھی اور جس کی کاوشیں اور صلاحتیں بہت زیادہ ہیں لیکن جسے قارئین کے سامنے اس طرح نہیں پیش کیا گیا جس کا وہ استحقاق رکھتی ہیں، ان کو منظرعام پر لاکر ان کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کی کارکردگی کو سراہنا باعث تحسین ہے۔نجیبہ عارف کے پہلے شعری مجموعے سے ایک شعر جو ان کی ذات پر صادق آتا ہے:

اک اور حقیقت ہے پس پیش حقیقت
اک اور کہانی ہے کہانی سے زیادہ

ارم رحمٰن (لاہور)

نورِ مسلمان

آنے لگے ہیں دل میں خیالات کچھ ایسے
اس سوچ میں ہوں میں کہ تو ہے گر تو کہاں ہے
تو پاس اگر ہوتا تو یوں دیکھتا رہتا؟
کیا حشر بپا ہے یہاں یہ کیسا جہاں ہے
مخلوق زمیں پر ہے تو خالق ہے فلک پر
میرے دلِ حیراں میں سوالوں کا جہاں ہے
یا تو نہیں موجود یا تو ہی ہے ستم گر
انداز تغافل سے ترے ایسا گماں ہے
خاموش! کہیں کفر کا الزام نہ لگ جائے
اے نورِ مسلمان سنبھل جا تو جہاں ہے

سید فرالہدیٰ قادری
(یو۔ایس۔اے)

---موکش ---

ہم طے کرآئے ہیں کہ ادب برائے زندگی ہوتا ہے۔ غافرشہزاد کے تمام ناول اسی اصول پر قائم ہوے اور بھر پور پزیرائی حاصل کی۔مگراب انھوں نے زندگی کی دوسری حقیقت کوموضوع بنایا ہے،یعنی موت ۔یوں یہ ناول دوحصوں پر مشتمل ہے۔زندگ اور موت۔ناول کا پہلا باب زندگی سے اور دوسرا موت سے شروع ہوتا ہے اور پھر اسی طرح ابواب کی ترتیب چلتی ہے۔۔۔زندگی والے باب میں کچھ کردار ہیں:اظہرنفیس،راحت وسیم،احسن جمال،نورما،عارف محمود،ریٹااور ماں۔یہ تمام کردار علاوہ عارف محمود کے ایک ایک کر کے وفات پا جاتے ہیں۔ان کرداروں کی ادبی زندگی کو اور خود دنیاے ادب کی خوبصورتیوں اور منافقتوں کی بڑی وسعت اور سچائی کے ساتھ بہت موثرانداز میں بیان کیا گیا ہے۔عارف محمود جوزندہ بچ رہتا ہے وہ اس سوچ میں گھل رہا ہے کہ یہ جومزکورہ لوگ وفات پاگئے ہیں تو کیا انھوں نے اپنی موت کی جگہ خود منتخب کی تھی؟ کیا ایسا کرنے کا اختیار آدمی کے پاس ہوتا ہے؟ناول میں زندگی والا ہر باب اسی سوال کوکہانی کے روپ میں موضوع بناتا ہے۔ دوسرے باب میں موت ایک کردار کے روپ میں ظاہر ہوکر قاری سے ہمکلام ہوتی ہے، اپنا تعارف قبل تاریخ سے لے موجودہ عہد تک کراتی ہے۔جس میں پڑھنے والے کے لیے سمجھنے جاننے کے لیے بہت کچھ ہے۔موت کہتی ہے کہ بدلتے زمانے اور سائینسی ترقی سے میں کس طرح اپنا دبدبہ اور اختیار کھو رہی ہوں۔جیسے جیسے انسان بیماریوں کا علاج دریافت کر کے تگڑا ہوتا گیا، ویسے ہی میں بے بس ہوتی گئی۔تب پھر مجھے بھی پینترے بدلنے پڑے۔یہاں مصنف نے کء جدید اور قدیم نظریات اور مذاہب عالم میں موت کے تصورات کی علمانہ وضاحت کی ہے اور موت کا خوب اچھے سے پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''یہ درست ہے کہ موت ایک واقعہ نہیں ایک عمل ہے''اس پر موت ناک بھوں چڑھا کر غافر صاحب کو بتاتی ہے کہ ''مرنے کو ایک واقعے کی بجاے عمل قرار دینا میرے لیے پریشانیاں لے کر آیا ہے اس بات نے میرے اختیار میں براہ راست دخل اندازی کی ہے کسی کے مرنے کو ایک عمل قرار دینے کا مطلب ہے کہ وہ مرتے ہوے آہستہ آہستہ موت سے ہم کنار ہوگا، یہ تو میری توہین ہے۔۔۔''

جو باتیں اور سوال موت کے متعلق عام انسان کے ذہن میں بنتے ہیں وہ غافر شہزاد نے ناول میں سہل انداز میں کردی ہیں اس لیے یہ ناول بھی سماجی ناول ہے۔البتہ اس دفعہ غافر شہزاد نے اپنے دیگر ناولوں سے مختلف موضوع اٹھایا ہے اور ایک قدم آگے نکل کر دانش ورانہ ہونے کے علاوہ معرفت کا رنگ اختیار کر گیا ہے۔

پورے ناول میں موت کی دھند چھائی ہوئی ہے جو انجام تک آتے آتے گہرے سیاہ سایے میں ڈھل گئی ہے۔ناول کا موضوع اچھوتا ہے اس لمبے چوڑے موضوع کو مختصر کر کے بتانا بھی لمبا چوڑا کام ہے، سمجھ نہیں آتی کہ ناول میں زندگی کی بات کی جائے یا موت کی بات کروں کیونکہ دونوں حصے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔۔۔تاہم اصل موضوع وہی ہے جو زندہ بچ رہنے والے کردار عارف محمود کی پریشانی ہے کہ مرتے وقت مقام کون سا ہوگا؟ اس سوال کی کھوج میں کہانی دلچسپ ہوگئی ہے مگر ساتھ موت کا بیان بھی دل دہلا دینے والا ہے۔آخر پر عارف محمود اپنے مرنے کے لئے اپنے گاؤں کا انتخاب کرتا ہے، تاکہ بیچارگی کی موت سے بچ کر اپنوں کے درمیان آخرت کا سفر کرے۔۔۔کیا عارف محمود اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو آخر پر غافر شہزاد نے اس فنکاری کے ساتھ چھوڑا کہ قاری سُن ہو جاتا ہے۔سارے ناول کی عمارت قاری کے سر پر آن گرتی ہے اور وہ سوال یہ چھوڑا کہ ''جب آپ عارف محمود ہی کو نہیں جانتے تو پھر یہ کیسے پتہ چلے گا کہ وہ کہاں اور کب مرے گا؟'' اب سوال تو بنتا ہے کہ کیا غافر شہزاد کو بھی پتہ ہے یا نہیں؟''

---اعجاز روشن

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
باغ کا دوسرا دروازہ
محبتوں کے شہر میں
ہوا کے ہاتھ
چشم نم
نوم چامسکی